(۶)

جلد [illegible] اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء نمبر [illegible]

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

اڈیٹر۔ شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین:۔

[illegible] تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۲۹ قیمت فی پرچہ [illegible]

کتبہ [illegible] حامد مرزا دہلوی

تمدّن

یہ ۲۴ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخیر تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہو کر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک و قوم کے واسطے مایہ ناز ہیں

تمدّن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہنچانا ہے۔

تمدّن ایک بالکل آزاد پرچہ ہے جس میں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالٹکس سے علٰحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز رد نہیں ہو سکتا کہ تمدّن اس سے متفق الرّائے نہیں ہے۔

تمدّن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہوں گے جو خواتین کے مطالعہ سے گذر سکیں +

تمدّن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دویم باتصویر شائع ہوگا۔ قیمت قسم اول ۳ہ ہے قسم دویم ۲ہ۔ نمونہ کا پرچہ (۴٠ر)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنہوں تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا
مولوی سید عبدالعزیز صاحب لکھنؤ۔ منشی نور احمد صاحب شاہ گنج۔ مولوی سیف الدین صاحب پنجاب۔ بنت نذر الباقر صاحبہ۔ محمد عبدالحمید خانصاحب اٹاوہ۔ ابو حامد سید محمد صاحب مہدوی۔ منشی میر حسن صاحب ٹمکور۔ سید ظفر حسن صاحب سبزواری۔ مولوی فیض محمد خانصاحب انسپکٹر۔ سید رضا حیدر صاحب رضوی۔ منشی محمد حفیظ اللہ صاحب ضلعدار۔ مولوی عبدالرزاق صاحب بسمل۔ بابو جینی لال صاحب سخن۔ سید اختر علی صاحب حزیں۔ مولوی محمد لطیف صاحب بی۔ اے سلطانپور۔ صاحبزادہ وحید احمد صاحب فاروقی۔ ڈاکٹر سلیمان خانصاحب شموگہ۔ سید حشمت علی صاحب گونا۔ منشی محمد محسن صاحب میرٹھ۔ شیخ احمد حسن صاحب۔

تمدن

مسلمان اور عیسائی

(از شمس العلما مولوی حافظ محمد نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی - ڈی - او ایل)

ہندو مسلمانوں میں تو مثل مشہور ہے کہ چولی دامن کا ساتھ ہے ایک کی ایک کے بدون گزر نہیں سکتی اور حکومت بھی دونوں کو سازگاری اور صلح کاری پر مجبور کرتی ہے۔ فریقین کے ناعاقبت اندیش تنگ چشموں نے رسم و راہ کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مخالفت کا رنگ دیکر دونوں میں ایک طرح کی منافرۃ پیدا کردی ہے مگر ہم اسکو دیرپا منافرۃ نہیں سمجھتے اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نے ماند - اور سمجھدار لوگوں نے اسکا توڑ بھی شروع کردیا ہے کوئی دن جاتا ہے کہ بعض اخبار جو اس آگ کو بھڑکاتے رہتے ہیں خود بند ہوجائیں گے - بڑی بات تو یہ ہے کہ ہم کو انگریزوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے - خدا نے انکو ہم پر مسلط کیا ہے

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥

بادشاہ و رعیت یا حاکم و محکوم کا رشتہ اس قسم کا رشتہ ہے کہ جب تک ایک کا

بو سب سے پھسڈی تھے۔ مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے گدگدی پیدا ہوگئی ہے
مثل کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی مستعمل تو لڑائی کے مواقع میں ہے
کہ وہ لڑنے والوں کی شرکت کے بدون لڑائی ہو نہیں سکتی۔ مگر دوستی پر بھی
صادق آتی ہے۔ کہ فریقین کے ایک دوسرے کی طرف میلان کے بدون دوستی
بھی نہیں ہو سکتی تو باوجودیکہ رعایا اور انگریزوں میں اجنبیت اور مغایرت کی وجوہ
متعدد ہیں جو دونوں میں اتحاد کے پیدا ہونے کی مانع ہیں پھر بھی ہم دیکھتے
ہیں کہ انگریز اپنی برتری کو لیے ہوئے جو لازمہ سلطنت و حکومت ہے رعایا
کی دلجوئی کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں مگر رعایا کا حال یہ ہے کہ محتاج اور مغلوب
ہونے پر بھی اپنی جگہ اکڑے ہی رہتے ہیں۔

محتاجی کی یہ نوبت ہے بڑے کاموں کی تو کون کہے سوئی پیچک دیا سلائی
چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں میں انگریزوں کے دست نگر۔ رعایا
کی سرکشی کی ایک مثال سمجھ میں آتی ہے کہ جیسے چند مچھروں کے سر میں یہ خبط
سمایا کہ انہوں نے ایک مکان تاکا۔ کہ اس کے مکین کو مکان سے بے دخل کر دیں
رات کو مکین سویا اور مچھروں نے کاٹنا شروع کیا۔ مکین نے سوتے سوتے ایک
چلتا سا ہاتھ مارا کتنوں کا تو وہیں جنبچلا نکل گیا اور کتنے بھن بھن کرتے بھاگ
کھڑے ہوئے مہم ختم ہوئی۔ ہم کو دوسری قوموں سے کچھ بحث نہیں۔ جو جیسا
کرے گا ویسا بھریگا۔ ہمکو تو مسلمانوں کی پڑی ہے اور مسلمانوں میں سے بھی
اُن کی جو مذہباً انگریزوں کے ساتھ تیز میز رہتے ہیں کہ اُن کے اس برتاؤ
سے اسلام ناحق بدنام اور مبغوض عند الحکام ہوتا ہے اور اسکا ضرر عام سب
مسلمانوں کو پہونچتا ہے۔

چو از قومی یکے بیدانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

دوسرے پر پورا پورا بھروسا اور اعتماد نہو کوئی بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا نہ بادشاہ اور نہ رعیت۔ ع

رعیت جو بیخ است و سلطاں درخت درخت اے پسر باشد از بیخ سخت۔

یعنے بادشاہ و رعیت اور حاکم و محکوم کے درمیان میں کسی طرح کی اجنبیتہ نہیں آنی چاہیئے اجنبیتہ آئی اور عافیت مفقود ہوئی۔ بڑی مطمئن سلطنت وہ سلطنت ہے جس میں بادشاہ اور رعیت میں دوئی نہو۔ رعیت سمجھے کہ ہمیں رعیت ہیں اور ہمیں بادشاہ۔ بادشاہ یہ سمجھے کہ میں بھی انہیں جیسا آدمی ہوں رنج و راحت کا احساس جیسا ان کو ویسا مجھکو۔ ہمارے ہندوستان کی انگریزی سلطنت میں مشکل یہ آکر پڑی ہے کہ بادشاہ سلامت تو رہے بجائے خود ہزاروں کوس دور حکام جو ان کے قائم مقام ہیں اور رعایا کو انہیں سے واسطہ پڑتا ہے اور عملاً یہی بادشاہ ہیں انکا حال یہ ہے کہ گو انکو رعایا کے ساتھ نہ کسی طرح کا اتحاد ہے اور نہ ہوسکتا ہے اور اتحاد ہو تو کیونکر ہو۔ نہ وطن ایک نہ زبان ایک نہ طرز تمدن ایک نہ رسم و راہ ایک اور بڑی بات یہ ہے کہ نہ مذہب ایک۔ ہاں کچھ یوں ہی سی انسانیت میں ایک ہیں۔ جو دونوں میں سے کسی ایک کے اختیار کی بات نہیں پھر بھی وہ اپنی طرف سے رعیت کی دلجوئی میں لگے لپٹے رہتے ہیں۔ رہے بادشاہ سو خدا کے فضل سے بادشاہ تو تین تین پشت سے ہم دیکھ رہے ہیں ایسے نیک دل ہیں کہ رعایا کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش میں لگے ہیں اور ان کی سعی بہت کچھ مشکور بھی ہوئی ہے کچھ کور کسر باقی ہے تو رعایا کا اپنا قصور ہے تعلیم عام نہیں کہ بادشاہ اور رعایا دونو گھر شاد و آباد ہوں سرکار تو تعلیم کی لائن میں برسوں سے ہر سال لاکھوں روپیہ صرف کر رہی ہے اب ہندوستان کے دن کچھ بھلے آتے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ مسلمانوں میں بھی

نہ می بینی کہ گاوے در علف زار بیالاید ہمہ گاوان دہ را۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام اور عیسائیت کے بعض معتقدات میں تخالف ہے اور اس تخالف کا رفع ہونا عادتاً محال۔ مگر ایک سرزمین ہندوستان میں جگہ دینے سے انگریزوں کو حاکم ہونے کے لحاظ سے اور مسلمانوں کو رعایا ہونے کے اعتبار سے خدا کا منشا بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مل جل کر رہیں لوگ تو انگریز ہوں یا ہندوستانی مذہبی باتوں میں کمتر اعمال فکر کرتے ہیں۔ پادریوں نے عیسائیت کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ اور مولویوں نے اسلام کا دنیا ہے کہ قرآن پر ظلم کر رہی ہے۔ نامسلم تو اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے اسلام کی برائی سن پائی ہے۔ اعقاب ہیں کہ خود تو تحقیق کی توفیق نہیں اسی لکیر کو پیٹے چلے جا رہے ہیں۔ انا وجدنا اباءنا علی امۃ وانا علی اثارھم مھتدون دنیا کے کاموں کے لیے فرہاد وار پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانی پڑے تو آستینیں چڑھا کر موجود۔ مذہب خدا کا کام ہے کون بیٹھے بٹھائے تحقیق کا درد سر مول لے اختلاف مذاہب کے ہوتے جیسا کہ دنیا میں ہے میں تو جانتا ہوں کہ کوئی فرد بشر غفلت کے الزام سے بری نہیں ورنہ کون اپنی چھاچھ کو کھٹا کہا کرتا ہے +

اگر کوئی اپنی سی کر کے کسی مذہب کی طرف سے مطمئن ہو لیا ہے تو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا قرآن کی بڑی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے کہ انکا اصل دین اور دستور العمل شریعت قرآن ہے۔ اور ہم نے کہا کہ مسلمان بھی قرآن پر ظلم کرتے ہیں تو مسلمانوں کا ظلم قرآن پر یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کے مطالب سے قطع نظر کر رکھا ہے جو کچھ انکو تعلق ہے لفظوں سے ہے بے فہم معنے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان اسلامی اخلاق پر قائم نہیں رہے۔ ہماری اوپر کی تحریر سے

شبہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان انگریزوں سے ظاہر میں ہیں تو باطن میں کشیدہ ہیں
اوران کی یہ کشیدگی اسلام کی تعلیم ہے۔ حاشا وکلا کہ ہمارا یہ مقصد ہو۔ بڑے
محنت امتحانوں میں مسلمان ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک کسی خاص قسم
وفاداری گورنمنٹ کا ناممکن التردید ثبوت دے چکے ہیں اور اب بھی اسی جادۂ مستقیم
وفاداری پر ثابت قدم ہیں ہمارا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں
سے اگر کچھ بھی کشیدگی ہو بھی تو یہ نہ مذہبی حکم ہے نہ اسلامی تعلیم۔ اور اگر کوئی
متعصب (اور سات کروڑ مسلمانوں میں سو دو سو متعصب ہوئے بھی تو
نہ ہونے کے برابر ہے) نعوذ کوئی مسلمان متعصب ایسا سمجھتا ہو تو اسی کو
ہم جاہل کہتے ہیں کہ اس نے قرآن کو تحقیق سے نہیں پڑھا اس نے
لا تقربوا الصلاۃ وانتم سکاریٰ سے انتم سکاریٰ کو چھوڑ دیا اور کلوا واشربوا
ولا تسرفوا سے لا تسرفوا۔ کو۔ جیسا کہ ایک شاعر استہزاءً کہتا ہے ؎

لا تقربوا الصلوٰۃ زنہیم بخاطر است
وز امر یاد ماندہ کلوا واشربوا امرا

اب تو الدہر اسس الموند بن بات کچھ ہو گئی ہے۔ چالیس پینتالیس برس
پہلے کے سے نہ مولوی رہے نہ مسلمان۔ بھولی بسری باتوں کا تذکرہ سرود
بستاں یاد دہانیدن ہے مگر منہ پر آئی ہوئی بات کہنی ہی پڑتی ہے۔
ایک وقت وہ تھے کہ انگریزی پڑھنا کفر تھا۔ انگریزی نوکری حرام اور
اسی طرح کی اور لغویات جن کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے اور طرفہ یہ
ہے کہ یہ سب کچھ بر بناء تعلیم اسلام۔
لیکن اگر مسلمانوں نے بادل ناخواستہ اپنی رائے بدلی ہے تو یہ صریح نفاق ہے
اور اسکا کچھ اعتبار نہیں اور گورنمنٹ کو انکی طرف سے ہرگز مطمئن ہونا نہیں چاہئے

اور اگر سمجھ بوجھ کر تحقیقات کے بعد یہ طریق اختیار کیا ہے تو
روشن ومل ہاودل گورنمنٹ شاد کہ یہی ہمارا بھی مسلک ہے۔ انگلے امور کا تو قرآن
میں کہیں نام ونشان بھی نہیں ہاں نصاریٰ کا ہے اور کئی جگہ ہے اور
اون کی مذہبی حیثیت سے ہے۔ نصاریٰ کے ساتھ میل جول کے متعلق
بہ نظر ظاہر قرآن میں متناقض احکام ہیں - اجازت بھی ہے، اور ممانعت
بھی دیکھنا یہ ہے کہ اجازت کے ساتھ ممانعت کیوں ہے؟

پیغمبر صاحب نے لوگوں کو دین اسلام کی تعلیم کر کے مسلمانوں کی ایک
نئی جماعت بنائی اور ازبسکہ اسلام میں بڑی شدّ ومد کے ساتھ عقیدہ
توحید کی تاکید اور تائید تھی مسلمانوں کے مذہبی عقائد یہود ونصاریٰ
اور مشرکین عرب کسی سے نہیں ملتے تھے ہر چند پیغمبر صاحب نے ہر طرح کی
دلیلوں سے قائل کیا معدودے چند ایمان لائے۔ باقی سارا ملک
دشمنی پر کمر بستہ ہو گیا۔ جب تک مسلمانوں کا گروہ تھوڑا اور کمزور رہا مخالفوں
نے ایذا دہی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مسلمان اس پر بھی صبر اور درگذر
کرتے اور نرمی اور ملائمت سے سمجھاتے رہے مگر لاتوں کے بھوت باتوں سے
کب ماننے والے تھے آخر استے میں مسلمان بھی قوت پکڑ گئے اور جواب
ترکی بہ ترکی دینے لگے غرض لڑائی ٹھن گئی اور جیسا قاعدہ ہے اس کا
سلسلہ سالہا سال جاری رہا۔ ظاہر بات ہے کہ جب دو گروہوں میں لڑائی
ہو رہی ہو اور لڑائی بھی زبانی تو تو میں میں نہیں تلوار کی لڑائی یعنی ایک دوسرے
کی جان کا خواہاں ایسی حالت میں ایک گروہ کے آدمی کو دوسرے گروہ کے
کسی آدمی سے دوستی رکھنا اپنے گروہ کی تباہی کے درپے ہونا ہے پس
یہود ونصاریٰ سے دوستی نہ رکھنے کا حکم اس خاص وقت اور خاص حالت کے

شبہ ہو سلطان کے فوجی انتظام ہیں جو ہر ملک اور ہر قوم کو کرنے پڑتے ہیں اور دنیا پرستی یہ لڑائی جھگڑوں سے متعلق ہیں رہی مذہبی دشمنی یعنی اختلاف عقائد وہ بالکل دوسری بات ہے اور اسکو دنیاوی معاملات میں دخل دینے کی کچھ ضرورت نہیں۔

قرآن کے صداقت کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔ اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس اجازت اور ممانعت کا اختلاف رفع کریں کہ یہ بہت بڑا اعتراض ہے جو مسلمانوں پر وارد ہو سکتا ہے مگر ہم مسلمان یعنی ہم میں کے مولوی جن کا یہ کام ہے رفع اختلاف کی جگہ اسکو جاہل مسلمانوں کے دلیں اور مستحکم کرتے ہیں اور نتیجے کو نہیں سمجھتے۔ کہ دنیا کے ساتھ مسلمانوں کا دین بھی غارت ہو رہا ہے اگر اسکا خوف نہ ہوتا کہ یہ تحریر طول پکڑ کر مناظرہ کا رسالہ ہو جائیگی تو ہم اسی ایک مسئلے پر بہت کچھ لکھتے ورنہ یوں تو ہم نے اب سے گیارہ بارہ برس پہلے اپنے چھپے ہوئے ترجمہ قرآن کی (جس کی اسوقت تک خدا کے فضل سے پچاس ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہو چکے ہیں) آیۃ یاایہا الذین امنوا لاتتخذوا الیہود والنصاریٰ اولیاء پر حاشیہ لکھا اور وہ رفع اختلاف کے لیے بس کرتا تھا۔ نہیں معلوم ہمارے اس حاشئے کا اثر ہے یا تقاضائے وقت کا کہ اب تو وہ تو تو میں میں سننے میں نہیں آتی۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ تقاضائے وقت ہی کا اثر ہوگا ورنہ نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے ہم کو تو گوارا نہیں کہ مذہب اسلام میں کسی جگہ پانی مرتا دیکھیں افسوس رخنے کو بند نہ کریں اس لاتتخذوا الیہود کے حاشیے کے ساتھ ایک بات اور بھی لکھنے کی ہے کہ پیغمبر صاحب اور صحابہ سے

بہتر اور کون قرآن سمجھ سکتا ہے اور کون ان سے بہتر قرآن پر عمل کر سکتا تھا۔ اجازۃ اور ممانعۃ دونوں قسم کی آیتیں نازل ہوتی رہتی تھیں باایں ہمہ پیغمبر صاحب کا عمل درآمد اس پر تھا کہ نصاریٰ نجران جو وفد نجران کے نام سے مشہور ہیں پیغمبر صاحب کے ہاں مہمان آئے پیغمبر صاحب نے انکو مسجد نبوی میں ٹھیرایا اور وہیں انکو ان کے طور پر نماز پڑھنے کی اجازۃ دی وہ لوگ جیسے نصاریٰ آئے تھے ویسے ہی نصاریٰ رخصت ہوئے یہ اجازۃ پر عمل درآمد تھا یا ممانعۃ پر۔ ایک میل جول تو غیر مذہب نصاریٰ کے ساتھ وہ تھا یا اب ہماری اسی دلی میں یہ حال ہے کہ مقلد مسلمانوں نے اپنی مسجدیں الگ کر رکھی ہیں اہل حدیث کو اپنی مسجدوں میں نماز نہیں پڑھنے دیتے اگر بے خبری میں کوئی پڑھ جاوے تو فوجداریاں ہوتی ہیں اور فرش مسجد دھویا جاتا ہے۔ جب مسلمان ایسے اکھل کھرے ہیں کہ ان کے آپس میں ایک کی ایک سے نہیں بنتی تو کوئی غیر مذہب والا انکی اجنبیۃ کی کیا پروا کر سکتا ہے نصاریٰ کے ساتھ پیغمبر صاحب کے میل جول کی ایک مثال اور لیجیے جب پیغمبر صاحب نے اسلام کی منادی شروع کی تو ان کے ہم قوم ہم قبیلہ قریش نے جو بڑے شودہ پشت اور تمام ملک پر غالب تھے خود پیغمبر صاحب کو اور ان کے گنتی کے چند رفقاء کو جو مسلمان ہو گئے تھے بیہودگی کے ساتھ طرح طرح سے ستانا شروع کیا پیغمبر صاحب اپنے چچا ابو طالب کی وجہ سے جو اسوقت رئیس قریش تھے کسیقدر محفوظ بھی تھے مگر نومسلموں کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتے تھے ناچار آپنے مسلمانوں کو حکم دیا کہ نجاشی بادشاہ حبشہ کی عملداری میں جا بسیں کہ گو وہ عیسائی ہے مگر منصف اور رعیۃ پرور ہے۔ چنانچہ مرد و زن بیاسی مسلمان ہجرۃ کر کے حبشے چلے گئے۔ مہاجرین میں پیغمبر صاحب کی صاحبزادی رقیۃ اور ان کے شوہر حضرت عثمان بھی تھے۔ یہ تھا اعتماد کامل جو پیغمبر صاحب نے

نجاشی پر اس کے عیسائی ہونیکی وجہ سے کیا یا قریب قریب ایسی ہی صورت اب درپیش ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی سلطنت ہے اور ہم مسلمان مستامن اور پھر طبیعتیں ہیں کہ صاف نہیں ۔

مرثیہ علامہ بلگرامی

کیسی خوش قسمت ہے تو گورِ غریباں کی زمیں! عالمِ ہستی کو تجھ سے رشک کچھ بیجا نہیں
جو کھٹے میں تیرے جو تصویر ہے نایاب ہے ہے مرقع میں ترے جو نقش وہ ہے دلنشیں
دامنِ ہستی سے تو نے چن لیے خوش رنگ پھول درخورِ محفل ترے بس اک نہیں ہیں تو ہمیں
طلسمی تیرا شیرازہ کھلیگا ایک دن اے زمیں ہر ذرہ تیرا ہوگا صورت آفریں
سچ بتا دیکھے تو ہر ہا نے شکستہ مقبرے کیا نظر آیا ہے تجکو اے نگارہ دوربیں؟
ہڈیوں کے جا بجا ڈھیر نظر آئے مگر جب کیا اثر تو نے لیا ہے اے دلِ اندوہگیں؟
باعثِ جمعیتِ خاطر نہیں جتنی صورتیں اک زمانہ ہو گیا ہے وہ کہیں ہیں ہم کہیں
چاند سا مکھڑا کہاں وہ قبر کا ظلمت کدہ ڈھیر مٹی کا کہاں مرغولۂ زلفِ عنبریں
تھا یہی آئینہ خانہ تیرا اے حسنِ صبیح؟ تھی یہی زینت کی جا کیا اے عذارِ آتشیں؟
تھی یہی تیری نقابِ عارضِ گیتی فروز؟ تھی یہی چھپنے کی جا کیا اے نگاہِ شرمگیں؟
اے دماغِ عرش پیما تیرا مسکن تھا یہی؟ تھی یہی خلوت تری کیا اے دلِ عزلت گزیں؟
تھا یہی مرجع تمھارا اے سبحانِ کہن؟ تھا یہی مسکن الآبا ای عالمانِ بالیقیں؟
تھی یہی کیا خاک کی بستی تمھارا مدرسہ؟ کچھ بتاؤ اے علومِ اولین و آخریں۔
اس خرابی میں کہو کیونکر بسر کرتے ہو تم کون ہیں اصحابِ صحبت؟ کون ہیں اب ہمنشیں؟
کیا ہوئی وہ فلسفہ دانی تمھاری کیا ہوئی؟ ذوقِ تحقیقِ علل میں اب وہ عالم کیوں نہیں
ہیں کتبخانے نہ تصنیفات کے وہ مشغلے ہے نہ تحقیقِ جدید اب وہ نہ وہ رائے رزیں
تم نے ثابت کی تھی ہر ذرہ میں اک روحِ رواں تم نے دکھلا دی تھی ہر کنکر کو رفتارِ زمیں

اب نہیں ذرات میں پیکر تمہارا مل گیا   اب اوسی رفتار کا پامال ہے جسم حزیں
طبقۂ گور غریباں کے ہر اک ذرہ کو دیکھ   ناز کر اجرام پر اپنے نہ اے چرخ بریں
تو ہی کچھ انصاف کر اے گردش لیل و نہار   تھی یہی کیا اونکی منزل جس میں اب ہیں مکیں
یہ نہ تھی تیری جگہ علامہ سید علی   تھا ترے شایان شان قصر سپہر ہفتمیں
اے گروہ اہل اسلام اے دیار بلگرام!   ہے ترا سرمایۂ ناز آہ اب زیر زمیں!
مجلس علمی میں خالی ہوگئی تیری جگہ   کون ہے اس منزلت کا جو ہو تیرا جانشیں
تیرے علمی کارنامے صفحۂ دنیا پہ ہیں۔   تو مگر کس گوشۂ خلوت میں ہے عزلت گزیں
تیرا ماتم ہر زباں میں تیرا غم ہر بزم میں   تو مگر ہے محو سیر گلشن خلد بریں
کچھ عدم کے ملک کا طرز تمدن ہے یہی؟   کچھ بتا رہتے ہیں کیونکر اس طرح اب کے مکیں؟
انتقال پیکر خاکی ہے صرف اک انقلاب   مرنے والے زندۂ جاوید ہے تو بالیقیں
اپنی تصنیفات کے صفحوں میں ہے تو جلوہ گر   دیکھنے والے تجھے دیکھیں گے تا روز پسیں
چاہیئے ایسی ترقی۔ مرحبا صد مرحبا   یوں رہے زندہ جہاں میں آفریں صد آفریں
فخر گیتی تو نے اس دنیا سے منہ موڑا ہے جب   دفتر عبرت تھی وہ تیری نگاہ واپسیں
منزل عقبیٰ کے ساکن وقت وہ بھی ہے قریب   ملنے والے تجھ سے اک دن آکے مل لینگے وہیں
اے زمانے اسلاک اہل علم میں جو فرد تھا   کھو گیا ہاتھوں سے تیرے آج وہ در ثمیں
دیدۂ خونابہ افشاں یہ تلاطم تا کجے   جوش گریہ سے کہ ہے سیلاب سے اب آستیں

ملک کی بیدار مغزی سے یقیں تو ہے عزیز
یادگار اوسکی کرے قائم یہ قوم دلحزیں

میرزا محمد ہادی۔ عزیز لکھنوی

یونیورسٹی

پروفیسر زاہدی نے جو ذیل کے مضمون میں آغاز یونیورسٹی پر روشنی ڈالی ہے اس سے ان بہت سے اعتراضات کا جواب ملتا ہے جو بعض ناعاقبت اندیش گمنام سے بہی خواہان قوم چند انگریزی اخبارات میں مسلم و ہندو مذہبی یونیورسٹیز پر کر رہے ہیں۔ مذہب کو بیسویں صدی کے اہل ہند ایسا ہی تعلیم کا لائنفک حصہ سمجھتے ہیں جیسے کہ اہل یورپ ازمنۂ وسطیٰ میں سمجھتے تھے مذہب نے اگر طلبہ کے مسلمان مذہبی تعصب سے بری ہو تو علی گڑھ کے مسلمان کس طرح متعصب ہو سکتے ہیں اس مضمون سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یونیورسٹی ایک خود رو چیز ہے اور اسکی خوبی بھی اسی میں ہے۔ اگرچہ مسلم یونیورسٹی بہت کچھ سکاٹش یونیورسٹیز کے نمونے پر چلتی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی اسمیں خود رو ہونے کے بہت سے سامان موجود ہیں :-

آجکل چونکہ انڈین مسلم یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے اور ہندو یونیورسٹی کی تیاری ہے اس لیے لفظ یونیورسٹی زبان زد ہر خاص و عام ہے۔ ایسے موقعہ پر اگر لفظ یونیورسٹی کی تشریح کیجائے اور یورپین یونیورسٹی کے آغاز کے متعلق کچھ لکھا جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

جو مفہوم فی زمانہ ایک مختصر سے لفظ یونیورسٹی سے لیا جاتا ہے اس کے ادا کرنے کے لیے ایک زمانے میں پورا فقرہ استعمال کرنا پڑتا تھا یعنے یونیورسٹیاز سٹوڈیم جنرل۔ لاطینی زبان میں یونیورسٹیاز کے معنی ہیں ایک ایسا گروہ تھا جس کہ جس میں سب لوگ ایک ہی قسم کا کام کرتے ہوں چنانچہ اس لفظ کا اطلاق اس

اُس گروہ پر بھی ہوا جو درس و تدریس کا کام کرتا تھا یونیورسیٹیاز کا لفظ یونیورسل سے جس کے معنی عام کے ہیں کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔

سٹوڈیم جنرل سے مراد ہے وہ جگہ جہاں ہر ملک اور طبقے کے طلبا موجود ہوں۔ چنانچہ لفظ یونیورسٹی یونیورسیٹیاز سے مشتق ہے اور یونیورسیٹیاز سٹوڈیم جنرل کا مفہوم رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا تشریح سے ظاہر ہے کہ یونیورسٹی سے مراد وہ مجمع استادوں شاگردوں کا ہے جو بغرض تدریس و تعلیم یکجا جمع ہوا ہو اور چونکہ ان کی علت غائی ترقی و حصول علم ہے اس لیے یونیورسٹی ایک ایسی متبرک جگہ ہوئی جہاں جملہ علوم و فنون و سائنس کی تعلیم محض حصول علم کی غرض سے ہو اور جہاں جملہ وسائل بہم پہنچا کر ہر علم کو ترقی دیجاوے گویا کہ مرکز علم و فضل کا نام یونیورسٹی یا علوم کا گھر یعنے دار العلوم ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یورپین یونیورسٹیز کا آغاز کس طرح ہوا۔ اور کون سے اسباب اِن کے محرک ہوئے؟ پیشتر اس کے کہ ہم ازمنہ وسطی کی یونیورسٹیز کا ذکر کریں ہم اُن قدیم مرکز علوم کا ذکر کرتے ہیں جو کہ اگرچہ باقاعدہ طور پر دار العلوم یا یونیورسٹی کے نام سے ممتاز نہ تھے لیکن حقیقتاً سب وہی کام کرتے تھے جو کہ یونیورسٹی کرتی ہے اور ہر طرح سے اُس زمانے کی یونیورسٹی کہلانے کے مستحق ہیں اور ایک طرح سے اُنہی کو یونیورسٹی کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔

قدیم زمانے میں یونان جملہ علوم و فنون کا مرکز و منبع تھا۔ اتھینیز مدتوں دنیا بھر کے لیے ایک یونیورسٹی کا کام دیتا رہا۔ اس ملک میں ہر علم و فن کے استاد موجود تھے ہر ایک اپنے اپنے علم میں اکمل تھا۔ دور دور سے شاگرد آتے تھے اور اِس چشمۂ فیض سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے کہتے ہیں کہ جس وقت اتھینیز بندرگاہ پر کوئی جہاز لنگر کرتا تھا تو طالب علموں کے متلاشی سمندر کے

کنارے ہی جا پہنچتے تھے اور جہاز سے اترتے ہی اُن کو گھیر لیتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ فلاں استاد فصاحت میں بڑا ماہر ہے تم اس کے شاگرد ہو کوئی کسی دوسرے استاد کی تعریف کرتا تھا۔ غرضیکہ جس طرح بھٹیاریاں مسافروں کو اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں اسی طرح اُس زمانے میں طالب علموں کی گت بنتی تھی۔ اس قصے سے کم سے کم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اتھینز میں اس زمانے میں اسقدر کافی تعداد ماہر استادوں کی تھی کہ ان میں آپس میں مقابلے کی نوبت پہنچ گئی تھی

اُس زمانے میں یونان میں علم کی تین شاخیں ضروری سمجھی گئی تھیں علم فصاحت علم سیاست اور علم فلسفہ اور انہی علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔ علم فصاحت کا جو مدرسہ ایزوکریٹس نے جاری کیا تھا وہ آخرش یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہوا۔ اس کے شاگرد ایسے لوگ ہوتے تھے جن کی مدرسے کی تعلیم ختم ہو چکی تھی اور جنمیں سے بعض نے ساری عمر حصول علم میں صرف کر دی۔ ان تعلیم گاہوں میں چار سال تعلیم ہوتی تھی اور اسکے کل عرصے میں ایک ہزار درہم فیس کے دینے پڑتے تھے۔ علم ادب و علم اخلاق تعلیم کا لازمی حصہ سمجھے جاتے تھے اتھینز کی یونیورسٹی کی جڑ ایزوکریٹس اور افلاطون کے جاری کیے ہوئے مدارس کو سمجھنا چاہیئے ؎

اتھینز کے دنیا بھر کے لیے یونیورسٹی کا کام دینے کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ باوجودیکہ باہر کے طلبا اتھینز سے تعلیم پاکر جو واپس اپنے وطن جاتے تھے تو وہاں درس و تدریس کا کام جاری کر دیتے تھے۔ لیکن جب تک کہ کوئی شخص خاص اتھینز جا کر علم حاصل نہ کرتا تھا۔ اسکو عالم نہ سمجھا جاتا تھا۔

اسکندریہ یوں تو یونانی تعلیمی مرکز مسیح سے ۲۰۰ برس پیشتر کی مہذب دنیا میں بہت جگہ تھے مگر سب سے زیادہ قابل ذکر اسکندریہ کا

دارالعلوم ہے جس کا بانی اسکندر اعظم تھا۔ دیکھا جائے تو یہ دارالعلوم موجودہ مفہوم یونیورسٹی سے بہت زیادہ مناسبت رکھتا تھا۔ شاہان طالمی کے زمانے میں یہاں اعلیٰ تعلیم اور کتب خانوں کا ایسا عمدہ انتظام تھا کہ اس سے پہلے دنیا میں ویسا انتظام کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں نہ چھاپے خانہ تھا نہ کاغذ تھا۔ ہم سراپس کے تہخانے میں جو کتابیں جمع کی گئی تھیں ان کی تعداد سات لاکھ تھی۔ یہ کتب خانہ ۲۹۰ قبل مسیح موجود تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کا ایک حصہ تو ۴۷ قبل مسیح کی آتش زدگی میں غارت ہو گیا اور جو باقی بچا تھا وہ ۶۴۰ء میں نابود ہوا۔ مسلمانوں پر عام طور پر دنیا بھر کی خرابیوں کا الزام لگایا جاتا ہے جنمیں سے ایک اس لائبریری کے جلا دینے کا بھی ہے اور یہ الزام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سر تھوپا گیا ہے مگر اب خود یورپین مصنف بڑی شدومد سے اس الزام کی تردید کرتے ہیں +

اس کتب خانے کے متعلق طالمی نے ایک کالج تعمیر کیا تھا جسکو موجودہ زبان میں یونیورسٹی کالج کہا جا سکتا ہے اس کالج کے پروفیسران کو اس زمانے کے خلاف دستور معاوضہ بھی ملتا تھا۔ پروفیسران احاطہ کالج ہی میں بود و باش رکھتے تھے۔ کالج کے متعلق بڑے بڑے برامدے یا دالان تھے جن میں پروفیسران و طلبا دبحالت چہل قدمی علمی مباحثوں میں مشغول رہتے تھے۔ اسی کالج میں ایک بڑا ہال (کمرہ) کھانے کے لیے مخصوص تھا جہاں استاد شاگرد سب یکجا جمع ہو کر کھانا کھاتے تھے۔ اس کالج کی عمارت کا نام اس زمانے میں میوزیم تھا جس کے معنے اب عجائب خانے کے ہیں۔ لیکن اسوقت اس میوزیم سے مراد عجائب خانہ نہ تھی میوزیم ایک یونانی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں میوزز کا مندر

میوزز شعر سخن اور علم و ہنر کی دیویاں تھیں۔اس لیے میوزیم کا لائبریری اور کالج سے مشتمل ہونا کوئی بے موقع بات نہ تھی۔

رفتہ رفتہ اور کالج تعمیر ہوتے گئے اور اس کالج سے ملحق ہوتے گئے اور اس دارالعلوم میں دور دور سے طالب علم آنے لگے حتےٰ کہ اسکندریہ علمی شہرت میں اتھنز کا ہمسایہ ہوگیا۔ اس دارالعلوم میں طبابت۔ قانون، ریاضی اور علم ہیئت کی تعلیم ہوتی تھی اور اسکی شہرت سینکڑوں برس تک اسی طرح قائم رہی چنانچہ اس دارالعلوم کی بنا کے چھ سو برس بعد یعنی ۳۶۲ء میں ایک مصنف[1] اس کے متعلق ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اب تک یہ دارالعلوم بڑے بڑے علما کا آماجگاہ ہے۔ از منہ قدیم میں اتھنز کے بعد اسکندریہ کا دارالعلوم ایسا ہوا جو موجودہ مفہوم کے موافق یونیورسٹی کہلانے کا مستحق ہے۔

رومۃ الکبریٰ جب یونان کا ستارہ گردش میں آیا اور رومۃ الکبریٰ کا آفتاب اقبال چمکا تو یہ سلسلہ وہاں بھی جاری ہوا اور ویسپیسین بادشاہ[2] کے عہد میں وہاں بھی اتھینیم ہال اسی نمونے پر تیار ہوا جس میں پروفیسران کو باقاعدہ تنخواہیں ملتی تھیں اس کے بعد بیروت اور قسطنطنیہ میں بھی اسی قسم کے دارالعلوم قائم ہوئے مگر انمیں سے کوئی اس قابل نہ تھا جو خاص طور پر تاریخ میں مشہور ہوا ہو۔

دین مسیحی کا آغاز اور تعلیم رومۃ الکبریٰ کا جب زوال آیا اور دین مسیحی نے زور پکڑا تو یہ کہنا بالکل صحیح نہ ہوگا کہ رومن کیتھولک مسیحیوں نے علم کی جڑ ایکدم سرے سے کاٹ دی لیکن اس میں شک نہیں

[1] ammianus [2] سنہ ۶۹ لغایت ۷۹ء تک۔

کہ انہوں نے علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنا بند کردیا تحصیل علم کو محض عیسوی مذہب سمجھنے کی غرض تک محدود کردیا گیا۔ چنانچہ جو لوگ حصول علم کے شائق تھے یا جن کے لیے یہ ضروری تھا وہ یا تو پادری ہوا کرتے تھے جن کا فرض منصبی اشاعت مذہب تھا یا راہب ہوا کرتے تھے جو اپنی زندگی مذہب کے لیے وقف کر کے ساری عمر کلیسا کی چار دیواری میں گزار دیتے تھے اس لیے یہ ظاہر ہے کہ اس تعلیم کا منشا رانکشاف مذہب تھا مدارس میں محض مذہبی قسم کی تعلیم ہوتی تھی اور غیر از مذہب جو علوم سکھائے جاتے تھے وہ صرف اس قسم کے ہوتے تھے کہ جس کے بغیر مذہبی تعلیم نامکمل رہ جاتی۔ طریقۂ تعلیم اس زمانے میں یہ تھا کہ جو استاد نے پڑھا دیا۔ یا بطور تشریح لکھوا دیا اسکو آمنّا وصدقنا کہکر حفظ کرلیا۔ اسپر سوال یا نکتہ چینی کرنا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔ مباحثے کی ہرگز اجازت نہ تھی گویا کہ شاگرد کو ذہنی ترقی کا کوئی موقعہ نہ مل سکتا تھا۔ یہ حالت گیارہویں صدی عیسوی کے آخیر تک رہی۔

موجودہ یونیورسٹیز کا آغاز

بارہویں صدی عیسوی وہ زمانہ ہے کہ جب صلیبی جنگ کی وجہ سے یورپ میں تجارت وحرفت وصنعت کی بہت کچھ ترقی ہو رہی تھی۔ بیکاری اور فارغ البالی انسان کو زیادہ تر مذہب کی طرف راغب کرتی ہے لیکن دنیا کے دھندے شغل اس سے جدا کرتے ہیں جوں جوں لوگ تجارت وحرفت وصنعت میں حصہ لینے لگے انکو اس امر کا احساس ہونے لگا کہ دنیا میں رہنا ہے تو دنیا کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس لیے جہاں پادری اور کلیسائی مدرسوں میں دینی تعلیم کا انتظام تھا وہاں ایسے مدرسے بھی جاری ہونے چاہییں جہاں تعلیم دنیوی کاروبار کی غرض سے دی جائے اور جہیں ہر شخص بلا امتیاز مذہب وعقیدہ تعلیم حاصل کرسکے۔ ان مدارس کا

نام سکول یا پبلیکا۔ یعنے درسگاہ عوام رکھا گیا۔ ۱۳۲۵ء میں بڑے بڑے شہروں کے باشندوں کو کچھ میونسپل حقوق ملے اور انہوں نے انہی حقوق کی رو سے چند ورنیکلر اسکول جاری کیے۔ ان مدارس کی خواندگی پرائمری کے درجے تک کی تھی اور خواندگی۔ املا۔ اور حساب سکھایا جاتا تھا۔ ایسے مدارس زیادہ تر جرمنی اور اٹلی کے بڑے بڑے شہروں میں کھولے گئے تھے۔ علاوہ اس امتیاز کے کہ ان مدارس میں مذہبی تعلیم نہ ہوتی تھی سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ پادری اور کلیسائی مدارس میں تعلیم لاطینی زبان میں ہوتی تھی اور ان میں ملک کی مادری زبان میں۔ مثلاً اگر کوئی مدرسہ جرمنی میں تھا تو وہاں ہر علم جرمن زبان میں پڑھایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ مدرسے حکومت یا پوپ کے ماتحت نہ تھے۔ نہ ان میں یہ شرط تھی کہ پادری لوگوں کے سوا دوسرا کوئی شخص استاد ہی نہ ہو سکے اگرچہ یہ مدارس ابتدائی تعلیم دیتے تھے لیکن مذہبی لوگوں کے خیال سے ان بے دینوں کی مانند تھے جن کا زور چھٹی صدی عیسوی میں تھا اور جو از منہ مسیح کے یادگار رہے تھے۔ ان مدارس کے اجرا کا سب سے بڑا اور فائدہ مند نتیجہ یہ ہوا کہ تحصیل علم کے ایسے ذرائع بھی وجود میں آ گئے جن کی علت غائی مذہب نہ تھی اور اسی اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ایسے درسگاہ قائم ہو گئے جہاں علم من حیث علم حاصل کیا جاتا تھا اور یہ درسگاہ بڑھتے بڑھتے ایک خاص شعبہ علم کے مرکز اور دارالعلوم ہو گئے۔

مغربی شہریوں اور اہل عرب کی صحبت

اسی زمانہ میں افریقیہ اور دیار مشرق میں اہل یورپ کی آمد و رفت زیادہ ہونے لگی جہاں اہل عرب

دور دور سے تھے جو اسوقت علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے۔

عربوں نے بغداد۔ بابل۔ اور اسکندریہ میں بڑے بڑے دار العلوم قائم کئے اور رفتہ رفتہ بصرہ۔ کوفہ۔ بلخ۔ اصفہان۔ اور سمرقند بھی علمی مرکز ہوگئے قاہرہ میں ایسی عظیم الشان یونیورسٹی تھی کہ ایک یہودی مورخ لکھتا ہے کہ وہاں بیس سے زیادہ ایسے کالج تھے جنمیں فلسفہ بحد تکمیل پڑھایا جاتا تھا اس دار العلوم کی سالانہ آمدنی ڈھائی لاکھ ڈوکیٹ[1] تھی اور اسمیں بعض اوقات خلیفہ وقت تک بغرض استفادہ شامل ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تیونس۔ اور مراکش میں بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں تھیں لیکن عربوں کا سب سے بڑا علمی مرکز اسپین تھا جہاں قرطبہ غرناطہ اور سیویل جیسی مشہور یونیورسٹی تھیں۔ یہ دار العلوم مذہبی قیود اور تنگئے خیال سے آزاد تھے تحقیق وتدقیق بحث ومباحثہ ان دار العلوم کی روح رواں تھے۔ جہاں مغربی چرچ یونانی فلسفے سے ڈر ڈر کر بھاگ رہا تھا عرب اُس سے مستفید ہو رہے تھے فیساغورث۔ جالینوس اور ارسطو کا عربی میں ترجمہ کرکے عربوں نے گویا انکو غارت ہونے سے بچا لیا۔ عربوں نے برخلاف عیسائیوں کے علم حاصل کرنے میں ہم مذہب اور بے دین کا کبھی خیال نہیں کیا۔ جس سے جو ملا لیا۔ عربوں کے بہت سے استاد یونان نژاد تھے جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ اور ان تمام متذکرہ بالا واقعات سے ثابت ہے کہ عربوں کا دریائے علم سرچشمۂ یونان ہی سے نکلا تھا جو کہ اصل میں جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے

[1] ڈکیٹ Digate ایک چاندی یا سونے کا سکہ ہے جو ازمنۂ وسطی میں یورپ میں بہت رائج تھا۔ سونے کے ڈکیٹ کی قیمت ۹ شلنگ ۴ پنس تھی۔ اور چاندی کے ڈکیٹ کی ۳۔ یا ۴۔ شلنگ تھی ۱۲

دنیا بھر کے جملہ علوم و فنون و سائنس کا مرکز تھا جس طرح عرب یونان سے مستفید ہوئے اسی طرح یورپ نے عربوں کے دارالعلوم سے فائدہ حاصل کیا نہ صرف اسطرح کہ انمیں تعلیم پائی کیونکہ مسلمانوں کے دارالعلوم یہود و نصاریٰ سب کے لیے وقف تھے بلکہ اسطرح بھی کہ اپنے ہاں کے مدارس کو عربوں کے دارالعلوم کے سانچوں میں ڈھالا مسلمان یونیورسٹیز کے عیسائی طالب علم اکثر باشندگان اٹلی ہوا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک زبردست طبّی دارالعلوم بمقام سلیرنو قایم ہوا جو پیرس اور بولون کے ساتھ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کی سب سے قدیم یونیورسٹیز میں سے ہے +

یورپ کی ابتدائی یونیورسٹیز

اب اگر غور کیا جائے تو شروع میں تو گرجا و کلیسا کے مدارس ہی تھے پھر کہیں کہیں میونسپل اسکول جاری ہوئے ان میں بعض میں تکمیل تعلیم اس درجے تک پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے بڑے بڑے عالم نکلتے تھے اور بعض صورتوں میں وہی بڑھتے بڑھتے دارالعلوم ہو گئے جیسا کہ اوسنی ایبے اور فریڈریس وائڈ کے مدرسے بڑھتے بڑھتے اوکسفورڈ یونیورسٹی بن گئے لیکن اسپین کی اثرات بھی اپنا کام کرتے رہے مثلاً صلیبی جنگ میں مشرق کے فیضان صحبت سے اہل یورپ کی تنگ خیالی کو وسعت ہو رہی تھی سنہ ۱۱۰۰ء سے شجاعت نے اپنا رنگ جما کر ایک نیا قانون اخلاق پیدا کر دیا تھا۔ ضروریات زمانہ نے مذہب کے محدود قید سے نکالکر علم کو بغرض علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کر دیا تھا چنانچہ گیارہویں صدی کے آخر اور بارہویں کے آغاز میں اس امر کا احساس ہونا شروع ہوا کہ حکمت۔ قانون۔ اور علم دینیات کو صرف پادری اور راہب لوگوں ہی کے لیے مخصوص نہ کرنا چاہیئے بلکہ عوام کو بھی ان علوم کے حاصل کرنے کی

مہارت ملنی چاہیئے اور علاوہ ازیں ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ ہر شعبۂ علم کے لیئے اسطرح تعلیم مختص کردیجائے کہ اُس علم میں مہارت کامل ممکن ہوسکے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ بعض ماہران فن نے سلیرنیو میں حکمت وطب پر بولوین میں قانون پر اور پیرس میں علم دینیات پر لیکچر دینے شروع کیئے۔ اور اس کام میں ایسے ایثار نفس سعی وتن دہی سے کام لیا کہ دنیا کے ہر گوشے سے طالب علم جوق جوق آنے شروع ہوگئے۔ جو طلبار تحصیل علم کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ چکے وہ بھی وہیں رہ پڑے اور درس وتدریس میں استاد کا ہاتھ بٹانے لگے رفتہ رفتہ جہاں طالب علموں کی تعداد بڑھتی گئی استادوں کا شمار بھی زیادہ ہی ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک مقام پر استاد وطلبار کا ایک انبوہ کثیر جمع ہوگیا۔ جنکی علت غائی حصول وفروغ علم تھی اور یہی یونیورسٹی یا دار العلوم کی تعریف ہے۔

متذکرہ بالا حالات سے صاف ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی شاہی تحریک و فرمان کی محتاج رہے اگرچہ بعض یونیورسٹیز بادشاہوں کے فرمان سے بھی جاری ہوئیں مثلاً فریڈرک دوم کی نیپلز کی یونیورسٹی لیکن عام طور پر یونیورسٹی کا ظہور ضروریات زمانہ سے ہوا۔ جسمانی تکالیف کے ضروریات نے سلیرنیو کی طبی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالوائی تحفظ حقوق کید گرنے بولوین[1] کی قانونی یونیورسٹی قایم کرائی اور روحانی تجسس نے پیرس کی دار العلوم دینیات کا آغاز کرایا۔ گویا کہ طب وقانون وعلم دینیات کی ترقی کا نتیجہ ان شعبوں کی علحدہ علحدہ یونیورسٹی کی صورت میں نمودار ہوا۔ جن لوگوں نے یہ کام شروع کیا تھا ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ انکی تعلیم کا نتیجہ ایک دن یہ ہوگا کہ یورپین دنیا کا پلٹ ہوجائیگی اور ایسی ایسی اصلاحیں ظہور پذیر ہونگی جن کے قبول کرنے کے لیے وہ خود بھی تیار نہ تھے۔

[1] اس یونیورسٹی میں کہتے ہیں کہ تیس ہزار طالبعلم تھے۔

ایک دلچسپ خط

اپنے مہربان عزیز میرزا صمصام الدین احمد فیروز کا ایک منظوم خط خدمت والا میں ارسال کرتا ہوں۔ یہ انہوں نے جیسا کہ خط سے معلوم ہو جائیگا اپنی اہلیہ صاحبہ کے نام بھیجا تھا۔ غلط خیالی ہے مشاق شاعر کے سامنے وسیع میدان ہے جس میں تخیل آزادی سے جدھر چاہے دوڑ سکتا ہے۔ لیکن اس خط میں یہ بات نہیں۔ اور یہی پابندی اسکی خوبصورتی کو بڑھا رہی ہے۔ فقط

نیاز آگیں سید ہاشمی

مایۂ عیش و مسرت و آرام — بیشتر جان و دل کی قیمت سے — بڑھ کے دولت سے بڑھ کر عزت سے
بلکہ دنیا کی ساری نعمت سے — آپ نے خط مجھے جو لکھ بھیجا — لطف سے پیار سے محبت سے
آج پڑھ کر نہ پوچھیے واللہ — حال جو کچھ ہوا مسرت سے — کیا مجال قلم بیان کرے
ایک شمہ خوشی کی حالت سے — ہو گیا ہوتا بس کہ شادی مرگ — بچ گیا میں تمھاری قسمت سے
شکریہ شکریہ ہزار سپاس — قیدِ غم کی چھڑایا زحمت سے — دیر ہوتی ہی کیوں رسائل میں
تمکو نفرت ہے کیوں کتابت سے — پاس کاغذ قلم دوات بھی ہے — ایک بار بھی بڑھ کے نعمت سے[1]
پھر بتاؤ تو کیوں ہے یہ سختی — کیا مزہ ہے مری اذیت سے؟ — جس نے بیمار تم کو دیکھا ہو
کیا نہ چاہیے نویدِ صحت سے؟ — چشم براہ ڈاکیہ رہنا — اور ناکام رہنا حسرت سے
کیوں؟ نہیں ہے یہ موت سے بڑھ کر؟ — نزع سے جان کنی کی شدت سے — تمکو احساس ہی نہیں افسوس
دل نہیں بہرہ مند الفت سے — آپ بھی ہیں بھائی بہنوں میں — دن گذرتے ہیں لطف و بہجت سے
کیا خبر اس دلِ حزیں کی جو — ہے ہم آغوش رنج فرقت سے — مثل ایک مرغِ بے نشیمن کی

[1] نعمت خاں اورنگ زیب کا منشی اور نہایت لائق فائق شخص تھا۔ ناظم ۱۲

دور ہے آشیاں کی راحت سے　　یا کہ اُس عندلیب کی مانند　　جو ہے بچھڑا چمن کی نزہت سے
یا اُس آوارۂ وطن کی صفت　　دور اپنوں کی ہو جو صحبت سے　　یا اُس آزاد کی مثال کہ جو
چور ہو قیدِ بامشقت سے　　کلفتیں جو اٹھا کے دن بھر کی　　شب کو پڑتا ہے تھک کے محنت سے
باتیں کرتا ہے پھر تصور میں　　جھولداری کی نیلگوں چھت سے　　لیکن افسوس تم ہو بے پروا
دیکھتا ہوں یہی میں حیرت سے　　یا کبھی ہو اُس کو کذب و ریا　　دب گئی ہو فریبِ طینت سے
یا کوئی بات ایسی ہی ہوئی　　جو ہے باہر مری فراست سے　　جانتی ہو اگر مجھے جھوٹا
قول سچی ہو دور صحت سے　　تو نہیں منصفی سے کچھ بیجا　　کام لینا ذرا عدالت سے
کیا غرض میری آپ ہی منصف　　فائدہ کیا ہے اس مودت سے　　صاف گو صادق البیان ہوں میں
فخر ہے مجھکو سچ کی عادت سے　　کیا پڑی مجھکو چاپلوسی کی　　ڈر نہیں ہے کسی کی سطوت سے
جاہ کی چاہ نہ خواہشِ دولت　　ہے غرض آپ کی محبت سے　　بخدا میں خدا سے ڈرتا ہوں
کانپتا اُس کی ہوں عدالت سے　　سامنے جسکے ناتواں بیوی　　آ گئی اک عجیب حالت سے
میرا دامن پکڑ کے بولے گی　　مجھ کو رکھا نہ اپنے راحت سے　　بس اسی دن کا انتظام ہے یہ
تا نہ کالا ہو منہ ندامت سے　　کیونکہ بیشک ادائے حق عباد　　جانتا ہوں ہے بیش طاعت سے
لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں۔　　سینے نفرت سے چاہے رغبت سے　　چاہتی ہو جہاں میں گر راحت
تو یہ حاصل ہے بس محبت سے　　اک بیابان ہے رشکِ ایواں　　جس میں ہم تم رہیں کدورت سے
اور تصورِ محل میں وہ جنگل　　جس میں دو دل بسے ہوں الفت سے　　بڑھ کے ہے یکدلی کی نانِ جویں
شاہِ ایراں کے خوانِ نعمت سے　　اور سدا شیر و شکر جو ہو بے چاہ　　تلخ تر زہر ہے حلاوت سے
سیج ہے نہ قبائے سنجابی　　ہو میسّر جو رنگِ الفت سے　　یک اچھی ہے وہ ردائے پلاس
جسکو اوڑھے ہوں دو محبت سے　　الغرض چاہ کو اگر سمجھو　　دنیا قائم ہے اسکی وحدت سے

ہاں خفا تم سہی پہ خفا نہ کرو　　دور ہے یہ مری شرافت سے　　قابلِ رحم جنسِ عورت کو

دیکھتا ہوں نگاہ عزت سے فکر رہتا ہے مجھکو البتہ تم جو لکھتی نہیں ہو غفلت سے
کیونکہ ہر وقت دل گرفتہ ہوا آپ کی طبع کی علالت سے یوں تو بابو نے لکھدیا سب کچھ
کچھ نہ لکھا تمھاری حالت سے منع جس بات کو ہے فرمایا وہ نہ لکھونگا میں امانت سے
آنے جانے کا سب کے علم ہوا سب بہریں اپنے گہر کو صحت سے بھائی قد آے ہیں ابھی ان آطیل
گرنہ باہر ہو میری قدرت سے سبکو پیر اسلام کہدینا عام اسلام کی اخوت سے
اور کیا آپ کو لکھوں بیوی حال اچھا نہیں مصیبت سے جوش پر جسکی طبع عالی تھا
اور میں رلعوٹی میں فرصت سے لکھ دیا فی البدیہہ یہ نامہ شیخی ست جاننا عنایت سے
کیونکہ دردمشن ہی یہ کہ سیف و قلم لونڈیاں ہیں مری قدامت سے ہاں مگر خط یہ جوش کا ہی ثبوت
جوش ظاہر کہے محبت سے لکھ رہا ہوں سلیس اردو میں تا سمجھ جاؤ تم سہولت سے
شاعری میں مذاق ہو جسکو وہ سنا لے تمھیں عنایت سے بس یہاں کوٹتا ہے دل بیوی
تم ہی الف پڑھ تمھیں میری قسمت سے جب گہر ریزیاں نہ دیکھ سکو کیا ہوا آگاہ قدر و قیمت سے
مشکل آسان ہے خدا کی قسم کام لو گر ذرا بھی ہمت سے خوش ہوا دیکھ کر یہ میں خط میں
پڑھنے بیٹھو گی تم بھی فرصت سے ڈالدو طرح علم جیسی ہو ٹھیک کر لونگا پہر تو محنت سے
مرد جاہل تھا سکر بل بھی بادشاہ ہوگیا تھا قسمت سے اسکو بیوی کا خط ملا اکدن
جسمیں لکھا تھا کہ منت سے عاجزہ چاہتی ہی یہ سکہ جواب ہو لکھا خاص دست حضرت سے
رو دیا میر بے کمالی پر عرق آنے لگا خجالت سے کی مناجات گر کے سجدے میں
عالم الغیب والشہادت سے علم دے مجھکو اے خدا یا مرگ کیونکہ بہتر ہے موت ذلت سے
لگ گئی آنکھ یونہی سجدے میں دیکھا اک شخص اہل نسبت سے کہہ رہا ہے کہ اٹھ نہ رو اتنا
کام کر دل ہی شوق و محنت سے لکھنے پڑھنے لگا اسی دن سے زور دینے لگا طبیعت سے
ہو گیا چند روز میں دیکھو میر مردان با فضیلت سے کاشکہ تم بھی ایسی ہو جاؤ
کام کر جاؤ کچھ نہ ہمت سے پہر تو کر لونگا تم کو میں بہتر سارے کنبے کے مرد و عورت سے

[illegible]

فرمان روائے بھوپال

اکثر لوگ جو طبقہ نسواں کی دماغی قابلیتوں سے انکار کرنے کی عادی ہیں اوس وقت بہت متذبذب اور پریشان ہوتے ہیں جب واقعات اونکے زعم باطل کی مشاہدہ سے تردید کردیتے ہیں۔

زمانہ سلف میں جو فخر روزگار اور یکتائے عصر خواتین ہوگذری ہیں اون کے کارناموں سے چشم پوشی کرنا بالکل غیرممکن ہے۔ تاریخ کی کتابیں اون کے تفصیلی حالات سے بھری پڑی ہیں اور بتلا رہی ہیں کہ مساوات کا قائم کرنا عین اقتضائے فطرت ہے۔ لیکن اگر اس سے بھی قطع نظر کرلیا جائے تو زمانہ موجودہ میں بھی ایسی بہترین مثالیں موجود ہیں جن سے اصول مساوات کی مضبوطی میں اور استحکام ہوتا ہے۔ اور اون کے حالات فخریہ بیان کیے جاسکتے ہیں۔

ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال جنکی بیدار مغزی اور روشن ضمیری تعریف سے مستغنی ہیں علاوہ ایک منتظم اور باخبر فرمانروا ہونے کے ملک و قوم کے لیے مایۂ نازش خاتون ہیں اور آپ کا شمار عہد جدید کے مصلحان ملت میں کیا جاتا ہے۔ آپکی علمدوست۔ قومی ہمدردی۔ ایثار نفسی اصابت رائے امتیازی قابلیت نے آپکو یورپ میں بھی "فخر نسواں جہاں" کا خطاب دلایا ہے۔ آجکل آپ ممالک یورپ کی سیاحت فرما رہی ہیں۔ اس سفر میں بھی آپنے مختلف موقعوں پر اپنی طبعی فیاضی کا اظہار فرمایا ہے جس کے تفصیلی حالات اخبار بیں حضرات سے پوشیدہ نہیں یورپ کے اکثر اخبارات و رسائل نے

متعدد آرٹیکل علیا حضرت کے متعلق شائع کیئے ہیں اور چونکہ وہاں کی پبلک حضور عالیہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی بہت زیادہ شایق ہے اس لیے بعض اڈیٹروں نے اپنی واقفیت کی کمی کو اپنے قوت واہمہ کے ذریعہ سے پورا کر کے بہت سی بے سر و پا باتیں بیگم صاحبہ کی نسبت مشتہر کی ہیں۔

نہ صرف اس غلط فہمی کو رفع کرنے کی غرض سے بلکہ دنیا کو ایک فرمانروا خاتون کی قابلیت ملکداری سے مطلع کرنے کے لیئے آج ہم حضور ممدوحہ کے صحیح حالات۔ ان کا طرز حکومت ملکی انتظامات۔ وغیرہ کی اشاعت سے اوراق تمدّن کو مزین کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ ایک فرمانروا خاتون کا آئین ملکداری اور انتظام ریاست بہت سے حکمراں مردوں سے زیادہ بہتر ہے جس سے اصول مساوات کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔

تمدن کے مقاصد میں زبان اردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہونچانا ہے۔ اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ عورتوں کی دماغی قابلیتوں کا مردوں سے اعتراف کرایا جائے اور یہ کام زیادہ تر نظائر ہی سے چل سکتا ہے ہمارے عزیز دوست مولانا ارشد تھانوی دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ اونھوں نے مہربانی فرما کر اس خاص موقع پر یہ ضروری اور دلچسپ مضمون ہمیں عنایت فرمایا۔ چونکہ راقم مضمون ایک عرصے سے بھوپال میں قیام پذیر ہیں۔ اس لیے اونہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب چشمدید واقعات اور مشاہدات کے صحیح نتائج ہیں +

نظم و نسق آمدہ است تو ہمہ ساماں ہا | معمور کند مقدمت اقبال وطن را
از فیض تو افزایش علم است بہ بھوپال | ذات تو پئے آں خطہ سہیل است یمن را

جناب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ و جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔

والیہ ریاست بھوپال۔ فطرت نے ایسا دل و دماغ لیکر آئی ہیں جو عامۂ مخلوق کی بہبودی کا سچا رہنما اور اسکی اصلاح معاشرت کا بہترین ہادی ہے۔

جب حضور عالیہ مسند نشین ریاست ہوئیں اسوقت بجز بیرونی اصحاب کے عام رعایائے بھوپال تعلیمی و اخلاقی حیثیت سے کچھ اچھی حالت میں نہ تھی۔ علمی کمی اور غیر مناسب کورس نے عام طبقہ کو علوم جدیدہ کی روشنی سے بالکل محروم کر رکھا تھا علیا حضرت نے سب سے پہلے ملک کی اس پستی کا احساس فرمایا اور اوسکو علمی رفعت پر پہونچانے کے لیے کوئی کوشش اوٹھا نہ رکھی۔ چونکہ حضور ممدوحہ خود علوم جدیدہ و قدیمہ میں غیر معمولی دستگاہ رکھتی ہیں۔ اور عربی و فارسی و انگریزی وغیرہ سے بخوبی ماہر ہیں اس لیے علمدوست بیگم صاحبہ کی تعلیمی تحریک کا عام رعایا پر بہت اچھا اثر پڑا۔ چنانچہ اسوقت خاص شہر بھوپال میں متعدد مدارس جہانگیریہ اسکول سلیمانیہ اسکول الگزنڈرا ہائی اسکول وغیرہ سرکاری طور پر قایم ہیں۔ جہاں ہر قسم کی تعلیم بلا کسی معاوضہ کے دیجاتی ہے۔ عام رعایا کو شوق اور توجہ دلانے کے لیے ہر ہائنیس بیگم صاحبہ نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ پرنس محمد حمید اللہ خانصاحب بہادر کو بجائے کسی خاص کالج (اجمیر وغیرہ) میں بھیجنے کے الگزنڈرا ہائی اسکول میں داخل کر کے عرصہ تک تعلیم دلائی۔ قریب قریب تمام ملک محروسہ کے محالات اور پرگنوں میں مدارس عمدہ پیمانہ پر جاری ہیں۔ اور خاص توجہ کے ساتھ تعلیم ہوتی ہے۔ حال میں کنڈرگارٹن کے طریقہ پر بھی سلسلہ تعلیم جاری کیا گیا ہے۔

ہندو مسلمانوں کی لڑکیوں کے لیے بھی شہر میں بہترین تعلیم گاہیں قایم ہیں جنمیں مذہبی تدریس کے ساتھ۔ اردو۔ ہندی۔ انگریزی وغیرہ ضروریات زمانہ کے مطابق باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ کھانا پکانے۔ سینے پرونے۔ سوزن کاری کے دیگر ہنر خاص طور پر سکھلائے جاتے ہیں۔ پچھلے سالوں میں ان مدارس کے

سینے ہوئے کام اور اشیاء کی ایک دلچسپ نمایش بھی سلطانیہ گرل اسکول میں ہوئی تھی لاہور اور ناگپور کی نمایشوں میں یہاں کی لڑکیاں انعامات و تمغے حاصل کر چکی ہیں الہ آباد اگزہبیشن میں بھی ان کی دستکاری کے اعلیٰ نمونے رکھے گئے ہیں۔ ہر قوم کی لڑکیوں کو اسکول لانے اور واپس پہونچانے کے لیے پردہ دار گاڑیاں بلا کسی کرایہ کے سرکاری طور پر مقرر ہیں مستحق طالبات علم کو معقول وظایف دیے جاتے ہیں

زمانہ حال کے ایک مشہور فاضل کا قول ہے "سستی اور بیکاری جس سے عموماً عورتیں مالوف ہیں۔ تمام رذائل کی اصل اصول ہے۔ مستورات نہ عمدہ طور پر اپنے گھروں کے کاروبار انجام دیتی ہیں نہ کسی قسم کی صنعت و حرفت اختیار کرتی ہیں نہ کوئی ہنر جانتی ہیں نہ علمی مشغلہ رکھتی ہیں" حضور ممدوحہ نے نسوانی ہمدردی سے اس الزام کو عورتوں کے سر سے دور کرنے کے لیے بہتریں وسائل کا استعمال فرمایا ہے منجملہ ایک بڑا مدرسہ خاص شہر میں "مدرسہ صنعت و حرفت نسواں" کے نام سے قایم ہے جہاں عورتوں کو مختلف قسم کے ہنر سکھلائے جاتے ہیں۔ اور جو سابق مستورات بوجہ کم استطاعتی حصول معاش کے ذریعوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے اکتساب ہنر کے لیے وقت نہیں نکال سکتیں۔ اون کے واسطے سرکار عالیہ نے اپنی طبعی فیاضی سے بلا تخصیص عام طور پر کثیر التعداد اسکالرشپ مقرر فرمائے ہیں۔

حضور بیگم صاحبہ کو تعلیمی امور سے جو خاص دلچسپی ہے اوس کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے اکثر قومی مدارس اور تعلیمی انجمنیں مثلاً دار العلوم ندوہ۔ مدرسہ عالیہ دیوبند۔ مدرسہ عربی مراد آباد۔ مدرسہ تعلیم القرآن لاہور وغیرہ وغیرہ حضور عالیہ کی فیاضیوں کے تواتر کے ساتھ زیر بار احسان ہیں۔ علیگڈھ میں زمانہ نصاب تعلیم حضور ممدوحہ کی سرپرستی ہی سے مرتب ہوا ہے۔ حال میں نمایش الہ آباد کے موقع پر بیگم صاحبہ ہی نے سب سے پہلے مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک لاکھ روپیہ کے عطیہ کا

اظہار فرمایا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہتری بورڈنگ ہاؤس ہوشنگ آباد کو معقول امداد دیجا چکی ہے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ کا معائنہ فرما کر مبلغ پچاس ہزار روپیہ برقی روشنی اور برقی پنکھوں کے لیے بلا کسی تحریک کے مرحمت فرمانے کی خواہش ظاہر کی۔ حضور ہی کی توجہ خاص کا نتیجہ ہے کہ منجھلے صاحبزادے عالیجناب حاجی حافظ محمد عبید اللہ خانصاحب بہادر نے بھی کالج مذکور کو مبلغ پچاس ہزار روپیہ مرحمت فرمایا ہے

ہرچند کہ باشد و طمش بلد بھوپال لیکن ز عطا فیض رساں چین و ختن را

علمی طور پر طب قدیم اور جدید کے امتزاج سے جو اعلیٰ ترین ترقی معالجات میں پیدا ہوسکتی تھی۔ اوسکی طرف سب سے پہلے حضور عالیہ ہی کا خیال منتقل ہوا۔ چنانچہ ریاست میں ایک بڑا مدرسہ طبیہ بھی قائم فرمایا جسمیں ڈاکٹری اور طب یونانی کی مکمل تعلیم دیجاتی ہے۔ ریاست کے تمام قصبات میں ڈاکٹر اور طبیب دونوں طریقوں پر علاج کرنے کے لیے تعینات ہیں۔ یونانی اور انگریزی دونوں قسم کی ادویہ رعایا کو مفت دیجاتی ہیں اطبائے یونانی کا تقرر ڈاکٹری امتحان پاس کرنے کے بعد کیا جاتا ہے۔ خاص شہر میں اسسٹنٹ سرجن اور سب اسسٹنٹ سرجنوں کے علاوہ افسر الاطبا۔ اون کے متعدد نائبین وغیرہ اور وید علاج کے لیے تعینات ہیں۔ انگریزی اسپتالوں کی طرح یونانی شفاخانوں میں بھی مریضوں کو تیار شدہ دوائیں مفت دیجاتی ہیں۔ اور اسیطرح ویدک کی دوائیں تقسیم ہوتی ہیں۔

جو علمی کتابیں حضور عالیہ کے نام پر ڈیڈیکیٹ ہوئی ہیں۔ اون میں ڈاکٹری اور طب یونانی کی مجموعی تالیفات بھی ہیں۔

تین سال ہوئے وسط شہر میں حمیدیہ لائبریری کے نام سے عامۂ خلایق میں علمی دلچسپی پیدا کرانے کے لیے ایک کتب خانہ قائم کیا گیا تھا اب اس غرض

کے لیے ایک عظیم الشان عمارت بالفعل ایک لاکھ روپیہ کی تیاری سے زیر تکمیل ہے

حضور عالیہ کی علمی دلچسپی نے باوجود فرمانروایانہ مصروفیتوں کے بھی۔سفرنامہ حجاز و تاریخ بھوپال وغیرہ جیسی ضخیم کتابوں کو سلطانی تصانیف کا فخر عطا کیا ہے۔حضور کی اکثر تقریروں اور لکچروں کے اقتباسات بہترین رسائل نے فخریہ چھاپے ہیں

اے مرتفع زنسبت ذاتِ تو شانِ علم
کلکِ گہرفشانِ تو رطب اللسانِ علم

فائن آرٹس یعنی فنونِ لطیفہ کیطرف بھی بیگم صاحبہ کو ایک طبعی رجحان ہے۔ موجودہ میوزیم کی دلکشا اور نظر فریب عمارت عجائب ذخیرے سے مالامال ہے۔بھوپال میں داخل ہونیوالے سیاحوں کی نظریں سب سے پہلے اسی پُرفضا مقام پڑتی ہیں۔جس کے چاروں طرف چمن بندی کرکے اور بھی پُرلطف بنادیا گیا ہے

ہندوستان کے مختلف شہروں کی نمائشوں میں دستکاری کا انعام حاصل کرنے والی بیگمات عموماً سرکار بھوپال کی فیاضی سے مستفید ہوئی ہیں پسندیدہ چیزیں ایجاد کرنیوالی خواتین نے بھی اکثر حضور ممدوحہ کی قدردانی سے فائدہ لوٹا ہے۔علیاحضرت خود بھی اعلیٰ درجہ کی صناع اور دستکار ہیں۔اس کے متعلق بعض دلچسپ و کارآمد مضامین بھی بعض زنانہ رسالوں خاتون وغیرہ میں حضور عالیہ کی جانب سے شائع ہوئے ہیں۔

مسئلہ اتحاد و تبادلۂ خیالات کی صورتیں بہم پہونچانے کے اصول کو ہمیشہ واجب العمل بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔چونکہ مردوں کی ترقی کا مدار ملکی عورتوں سے وابستہ ہے۔اس لیے کچھ عرصہ سے خواتین کو اس مفید طریق عمل سے بہرہ یاب بنانے کی کوششیں ہندوستان میں کی جارہی ہیں۔لیڈیز کانفرنس پر مضامین نکل رہے ہیں۔پردہ پارٹیوں کے رواج کی تائید کی جاتی ہے۔اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ پر

روشنی ڈالی جاتی ہے لیکن جناب نواب بیگم صاحبہ نے عرصہ ہوا کہ لیڈیز کلب قایم فرماکر اپنے یہاں کی خواتین کو باہمی میل جول کے فوائد سے آگاہ کردیا ہے۔

ناتجربہ کار اور بیوقوف دائیوں کی جہالت سے صنف نازک کے افراد کو ہمیشہ ناقابل تلافی نقصان پہونچتا رہا ہے جن کی تکالیف کا احساس کرکے بعض ہمدردان ملک نے ہندوستان کے بعض شہروں میں دائیوں کے مدرسے کہولنے اور اون کو ضروری تعلیم دینے کیطرف توجہہ کی ہے۔ مگر علیا حضرت دام اقبالہا نے قانوناً ناواقف دائیوں کو اپنی حدود میں کام کرنے سے روک دیا ہے لینسڈوُن لیڈیز ہسپتال بھوپال میں دائیاں ایک میعاد معینہ تک تعلیم حاصل کرکے لیڈی ڈاکٹر کے زیرنگرانی کام کرتی ہیں اوس کے بعد اون کو اپنے طور پر کام کرنے کی تحریری اجازت دیجاتی ہے۔ اور بصورت خلاف ورزی عدالت سے قانونی مواخذہ کیا جاتا ہے۔

ہرہائنس بیگم صاحبہ بہوپال اون بہترین والیان ریاست میں سے ہیں جنکی مدبرانہ قابلیت ملکداری نظیرآ پیش کیجاتی ہے اور جن کے اصول حکمرانی کو گورنمنٹ انگلشیہ نے بنظر پسندیدگی دیکھا ہے۔ ہزمجسٹی امیر حبیب اللہ خاں شاہ کابل حضور عالیہ کی خداداد قابلیت کا دربار آگرہ کے موقع پر خاص طور پر اعتراف فرماچکے ہیں۔

حضور ممدوحہ کی تخت نشینی کے وقت اہالیان بہوپال شایستہ قوموں سے کئی صدی پیچہے تھے سلطنت برطانیہ کی بدولت جو اسباب ترقی زمانہ موجودہ میں تمام ہندوستان کو اپنی برکتوں سے معمور فرما رہے ہیں۔ ان سے کوئی ضروادہی نہ تھا طرز معاشرت کی وہی قدیمی شان تہی تمام ریاست میں باستثنائے بعض وہی اگلے وقتوں کے قانون و قواعد جاری تہے۔

جناب بیگم صاحبہ حال نے غیر معمولی سرگرمی سے اپنے ملک کو ترقی یافتہ بنانیکی کوشش کی ملک کے ہر ہر حصّہ میں بذات خاص دورہ فرماکر اوسکی صحیح حالت کا معائنہ کیا صیغۂ مال عدالت کے جداگانہ وزرار مقرر فرمائے بندوبست نئے طریقہ پر عمل میں لایا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ حضور عالیہ کو اپنی تمام رعایا اور ملازمان سے مادرانہ محبت ہے اور وہ انتہائی شفقت سے اپنے تمام باشندگان ملک کو آرام و آسایش پہونچانے کی تجویز میں ہر وقت مصروف رہتی ہیں ۱۹۰۳؁ء میں جب شہر بھوپال میں پلیگ کی کثرت ہوئی اسوقت حضور عالیہ کو اپنی رعایا کی حالت پر جیسی کچھ بیچینی تھی اسکا تحریر میں لانا حد امکان سے باہر ہے غیر معمولی وقت تھا جسکو رعایائے بھوپال تمام عمر فراموش نہیں کرسکتی میڈیکل اسٹاف بہت بڑھا دیا گیا ہزارہا روپیہ کی دوا ملک میں حفظ ماتقدم کے لیے تقسیم کی گئی۔ اول خود سب سے پہلے ٹیکہ لیا۔ اور اس کے فوائد پر اپنی تقریروں میں عوام کو توجہ دلائی تمام عمال اور حکام کے نام ٹیکہ لینے اور رعایا کو ٹیکہ کے فوائد سمجھا کر آمادہ کرنیکے لیے احکام نافذ فرمائے گئے جس سے تمام ملک نے حضور عالیہ کی مادرانہ محبت کا بخوبی اندازہ کرلیا۔

حضور عالیہ کے تین صاحبزادے ہیں بڑے صاحبزادے عالیجناب نواب محمد نصر اللہ خانصاحب بہادر ولیعہد ریاست ہیں جو حضور عالیہ آپ کو ریاست کے مختلف کام وقتاً فوقتاً سپرد فرماتی رہتی ہیں۔ منجھلے صاحبزادے حاجی حافظ کرنل محمد عبید اللہ خاں صاحب بہادر ایڈیکانگ ٹو ہز اکسیلنسی وایسرائے گورنر جنرل کشور ہند کو فوجی کام سپرد ہے۔ آپکی خداداد قابلیت اور حسن تدبیر سے فوجی انتظام نہایت عمدہ حالت میں ہے جسکی تعریف لارڈ کچنر صاحب بہادر جیسے نامور کمانڈر انچیف افواج ہند کرچکے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے پرنس حاجی محمد حمید اللہ خانصاحب بہادر فی الحال علیگڈھ کالج میں اپنی تعلیم کی تکمیل فرما رہے ہیں الغرض نواب بیگم صاحبہ ایک باخبر مدبر بیدار مغز اور روشن ضمیر فرمانروا ہے ملک میں خدا حضور عالیہ کے عمر و اقبال میں روز افزوں ترقی دے آمین۔ رعایائے بھوپال کی

ش نصیبی میں بھی شک نہیں کہ اوسکو ایک ایسا شفیق و دلسوز ہمدرد۔۔ دادگستر فرمانروا نصیب ہے سچ ہے ۵ بقول کسے نیکی پسند و خدا ترس + رعیت خسرو عادل و نیکرائے +
ارشد تھانوی

مُرغِ بسمل

اب پر و پرواز کے قابل ترے بازو کہاں! خاک تیرائے تجھے موجِ نسیمِ گلستاں!
تجھ پہ چھائیگی نہ شاخِ گل پہ وہ خود رفتگی! تو نالانِ چمن کی لوریوں میں پھر کبھی!

اب بہارِ سبزہ و گل سے بھی تو محروم ہے شوقِ دل کی کشمکش اور دیدِ گل معدوم ہے
خس کی خوشبوئی سے دل ہوگا نہ ہر فرحت فزا سیوتی کے کنج میں ہوگا نہ تیرا گھونسلا

خوب طوفاں میں نکالے تو نے دل کے حوصلے اب کہاں سرگوشیاں وہ ابرِ دریا بار سے
اب فقط سبزہ پہ سر دیکر پھڑکنا رہ گیا اِن شکستہ بازوؤں کے تولنے سے فائدہ؟

گرچہ تو مایوس ہے اور ختم الفت ہو چکی پر مری دلسوز ہے یہ دو گھڑی کی زندگی۔
کیونکہ وہ ناوک فگن جسکا کہ تو نخچیر ہے میرے بھی مجروح کرنیکو اوسی کا تیر ہے

میں بھی لذت آشنا ہوں عشق کے طوفان کا شوقِ دل سے کر لیا ہے میں نے سر یہ معرکہ
چاندنی راتوں میں کیں میں نے فلک پروازیاں فصلِ گل میں شاہدِ گل سے رہیں دمسازیاں

خاک سے اُٹھنے کی بھی اب تو نہیں طاقت رہی رینگتا چلتا ہوں غمگیں ڈرتا ہوں ہمدم ہر گھڑی
وہ کماں ابرو کہ جس نے کر لیا تیرا شکار کیا عجب ہو اوسکو اوسی کی طرح مجھ پر بھی پیار

(ترجمہ نظم ڈورا سگرسن شارٹر مطبوعہ ونڈسر میگزین)

محمد سیف الدین شباب

آئینۂ عبرت

ہماری بیدار مغز علم دوست بہی خواہ قوم اور نہایت قابل بہن جناب نجستہ اختر بانو سہروردیہ بیگم صاحبہ نے مس ہنری وڈ کے ایک اخلاقی ناول کا ترجمہ کیا ہے جس کا نام آئینۂ عبرت ہے۔ بہن مذکورہ نے ایک جلد تحفۃً مجھے ارسال فرمائی ہے۔ ناول اصل زبان میں عرصہ ہوا میں پڑھ چکی تھی مجھے یاد ہے کہ پڑھتے ہی شوق غالب ہوا تھا کہ اسکا ترجمہ ہو جائے کیونکہ اس میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو بیبیات کے لیے نہایت مفید اور قابل مطالعہ معلوم ہوئیں۔ خیر میرا تو خیال ہی خیال رہا لیکن ہماری لائق بہن نے اسکام کو پورا کر کے دکھایا۔ ترجمہ سلیس زبان میں ہے اور اس بات کا حتے الوسع خیال رکھا گیا ہے کہ انگریزی الفاظ شامل نہ کیے جائیں یہ واقعی بہت ہی خوبی کی بات ہے کیونکہ آجکل مرد بمشکل اس بات کا خیال رکھتے ہیں رسالے اور ناول غیر ضروری انگریزی الفاظ سے خلط ملط ہو کر عجیب صورت پیدا کرتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہو اور اُردو فارسی۔ عربی کے لفظ نہ ملتے ہوں وہاں اور بات ہے لیکن بے جا ٹھونس دیے جانے کے لیے تو بہت ہی غیر موزوں معلوم ہوتا ہے بلکہ زبان کا لطف جاتا رہتا ہے۔ بعض مشرقی علوم کے جاننے والے جنکو انگریزی زبان میں دخل نہیں وہ حضرات جب انگریزی لفظوں سے اپنی عبارت کو رنگتے ہیں تب تو سبحان اللہ ایسی وضع پیدا ہوتی ہے کہ بے اختیار یہی خیال آتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ کاش لیٹر پیپر نہ بنے ہوتے بطور مثال ایک جملہ ہدیۂ ناظرین کرتی ہوں ایک بوڑھے غرانٹ فرماتے ہیں:۔ (اثنائے گفتگو میں) چیلڈرن ونڈو میں سے پیپ کرتے ہیں (اُردو کا تو خدا حافظ ہے ہی) لیکن انگریزی کا حشر بھی تو ملاحظہ ہو!

یعنے اُن کا مطلب ہے کہ بچے کھڑکی یا دریچہ سے جھانکتے ہیں" ایسی زبان سے کسکو نفع ہو سکتا ہے۔ تحریر میں بھی بعض حضرات غضب ڈھاتے ہیں اور یہہ عبارت بہت کریہ معلوم ہوتی ہے یہ تو میں ہی جانتی ہوں کہ حکومت کا اثر یہی بات ہے مگر کچھ تو پرہیز ہو۔

ہماری بہنیں اس کتاب کے پڑھنے سے مستفید ہوں تو نہایت مناسب ہے اس سے اخلاق سبق حاصل ہو سکتے ہیں کارپردازی اور محنت کشی کے فائدے معلوم ہو سکتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ نصیحت آموز ہونے کے علاوہ دلچسپی سے معمور ہے یقین ہے کہ جو صاحب طلب کرینگے وہ ضرور خوش ہوں گے۔ بہو۔ بیٹیوں کے پڑھنے قابل ہے۔

آجکل ہماری قوم میں مرد اور بیبیوں کو ناول نویسی کا زیادہ شوق ہے لیکن اس بات کا کم خیال ہے کہ عوام الناس پر اس کا اثر کیا ہوگا۔ اکثر ناولوں میں میں نے پڑھا ہے کہ طوائفوں کے ناشائستہ قصوں کو قلمبند کر دیا۔ اس سے مصنف کا منشا تو یہہ ہوتا ہے کہ رزیل عورتوں کی برائیاں جتا کر شریفونکو آئے دن کی مصیبتوں سے باز رکھا جائے۔ کیونکہ ان ہی بے درمان بلاؤں نے ہندوستان کی مٹی پلید کر دی ہے مگر یہہ پیرایہ اور بھی زہر کا کام کرتا ہے باز رہنا تو درکنار ایسے قصے پڑھکر الٹی رغبت پیدا ہوتی ہے اور خاصکر ان غریبوں کے لیے ستم ہے جو معصوم اور ناتجربہ کار ہیں گویا ان کو واقفیت پیدا کروانا ہے۔ اچھا پھر ہر ایک کا دماغ ایسا پختہ نہیں ہوتا جو ناولوں کے پیرایے کو صحیح نگاہ سے جانچ پڑتال کر سکے اس واسطے کل قوم پر بڑا احسان ہو اگر ان بازاری عورتوں کے قصے یک لخت لکھنے موقوف ہو جائیں۔ اگر ان ناول نویسوں میں اتنا مادہ نہیں کہ اپنے آپ کوئی دلچسپ اور بے ضرر

قدر کرسکیں تو انگریزی اخلاقی قصے بیسیوں موجود ہیں ان کا ترجمہ کریں۔ نہ کہ رینلڑ کے سے غیر مہذب قصوں کو ترجمہ کرکے عوام الناس کی خیالات منتشر کریں۔ فرض کیجئے ایک باپ اگر رینلڑ کا ترجمہ اپنے گھر لانے گا تو کیا وہ یہ توقع رکھہ سکتا ہے کہ صرف اسی کی نگاہ اِن ناقابل ناولوں پر پڑیگی مجھے تو مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ساختہ یا بے ساختہ گھر والوں کی نظر کسی کسی دن اسپر نہ پڑے اس واسطے ایسے قصے ہی نہوں جو بچے جوان بوڑھے سب برباد ہوں۔ خیر جو قصے شائع ہو چکے ہیں انکا تدارک مشکل ہے لیکن یہ آسان ہے کہ اسباب پر غور کیا جائے اور تباہ کن قصے کہانیاں بالکل موقوف کر دیے جائیں یہ ذریعہ ضرور اخلاق کی درستی کا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ناولوں کا اثر نامعلوم جادوئی اثر ہے اس سے بہت جلد کچے دماغوں پر علی الخصوص برائی بھلائی پیوست ہوسکتی ہے جیسے نیک اور بد صحبت کا اثر کسی نے خوب کہا ہے

با بدنشینی و باشی بیگانۂ او   در دام افتی اگر خوری دانۂ او

اخلاق کی درستی سے کل قوم درست ہوسکتی ہے اس کے سوا سب ہیچ ہے۔ نہ عقل رہتی ہے نہ ہوش۔ سب کا خدا حافظ ہو جاتا ہے۔ اب تو صرف یہ بات باقی ہے کہ رہی سہی عقل کا ذخیرہ کر لیں نہ کہ جو ہے اسکو بھی خیرباد کہہ کر خدا پر توکل کرکے اس شعر کو دہراتے بیٹھیں ؎ سپردم بتو مایۂ خویش را۔ تو دانی حساب کم و بیش را۔ یا یہ ترکی شعر کو مارے وجدانیت میں جھوم جھوم کر پڑھیں ؎

نہ عقلم دانہ تدبیرم نہ فکرم   توکلت علی اللہ او مولائی ذکرم

آئینہ عبرت کے ملنے کا پتہ۔ جناب مسز زاہد سہروردیہ بیگم صاحبہ ۴۴ ۳۔ ایلیٹ روڈ۔ کلکتہ

زہرا بیگم فیضی۔

چاند سے سبق

کشتی سیمیں ہے تیری ماہِ نو نازک بہت ‎ ‎ تجھکو طے کرنا ہے بحرِ چرخِ ناپید اکنار
بادباں کوئی نہیں، اور ناخدا کوئی نہیں ‎ ‎ رُخ ہوا کا بھی نہیں معلوم ہوتا سازگار
پاس ہے پارو، نہ لنگر، اور نہ ہے کوئی رفیق ‎ ‎ میں تو ایسے رخت پر ہمت نکرتا زینہار
راہ میں تجھکو ملیں گے کتنے بادل کے پہاڑ ‎ ‎ یہ رہی ہے تیز جن سے کہکشاں کی آبشار
لقمۂ حوتِ فلک ہونے سے تو گر بچ گئی ‎ ‎ آگے گردابِ ثریا کو ہے تیرا انتظار
مجھکو حیرت ہے کہ ان دشواریوں پر بھی غضب ‎ ‎ ہے متانت کسقدر رفتار میں کتنا وقار
لیٹے لیٹے سوچتا تھا ایک شب تنہا یہی ‎ ‎ خوف آتا تھا یہی بس دل میں میرے بار بار
کان میں میرے مگر طعنِ ملامت سے رلی ‎ ‎ ناگہاں آئی صدائے خندۂ بے اختیار
اوٹھ گئی میری نگہ، دیکھا کہ ہلکی چاندنی ‎ ‎ لوٹتی ہے فرش پر ہوکر ہنسی سے بیقرار
پھر کہا اوس سے یہ میں نے اے شعاعِ ناتواں ‎ ‎ ہو نہ جائے یہ قبائے سیم تیری تار تار
بولی وہ ”اے مردِ نادیدہ“ اس و ذی شعور ‎ ‎ ہے سمجھ پر اپنے تجھکو اسقدر کیوں افتخار
میں سمجھتی تھی کہ تو لکھا پڑھا ذی ہوش ہے ‎ ‎ ہوگا فرزانہ بڑا تو، عقل ہوگی تیری یار
تیری جانب سے غلط نکلا مگر میرا خیال ‎ ‎ تو ہے بالکل پست ہمت ہے بجز وغفلت شعار
ہو اگر دنیا تری ہمت پہ ساری کاربند ‎ ‎ نظمِ عالم میں یقیں ہے پھیل جائے انتشار
چھوڑ دے ہر شخص اپنے فرض کو یہ سوچ کر ‎ ‎ کیا کریں، کیونکر کریں، اسباب ہیں نا استوار
آئی ہوں طے کر کے اتنا فاصلہ مجھکو بھی دیکھ ‎ ‎ گرچہ ہوں نازک، نحیف و ناتوان و زار و نزار
آج، ہوں گر ہمتیں تیری طرح میری بھی پست ‎ ‎ کسطرح ٹوٹے تو پھر لطفِ کنارِ گلعذار
کھیتیاں ہوں خشک ساری مد و جزر ہو جائے بند ‎ ‎ دانے دانے کو پھریں محتاج سارے تاجدار
باندھتا ہے گر کوئی ہمت ادائے فرض میں ‎ ‎ مشکلیں آسان کر دیتا ہے اوسکی کردگار

خود مگر تو ہاتھ پیر اپنے چلا سکتا نہیں + قرض لینے پر تو ظالم کہلائے مہیا ہی ہو دہار + اوٹھ بہ کمر ہمت ہو کام کر رفتارِ دنیا دیکھ کر + کام دیگی کب تلک یہ زندگی مستعار + نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری۔

مہتدی باللہ

دولت عباسیہ کا چودہواں شاہنشاہ مہتدی باللہ ہے۔ اس کا نام محمد تہا اور کنیت ابو محمد اسحاق بعض لوگوں نے ابو عبداللہ بھی کنیت بتلائی ہے۔ اس کا باپ واثق باللہ تہا۔ اور خلفائے عباسیہ کی طرح یہ خلیفہ بھی لونڈی زادہ ہے۔ مہتدی کی ماں کا نام وردہ تھا جو بربر کی سرزمین سے آئی تھی۔

مہتدی کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے بعض مورخین کے نزدیک ۲۲۳ھ سنہ ولادت ہے اور بعض نے ۲۱۹ھ ہجری میں واقعہ پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے اوس سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے۔ یہ زمانہ معتصم باللہ کی خلافت کا تہا۔

جب ماہ رجب ۲۵۵ھ کے آخر عشرہ میں معتز باللہ کے معزول کرنے کی صالح بن وصیف اور موسیٰ بن بغا سازش کر چکے تو اونہوں نے محمد سے مسند خلافت کو رونق دینے کیلیے کہا۔ محمد بن واثق۔ معتز باللہ کے اون مظالم سے جو اُسنے اسپر زمام سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی شروع کر دیے۔ تہے تنگ آکر معتز سے متنفر ہو چکا تہا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اوس نے ترکوں کی استدعا منظور کر لی۔ اور رجب ۲۵۵ھ کی آخری شب کو ترکوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ لیکن عام طور پر مہتدی کی بیعت کی اُسوقت تک اشاعت نہیں ہوئی اور نہ کسی نے اس کی خلافت کو تسلیم کیا جب تک کہ معتز اپنا عجز ظاہر کر کے سلطنت سے دست بردار نہ ہو لیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ مہتدی ترکوں سے بیعت لینے کے بعد معتز کے پاس اس غرض سے گیا کہ معتز اس کے سامنے اپنا عجز ظاہر کر دے۔ معتز جو نمک حرام ترکوں کی

اذیت رسانی اور خود غرضیوں سے بحد پریشان ہوچکا تھا فوراً مہتدی کو اپنا جانشین تسلیم کرکے وہیں بیٹھ گیا اور خلیفہ اپنے دباری کمرہ میں چلا گیا۔ قانون حکمت کے موافق جب معتز کے عزل پر گواہ طلب کیے گئے تو ترکوں کے ایک گروہ نے بطریق شہادت بیان کیا کہ معتز بار خلافت کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ لہذا سلطنت کا والی دوسرے شخص کو قرار دینا چاہیئے۔ معتز ترکوں کی سازش سے تنگ آہی چکا تھا۔ اس نے اپنے عجز کا اعتراف کرکے بیعت کے لیے مہتدی کیطرف ہاتھ بڑھا دیا۔ کیونکہ ترکوں نے اوس کے تخت خلافت سے سبکدوش ہونے کے لیے سخت تکلیفیں پہونچانی شروع کردی تھیں جس زمانہ میں معتز معزول کیا گیا ہے یہ گرمیوں کا موسم تھا۔

امام سیوطی نے تاریخ الخلفا میں مہتدی کا حلیہ لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ مہتدی حسین ملیح اور گندم گوں ہونے کے ساتھ ہی بہادر متقی، عابد اور خدا کے احکام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیطرح سخت واقع ہوا تھا۔

مورخ خطیب بغدادی مہتدی کے حالات میں رقم طراز ہیں کہ "مہتدی جس دن سے خلافت عباسیہ کی قسمت کا مالک ہوا تھا ہمیشہ (زندگی بھر) صائم رہا"

مہتدی خلیفہ تھا اوسے ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے سلطنت عباسیہ کے سیاہ اور سفید کرنے میں اوسے کوئی منع نہیں کرسکتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اور خلفا کی طرح عیش و آرام سے زندگی بسر کرتا لیکن نہیں! اوس نے کبھی عمدہ کھانا نہیں کھایا اچھے کپڑے نہیں پہنے جس طرح عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ ہوتے ہی اپنی جائداد اور زر و مال اہل حق کے حوالہ کرکے خلفاء راشدین کے طریقہ پر حیات بسر کی تھی۔ اسیطرح مہتدی بھی فرائض خداوندی اور حقوق عباد کا لحاظ کرکے آسائش جسمانی چھوڑ چکا تھا۔ اور ہمیشہ اپنی رعایا کی دلجوئی میں مصروف رہتا تھا۔

ہاشم ابن قاسم اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رمضان میں

خلیفہ مہتدی کی خدمت میں عشا کے وقت حاضر ہوا۔ تہوڑی دیر بیٹھکر جب اپنے گھر واپس آنے کے لیے اٹھا تو مہتدی نے کہا بیٹھو! میں پہر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اٹھ کر ہمارے ساتھ نماز پڑہی۔ اور نماز سے فارغ ہو کر کہانا طلب کیا۔ اتنے میں ایک بید کا دستر خوان حاضر کیا گیا۔ اسپر چند میدہ کی روٹیاں تہیں۔ اور دو ایک پیالوں میں نمک، سرکہ اور زیتون کا تیل تہا۔ مہتدی نے مجھ سے کہانے کے لیے فرمایا۔ مینے یہ خیال کر کے کہ ابہی اور کہانا دستر خوان پر چنا جائیگا تامل کیا۔ مہتدی نے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا تم نے آج روزہ نہیں رکہا تہا! مینے عرض کیا روزہ تو تہا مہتدی نے کہا تو کیا کل روزہ رکہنے کا ارادہ نہیں ہے؟ مینے کہا رمضان کا روزہ کیونکر ترک کر سکتا ہوں۔ تو مہتدی نے کہا پیٹ بہر کے کہاؤ یہاں یہی کہانا کہایا جاتا ہے۔" یہ سنکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور بلا تکلف مینے نہایت استعجاب سے بارگاہ خلافت میں عرض کیا "خدا نے حضور کو دنیا کی تمام نعمتیں عطا کی ہیں؟ پہر بہی یہ کہانا تناول فرماتے ہیں۔ مہتدی نے جواب دیا "تم ٹہیک کہتے ہو لیکن مینے بنی ہاشم اور خاندان بنی امیہ میں موازنہ کیا تو کوئی خلیفہ بنی عباسیہ کا حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مقابلہ میں نہ آسکا۔ انہوں نے پہٹے، پرانے کپڑے پہنے خراب غذائیں کہائیں حالانکہ وہ بہت بڑے خلیفہ تہے اور حقوق سلطنت و حقوق خداوندی کی پوری حفاظت کی۔ ہاشمیوں میں بہی ان کے نظیر کی ضرورت تہی۔ سلطنت میں غور کرتا ہوں تو کسی خلیفہ میں عمر کے نظیر بننے کی صلاحیت نہیں نظر آتی۔ ناچار مینے قصد کر لیا کہ بنی ہاشمیوں میں عمر بن عبدالعزیز کیطرح میں زندگی بسر کروں گا۔"

مہتدی درویش صفت اور علم دوست تہا حضرت جلال الدین سیوطی صاحب تاریخ الخلفا نے اسے بہترین خلفا میں شمار کیا ہے۔ یہ بہی متوکل باللہ

کی طرح خلق قرآن کا قائل نہ تھا۔ اوسے یقین ہوچکا تھا کہ جن مکاشفات اور اسرار کو لا مذہب فلاسفہ اصحاب عقل کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں اون میں قطعیت نہیں۔ وہ صراط مستقیم سے بہک گئے ہیں انسانی عقل مقتضی ہے کہ وہ غلطی کرے ایک ہی امر جس کا سینکڑوں سال تک سائینٹفک اصول کے موافق صحیح ہونا تسلیم کیا جاتا ہے اور جس کی واقعیت میں کسیکو کلام نہیں ہوتا۔ صرف ایک غلطی دریافت ہوجانے کی وجہ سے غلط ہوجاتا ہے اگر انسان صراط مستقیم کا پیرو ہونا چاہتا ہے تو اوسے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور کلام اللہ کے احکام کی اتباع میں حصہ لینے کی ضرورت ہے" بہرکیف وہ معتزلی المذہب نہ تھا اوس میں صحابہ کے ایسے خیالات تھے۔ وہ ایک سچا اہل سنت والجماعت تھا اوسکی پالیسی اصحاب نبیؐ کے افعال اور اقوال سے بہت ملتی جلتی تھی۔"

جعفر بن عبد الواحد نے بیان کیا ہے کہ مینے ایک مسئلہ کے متعلق مہتدی سے عرض کیا کہ امام احمد بن حنبل کا اس مسئلہ میں یہ خیال ہے۔ اس سے میرا مقصود معتصم باللہ کے وقائع یاد دلانا تھا" مہتدی نے کہا "خدا امام احمد بن حنبل پر رحم کرے اگر اپنے آبا کی طرف سے گناہوں کی معافی مانگنا جائز اور اون کے لیے مفید ہوتا تو میں ضرور معافی مانگتا۔ پھر مجھ سے کہا سچ بات کہو اور حق بات نہ چھپاؤ انسان کا فرض ہے کہ سچی بات نہ چھپائے۔ میں خود حق پسند ہوں۔ اور حق پسند کی عزت کرتا ہوں"

مورخ نفطویہ سے کسی بنی ہاشم نے بیان کیا تھا کہ مہتدی کے پاس ایک جامہ دان تھا جسمیں ایک صوف کا جبہ اور چادر رہتے تھے جسے پہنکر وہ شب کو نماز پڑھتے تھے +

مہتدی نے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوتے ہی تمام لہو و لعب کے ذرائع

مسدود کر دیئے تھے۔ گانا سننا حرام جانکر ترک کر دیا تھا۔ ارکین اور اعوانِ خلافت کو ظلم کی سخت ممانعت تھی اہل دفاتر کو حساب و کتاب کے درست اور صاف رکھنے کی بجید تاکید تھی۔ خلیفہ خود بھی اجلاس کرتا اور دفتر سرکاری کے تمام اہلکاروں کو (جو نہایت تندہی کے ساتھ حساب کے پیچیدہ کاموں میں مصروف رہتے) اپنے سامنے بٹھاتا تھا۔ ہفتہ میں صرف جمعرات اور پیر کے دن کے سوا ہر روز خود دربار میں آتا تھا غالباً ان دنوں تعطیل عام ہوتی تھی۔

جعفر ابن محمود کو جو اپنے وقت کا مایۂ روزگار تھا، جسکی قابلیت اور تبحر کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے صرف اس بنا پر اسکو فوراً نکال دیا کہ اوس کے مذہب کی افواہیں مشہور اور زبان زد خاص و عام تہیں۔

سلطنت بغداد کی ترکی ارکین میں صالح بن وصیف ایک نہایت چالاک اور ہوشیار شخص تھا جس نے کئی ترکوں کی شراکت میں معتز کو تخت حکومت سے اُتار دینے میں حصّہ لیا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسی کی تحریک سے معتز کا عزل عمل میں آیا اور اسی صالح کے نامبارک ہاتھوں سے معتز کو جامِ شہادت پینا پڑا ہے۔

یہ بات تو آفتاب کیطرح روشن ہے کہ آپس کی خانہ جنگیاں اور باہمی سازشیں ہی سلطنت کے بربادی کا بڑا سبب ہیں خاصکر جب دو افسروں میں رقابت اور نا چاقی ہو جائے تو تمام فوج کٹ جاتی ہے اور ملک تاخت و تاراج ہو جاتے ہیں۔ رعایا بھی اپنے بادشاہ کے خون کی پیاسی ہو کر اوسکو تلوار کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اور اس ناعاقبت اندیشی میں غیر قوموں کا (جو اسی تاک میں لگی رہتی ہیں) خوب بھلا ہوتا ہے۔ صالح نے چونکہ معتز کے بارہ میں سازش کی تہی۔ جو اچھی طرح کارگر ہوئی۔ اسیوجہ سے اکثر رعایا اس سے ناخوش تہی۔ لیکن مہتدی جسکی بادشاہت کا باعث یہی صالح کہا جاسکتا ہے اسکی دلدہی کرتا رہتا تھا۔ اور اس صورت سے

رعایا کی ایک خاص جماعت معتز کی طرفدار ہوگئی جو صالح سے دشمنی رکھتی تھی لیکن مہتدی کیطرف سے اوس کے دل میں بھی کسی قسم کی کدورت نہ تھی۔ کیونکہ اس کے صالحانہ برتاؤ اور عمدہ اخلاق کی تمام رعایا گرویدہ تھی۔ اِس جماعت کا اعلیٰ افسر موسیٰ بن بغا ترکی رَے میں رہتا تھا۔ مہتدی کی خلافت کو ابھی ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ اس نے مخفی طور پر بہت سے لوگ اپنے ہم خیال پیدا کرلیے اور جب اپنی جمعیت پر پورا وثوق ہوگیا تو اپنی جرار فوج لیکر معتز کے خون کا بدلہ لینے اور اوسکی ماں کی حقیت و مالیت وصول کرنے کی غرض سے مقامِ سامرا میں وارد ہوا جو مہتدی کا پایۂ تخت تھا جسوقت یہ شہر میں داخل ہولے ہے تو عوام میں شور مچگیا اور ہر ایک آدمی صالح بن وصیف کیطرف خطاب کر کے کہتا تھا کہ اے فرعون اے !! اب تیری سرکوبی کے لیے موسیٰ آگیا ہے۔ اِس جملہ سے رعایا کے دلی جذبات اور خیالات کا اچھی طرح اظہار ہوسکتا ہے۔

موسیٰ خودغرض ہونے کے علاوہ ہوشیار اور دوراندیش بھی تھا اسے مہتدی کی خلافت سے بظاہر کچھ اختلاف نہ تھا۔ اس لیے موسیٰ بن بغا مذکور نے صالح بن وصیف کے قتل کی اجازت طلب کی۔ مہتدی نے اس ناشایستہ اور غیر مفید حرکت سے باز رکھنا چاہا۔ کیونکہ اِس سے ایک تازہ فتنہ اٹھنے اور نئی خانہ جنگی شروع ہوجانے کا یقینی احتمال تھا۔ مہتدی کے نیک طینت اور صلح جو ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن موسیٰ (جس کے سر پر غصہ اور خودغرضی کا بھوت سوار تھا) اور اوسکی پلٹن نے مہتدی کی ایک نہ سنی بلکہ اسی کو آکر گھیر لیا۔ خلیفہ اسوقت اپنے دار العدل (دربار) میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے سنے مہتدی کا ہاتھ پکڑکر اٹھایا اور ایک دُبلے پتلے گھوڑے پر سوار کر کے دار ناجود کیطرف لے اوڑا مہتدی نے کہا بھی کہ اے موسیٰ ! افسوس !! خدا سے ڈر !!! یہ آخر کس بات کا

ملعدہ کررہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں بھلائی کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ
قسم کھا لیجئے کہ صالح کے دینے میں تامل تو نہ فرمائیگا؟ مہتدی اسوقت گویا اونکی
کی جماعت میں نظربند تھا ہی بیچارے نے اپنی جان بچانے کی نیت سے مجبور ہو کر
قسم کھالی پھر یہ اپنے مکان پر پہونچا دیا گیا چند دن کے بعد موسیٰ نے صالح کو
طلب کیا کہ اوس سے علی الاعلان اسکی ناشایستہ افعال اور ناجائز کارروائی کے
بارہ میں کچھ بحث و مباحثہ کرے مگر اوس کا کچھہ پتا نہ پایا۔ ادھر مہتدی
نے رفع قضیہ کے خیال سے موسیٰ اور اوسکی جماعت کو صلح پر آمادہ کرنا چاہا تو
انہوں نے مہتدی کو یہ تہمت لگائی کہ صالح جس جگہ روپوش ہے اوس کا مہتدی
کو بخوبی علم ہے۔ اس قضیے نے بہت کچھہ طول پکڑا یہاں تک کہ ان لوگوں نے
مہتدی کو تخت خلافت سے اوتار دینے کی صلاح کر لی۔ کسی مخفی ذریعہ سے مہتدی
کو بھی یہ بات معلوم ہوگئی صبح کے وقت بلا خوف و خطر گلے میں تلوار ڈالے
ہوئے موسیٰ کے لشکر میں پہونچکر مہتدی نے نہایت رعب دار آواز میں
کہا کہ مجھے تمام خبریں پہونچگئی ہیں۔ یاد رکھو میں مستعین اور معتز وغیرہ کی طرح
نہیں ہوں۔ اسوقت غصہ کی حالت میں تم لوگوں کے پاس چلا آیا ہوں
دیکھو امیرے ہاتھہ میں یہ زرین تلوار ہے میرے ہاتھہ میں جب تک اس تلوار کا
قبضہ ہے تب تک برابر لڑتا رہوں گا۔ مگر صرف دین یا حیا یا اوس عیش کے
لیے جو بلا کلفت حاصل ہو سکے۔ اور کسی غرض سے یہ تلوار نہ اُٹھیگی۔
خلفائے وقت اور اللہ کے قانون کی خلاف ورزی پر کیوں جسارت کی
جاتی ہے۔ بخدا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ صالح کہاں ہے۔ مہتدی کی اس قسم پر
یقین کرکے دلوں کی کدورت جاتی رہی موسیٰ نے اعلان کیا کہ جو شخص صالح
کو پکڑ لائیگا ہم اوسے دس ہزار دینار انعام دیں گے۔ اس کارروائی کے

بعد مجمع منتشر ہوگیا۔ اور لوگ صالح کی جستجو میں رہنے لگے۔ مگر باوجود بیحد تلاش کے بہی عرصہ تک صالح کا سراغ نہ ملا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک غلام موسےٰ کے لشکر کا کسی دن دوپہر کو پہرتا چلتا ایک گلی کیطرف جانکلا وہاں ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آیا۔ یہ غلام بہی اوسی دروازہ میں گہس گیا۔ تہوڑی دور بڑھکر ایک تاریک دھلیز دکہائی دی یہ دہلیز میں ہوکر آگے بڑھا۔ دیکھتا کیا ہے کہ اوس کے اندر صالح بن وصیف تن تنہا بے ہوش پڑا گہری نیند کے مزے لے رہا ہے غلام نے صالح کو اچھی طرح پہچان لیا تہا۔ اس کے خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی بقول شخصے کہ ؎

"نہ اک دن کا موسیٰ سے پوچھے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے"

غرض فوراً وہاں سے واپس آکر موسیٰ نے اوسی وقت اپنی فوج سے ایک منتخب جماعت بہیجدی جس نے موقعہ پر پہونچکر دم بہر میں صالح کا کام تمام کردیا۔ اور موسیٰ کے حکم سے اوس کا سر کاٹ کر تمام شہر میں پہرایا گیا۔ مہتدی کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا مگر مصلحت وقت سے خاموش ہو رہا۔ موسیٰ نے اس کام کو انجام دیکر اپنی جمعیت کے ساتھ سن[1] کی طرف کوچ کیا۔ اسکی فوج میں باکیال اور مفلح نامی بہی دو نامور بہادر ترک موسےٰ کے بادفادوست تہے۔ اور مفلح ترکوں کا ایک ذی وجاہت امیر بہی تہا راستہ میں باکیال کو ایک خط ملا جسمیں مہتدی نے اسے لکھا تہا کہ تم موسیٰ اور مفلح کو قتل کر ڈالو یا قید کرلو اور آپ ترکی فوج پر خود مختار امیر بنجاؤ باکیال نے یہ خط موسیٰ کو دکہادیا اور کہا کہ میں اون لوگوں میں نہیں ہوں جو اپنی قوم یا اپنے سرداروں کو دغا دیکر عارضی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ خاصکر آپ پر ہاتھ اُٹھانا گویا اپنی

---

[1] دجلہ کے کنارہ پر ایک چہوٹا سا شہر واقع ہے ۱۲

تمام قوم کو ایک عظیم نقصان پہونچاتا ہے۔

پھر باتفاق یہ رائے قرار پائی کہ ابھی چلکر مہتدی کو قتل کر ڈالنا چاہیے ورنہ آیندہ اندیشہ ہے چنانچہ اوسیوقت موسیٰ اپنے ارادہ کی تکمیل کے لیے سامرا میں آگیا اور جنگ شروع ہوگئی۔

مہتدی کیطرف سے اہل مغرب، اہل فرغانہ وغیرہ نے اوسکا بڑے جوش و خروش کیساتھ مقابلہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں چار ہزار ترک ایکدن میں کام آئے۔ اور عرصہ تک اسیطرح موت کا بازار گرم رہا۔ تلواریں اپنا جوہر دکھایا کیں، دونوں طرف کے سپاہ داد جانبازی دیتے رہے آخرکار خلیفہ کے لشکر نے شکست کھائی اور بخت کے نامساعدت سے مہتدی جیسے خلیفہ کو ترکوں میں قید ہونا پڑا۔ ستم شعاروں نے اس کے دونوں انثیین اسقدر سختی کے ساتھ دلوائے جس تکلیف سے غریب اور بےتقصیر خلیفہ جانبر ہی نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ اور کوئی جنگ کسی دشمن سے مہتدی کے زمانہ میں نہیں ہوئی۔

مہتدی ایک قابل قدر اور مصلح جو خلیفہ تھا۔ کاش؟ اگر ترکی رعیت اوس کا ساتھ دیتی تو مہتدی کو بھی غیر قوموں کے مقابلہ میں ضرور کوئی کارنمایاں کرنے کا موقعہ ملتا اور وہ بھی معتصم، مامون، ہارون وغیرہ کی طرح اشاعت اسلام اور حدود سلطنت کی توسیع میں حصہ لیتا لیکن افسوس! آپس کی سازشوں نے اتنا وقت ہی نہ دیا عنان سلطنت ہاتھ میں لیے ہوئے ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ انہیں باہم خانہ جنگیوں کی بدولت ۱۵ رجب ۲۵۶ھ کو اس ہردلعزیز خلیفہ نے اپنی عزیز جان موت کے حوالہ کر دی۔

جسوقت ترک مہتدی پر ظلم و زیادتی کر رہے تھے تمام رعایا کے دلوں میں موسیٰ سے اس کے قتل کا معاوضہ لینے کا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ لوگوں نے رقعے لکھ لکھکر مسجدوں میں آویزاں کیے جنمیں مرقوم تھا کہ "اے معشر مسلمین اپنے منصف مزاج خلیفہ کے لیے (جو حضرت عمر بن عبد العزیز کے مشابہ ہے) دعا کرو کہ اللہ تعالےٰ اپنی مدد سے اوس کے دشمن کو مغلوب کرے۔ آمین"۔ مگر افسوس ہے کہ بدنصیب رعایا کی دعا مقبول نہ ہوئی"۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

(محمد حسن۔ مجوم لکھنوی)

حقیر نذر

ہماری محترم بہن بنت نذر الباقر صاحبہ کے نام سے جو ہمارے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ قدرت نے اپنے انعام میں مرد عورت کی تخصیص نہیں کی مسلمان بہت کم ایسے ہوں گے جو واقف نہوں — خاتون محترم کی لٹریری کوشش قومی خدمات پر مسنرآرٹیکل ۔ پھول کی اڈیٹری اور مسلم یونیورسٹی کے واسطے محنت شاقہ اسباب کا پتہ دے رہی ہیں کہ ہمدردی کا مادہ اور قومی ضرورتوں کا احساس صنف نازک کے دلوں میں بھی مردوں سے کم نہیں۔

یہ کتاب جو حقیر نذر کے عنوان سے پیش کی جاتی ہے گو اسکا مقصد ظاہری اپنی مظلوم بہنوں کے ساتھ ہمدردی ہے مگر منشا اصلی اس فنڈ کو تقویت دینا ہے جس سے اچھا کام جس سے بڑی ضرورت اسوقت ہمارے سامنے کوئی نہیں۔

محترمہ بنت نذر الباقر صاحبہ کی یہ کوشش تمام قوم کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہے اور ہمیں توقع نہیں یقین ہے کہ کوئی گھر اس کتاب سے خالی نہ رہیگا اور قوم دل کھولکر اس خاتون کی حوصلہ افزائی کرے گی جس نے راتوں کی میٹھی نیندیں قوم پر سے قربان کی ہیں اور یونیورسٹی کی تکمیل سے پہلے اسکا دوسرا تیسرا اڈیشن شائع ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی فنڈ کی مدد کے لیے علی العموم ہر ممبر قوم نے اپنی بساط بھر جو کچھ بھی اس سے ہوسکا کیا۔ اور یہ کسی پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض اسلامی و قومی ادا کیا۔ چونکہ میں یونیورسٹی فنڈ میں کچھ نہ دے سکی۔ اس فکر میں تھی کہ

میں بھی کچھ کروں۔ چنانچہ ایک مختصر سی کتاب جسمیں سچے واقعات بہ تبدیل نام و مقامات لکھے ہیں چھپنے کو دیدی جسکا کل منافع بعد وضع کرنے اخراجات طبع کے یونیورسٹی فنڈ کی نذر رہے۔ گو کہ مجھ میں اسقدر قابلیت نہیں کہ ایک ایسی کتاب لکھنے کی جسارت کروں کہ جسمیں مردوں کی درستی اخلاق پر قلم اٹھایا ہو۔ اور نہ میری علمی حیثیت اسقدر کہ پبلک میں کوئی کتاب لکھکر پیش کروں۔ لیکن یونیورسٹی فنڈ کے خیال نے مجھے ایسا بیچین کیا۔ کہ سچے واقعات قصّے کے پیرایے میں لکھ لیے۔ ان بیس مظلوم مسلمان مستورات ہند کی قابل رحم حالت سے کون واقف نہیں ہے۔ بے ضرورت شرعی کثرت ازدواج کے رواج سے اس بیکس فرقۂ نسواں پر جسقدر ظلم ہو رہا ہے۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔

پس انہیں حالات کی سچی تصویر یہ چھوٹی سی کہانی ہے۔ اور میں بھی بخوبی جانتی ہوں۔ کہ اسپر نکتہ چینیاں صرف مردوں ہی کی طرف سے نہ ہونگی۔ بلکہ چند قلیل مقتدر اور با اثر خواتین کیطرف سے بھی اس کے ہر پہلو پر کیا بہ لحاظ زبان و پلاٹ و کیا بہ لحاظ ربط وغیرہ سینکڑوں اعتراض ہونگے لیکن نہ مجھے خوف اعتراضات کا اور نہ مجھے پرواہ اختلافات کی۔ میں نے محض فنڈ کے لیے یہ کہانی چھپوائی ہے۔ اور اب دیکھتی ہوں کہ مددگاران فنڈ اس کی کہاں تک قدر کرتے ہیں۔ اور کس قدر بے شمار خریداری کی درخواستیں میرے پاس بھیجتی ہیں۔ گو اس چھوٹی سی کتاب سے فنڈ کو کچھ بڑی مدد نہیں مل سکتی۔ لیکن ہمدردان قوم کی امداد سے کچھ ہو ہی جائیگا۔ اور ایک میرا یہی خیال ہے۔ کہ شاید میرا خلوص میری مغفرت کے کام آئے چونکہ کتاب ابھی زیر طبع ہے قیمت کا حال

معلوم نہیں۔ لیکن میرے خیال میں ۲ آنے سے کسی طرح زیادہ نہ ہوگی۔ اب یہ ہمدردان قوم کے ہاتھ ہے۔ کہ کسقدر روپیہ اس ذریعے سے فنڈ کو دیں اور یہ کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ پڑھنے کو کتاب اور مفت کرم داشتن سے یونیورسٹی فنڈ کی امداد۔

نیز یہ بھی ملتمس ہوں۔ کہ تمام اسلامی اخبارات و رسالہ جات بھی ان چند سطور کو بغرض ہمدردی فنڈ شائع کر کے مشکور فرماویں۔

خاکسار

بنت نذر الباقر۔ از کوہاٹ

شمس العلماء پروفیسر میرزا موسیٰ کوثر صاحب شیرازی کا کلام ناظرین تمدن پچھلے پرچوں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں میرزائے موصوف گجرات کالج احمد آباد میں عرصہ تک فارسی کے پروفیسر رہے۔ آپ کا کلامِ اردو باوجود ایرانی ہونے کے اسقدر صاف اور ستھرا ہے کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ صاحب موصوف کی انگریزی قابلیت بھی قابلِ داد ہے امید ہے کہ ناظرین تمدن شمس العلماء کی تصویر جو زیبِ ورق اول ہے دلچسپی سے ملاحظہ فرمائیں گے +

ترانۂ بہار

(از محمد عبدالواحد صاحب نائطی)

خوب پڑی گل خوش رنگ سے دامانِ بہار اللہ اللہ! یہ جوبن! یہ عجب شانِ بہار!!!
ترک توبہ کرتے ہی گھنگھور گھٹائیں چھائیں تیری توبہ ہی ہوئی سلسلہ جنبانِ بہار
رنگ گلشن خوب ہوا ایک بھی قطرہ نہ بچے ابر آ کر کے سناتا ہے یہ فرمانِ بہار
ارغوان کا کچھ عجب دلکش و دلچسپ سین کہ پرے باندھ کے نکلے ہیں حسینانِ بہار
[illegible] تماشے ہیں کہیں ریس کہیں بال کہیں جشن قابلِ دید ہیں لندن کے یہ سامانِ بہار
[illegible] معشوق سے قائم ہے وجودِ عشرت سچ تو یہ ہے کہ یہی دونوں ہیں بس جانِ بہار
[illegible] کہتے ہیں بتقلید شکست توبہ ہم نے بھی توڑ دیا اپنا وہ پیمانِ بہار
بلبلیں چیخ کے کرتی ہیں قفس میں فریاد دل کے دل ہی میں رہے ہائے یہ ارمانِ بہار
[illegible] ایسی بیابان کی ہوا بھائی ہے دلِ وحشی کبھی ہوتا نہیں خواہانِ بہار
[illegible] انجامِ خزاں ہے تو نظر میں اپنی دشت و جنگل سے بھی بدتر ہے گلستانِ بہار
[illegible] سامانِ چمن کیسے پڑے ہیں ویراں؟ آج خاموش ہیں کیوں زمزمہ سنجانِ بہار
[illegible] ہیں مسکن بوم - آہ - وہ سارے گلشن کل جہاں گاتے تھے نغمہ سرایانِ بہار
[illegible] مضمون کو تراشے جو تخیل کا قلم بنت نئی اور کہلائے گل عنوانِ بہار

میرے اشعار کو ذرا حد ہے اونہیں کیا نسبت
گرچہ ہیں اور عنادل بھی غزل خوانِ بہار

(نائطی)

شرع کا خون

موت برحق اور یوم الانصاف عقیدۂ ایمان مگر یہ زمین اور آسمان جو آنکھ کے روبرو ہے اسکا خالق شاہد ہے اِس امر کا کہ طارق کا یہ عذر ہماری سمجھ میں مطلق نہیں آیا کہ وہ بدنصیب بیٹی شبانہ کے معاملہ میں بیوی کی وجہ سے مجبور ہوگیا نفس الامر یہ ہے کہ مادۂ خود پرستی سرشت میں موجود تھا صحبت نااہلاں وجہ ہوئی اِس جوہر کو جلا کی اور سہل انگاری و تن پروری کا کھوٹ سونے پر سہاگہ۔ من حیث المجموع یہ تمام عیوب شخصی و نقائص بشری انسان کو جانور میل کو بیل اور بچھڑے کو سانڈ بنا دینے کیواسطے بدرجۂ اتم کافی تھے۔ تن پروری کا یقینی نتیجہ بے انصافی تھی جو سبب ہوئی اتلاف حقوق کا۔

باایںہمہ یہ اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہوگی کہ اگر تقدیر کوئی شے ہے تو والی سردارپور کا اکلوتا بیٹا طارق تقدیر کا پورا ہیٹا نکلا جس بیٹے کے مقابلہ میں علی رؤس الاشہاد آنکھوں پہ پٹی باندھ کر بیٹی کو شفقت پدری سے محروم کیا وہ کمبخت بھی اپنا نہ ہوا اور جس خاندان میں شادی بیاہ تک کے موقعوں پر میراثنوں کو بھی آنیکا حکم نہ تھا اسی خاندان میں بحیثیت رئیس البیت باپ کے جیتے جی دھڑلے سے رنڈیاں نچادیں۔

طارق کو بیگناہ مان لینے میں ہم متامل نہوتے اور خود ہمارا ایمان ہمکو یہ اجازت نہ دیتا کہ ہم آج پچاس برس بعد اِس مرحوم کی ہڈیاں اکھاڑیں مگر ہماری تلاش کا ہر نتیجہ اور اسکی عمر کا ہر واقعہ اس کے جرم کو اور

سنگین کر رہا ہے۔ سو پچاس نہیں تو وہ چار اور غیر نہیں اس کے اپنے اسی سرزا رپور میں آج بھی ایسے لوگ ڈھونڈھے سے نکل آئیں گے جو مدتوں اس کے پاس اور برسوں اس کے ساتھ رہے۔ مگر افسوس ہمیں انہیں سے ایک بھی ایسا نہ ملا جو علی الاعلان نہیں تو کنایتہً اور کھلم کھلا نہیں تو اشارۃً ہی طارق کو شبانہ کا رحیم باپ بیان کر دیتا۔

ہمدم و ہمراز رفیق و دمساز سب کا بیان غلط سہی مگر خود اس کے اپنے ہاتھ کی تحریریں بآواز بلند پکار رہی ہیں کہ وہ اس انجمن کا سرگرم ممبر تھا جسکی تلقین الرّجال قوامون علی النساء کے معنے مردوں کو ہر اعتبار سے عورتوں پر افضل ثابت کرتا تھی یہی تھی وہ انجمن جس نے مظلوم فرقہ اناث کے واسطے غلامی کا بیج بویا۔ بیویوں کو لونڈیاں بیٹیوں کو تیرا اور بہنوں کو خارج از ترکۂ پدری بنا گئی۔

مسلمان وہ بھی تھا اور ہم بھی ہیں اسکی ہمیں خبر نہیں مگر ہماری آنکھ کے سامنے ہے وہ سماں کہ ایک منصف حقیقی تخت عدالت پر ہے۔ بدنصیب عورتوں کی شکایت اس کے حضور میں ہے اور مجروح دلوں کے نالے عرش کے کنگورے ہلا رہے ہیں +

اس یقین پر بھی کہ محض کلام ربانی کے مفہوم میں غلط فہمی سے طارق خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق ہو گیا۔ قیاس کام نہیں کرتا کہ اس نازک وقت میں جب ولی، نبی، فاضل و عالم سب سرنگوں ہوں گے طارق کے پاس ان مظالم کا کیا جواب ہوگا۔

طارق اور شبانہ دونوں مر چکے انکی ہڈیاں گلکر خاک ہو گئیں اور قبروں کے نشان تک نہ رہے مگر چشم بینا مظلوم شبانہ کی داد دیکر قیامت تک

سنگدل باپ پر لعنت برسائیگی اور اسکی زندگی کا ہر ورق غاصبان حقوق نسواں کے واسطے ایک سبق ہوگا۔

(۱)

زمین کا شرقی حصہ اپنی دنیا کے رخ سے رات کا برقع اتار رہا تھا موذن اذان دے چکے تھے اور طائران خوش الحان صبح کا پیغام لا رہے تھے گو کائنات کے ہر ذرہ پر رونق برس رہی تھی۔ مگر افسردہ صورت تھی تو ایک چالیس روز کی زچہ جو گود میں بچہ لیے اس کے چہرہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ ماتا کا جوش ولیں لہریں لیتا تو نشۂ محبت میں جھک کر پیار کر لیتی مگر بیٹی ہونے کا خیال کچھ ایسا ملال تھا جو افسردگی و اضمحلال کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا میاں کی خفگی دیورانی کے بول ساس نندوں کا عتاب۔ ایک بخار تھا کہ چڑھا چلا آتا تھا۔

باعتبار تموّل و اقتدار طارق کی بیوی شبانہ کی ماں فرزانہ والی سردار پور کی بہو رئیس انتصار آباد کی چھوٹی بیٹی۔ چوٹی کی رئیس زادیوں میں تھی جسکی سخاوت کے آگے ریاست کے تمام امیر کان پکڑتے تھے۔ لاریب وہ اس قابل تھی کہ سردار پور جسقدر ناز کرے کم ہے۔ من بھر روز کا لنگر بلاناغہ تقسیم کرتی وضع کی اتنی پوری کہ رنڈاپے کے پانچ ساڑھے پانچ سال۔ سماں بھی ہوا اور کال بھی ساس کی دھلیز پر۔ بھرا پُرا میکا ہوتے ساتھی جہیز کے جوڑے اور برتن کوڑیوں کے مول بیچکر مرتے دم تک اسی شان سے گذار گئی۔ دلکی اتنی اچھی کہ جس روز سے ہوش سنبھالا اسوقت سے تا دم سکرات کھلا کر کھایا اور پہنا کر پہنا۔ توقع کی ایسی سچی کہ بیکس اور اپاہج یتیم اور مظلوم اس وقت بھی جب فرزانہ بگڑ چکی تھی اس کے در سے محروم نہ گئے۔

باوجود اس علم و یقین کے کہ فرزانہ کی طبیعت انسانیت کے ان جواہروں سے

ماما مالی نے کونسا خدا کا بندہ عقل کا ایسا اندھا ہوگا جو یہ مان لیگا کہ ذرا نہ جو
اسوقت شبانہ کو گود میں لیئے بیٹھی تھی بیٹی کی پیدائش سے اس لیئے
مغموم نہیں کہ شائیوں ہوا اسکا بس چلتا تو وہ شبانہ کو چوم چاٹ کر سر
آنکھوں پر رکھتی اور اس ایک بیٹی کو سات بیٹوں پر سے قربان کر دیتی
شبانہ ان ہی خیالات میں غلطاں او رہی قسم کے تفکرات میں پیچاں تہی کہ
ماما باہر سے خط لائی کہولا تو یہ تہا -
بیگم چھٹی سے چلتے تک مھارے رحمن جہر سے زیادہ خط اور پیچ
ھگتنا تو خدا اگر کوئی پھوڑا دیدیتا ہے تو اسکو بھی پڑتا ہی ہے مگر اس کے
معنی نہیں کہ انسان تکلیف وشکایت زبان ہی پر نہ لاسکے لڑکی ہوئی تو
تمہیں مبارک اور بہاگوان ہوئی تو ناناتانی کو نصیب میرا تو دور ہی سے سلام ہے
خوشی ہوئی تو انتصار آباد جاؤ شادیانے بجواؤ اور نوبت نقارے رکھو مگر
یہ یاد رکھنا کہ انتصار آباد والوں میں تو چار بیٹوں کی بیٹی ہے مگر گر اسپ ہی
ہے کی لیکن سردارپور کی ریاست کے یہ پانچویں پشت ہے کہ کسی بیٹی کو تنکا
تک نہ ملا ہے
میری رائے میں چونکہ لڑکی کی ولادت ایک ناگہانی مصیبت ہے اور سو
بچے دل کا ایک جھگڑا صرف عورت کی ذات اس لیے میری دلی آرزو ہے
کہ گو شبانہ کی پیدائش نے تمام آرزوؤں پر پانی پھیر دیا پھر بھی میں اسکو غنیمت
سمجھونگا کہ خدا اسکا پردہ دنیا تک سے -

(۲)

فرزانہ - ارے بے! دیکھنا تم کیسے بھر منہ کوستے ہو نگوڑی چار برس کی پلی پلائی
بچی پورے کا پورا چاروں طرف بنا کی طرح باتیں ملکاتی پھرتی ہے

نوچ مرے،

طارق - تم گھر کی بیٹھی والی عورت ہیں کیا معلوم یہ فتنی کیا کیا غضب ڈہائیگی میں تو بہگت چکا ہوں - آپا جان کو ترکہ سے محروم کرنا میری ہی ہمت تھی ورنہ وہ تو تہائی ریاست ٹہوا ہی چکی تہیں تہیں کیا معلوم نہیں عدالت ابتدائی نے تو شرع کے موافق ڈگری کر ہی دی تہی وہ تو خدا مفتی صاحب کا بھلا کرے اگر وہ رواج کے مطابق فتوی نہ دیتے تو دریا پار کے آٹھوں موضع شرع کی روسے ہاتھ سے نکل ہی چکے تھے -

فرزانہ - توبہ توبہ شرع کو تو اس طرح سے نہ کہو -

طارق - توبہ کی کیا بات ہے میں اگر قرآن کے کسی فیصلہ کو (نعوذ باللہ) نامناسب سمجھتا ہوں تو صرف لڑکیوں کے ورثہ کو انکا وجود ہی غیرت وحمیت کا خاتمہ کر دیتا ہے اسپر طرہ یہ کہ گالیاں کھاؤ اور سپاہیاں دو۔

فرزانہ - خدا کے لیے تم میرے سامنے تو کلام اللہ کو اس طرح کہکر مجھے گنہگار نہ کرو - میں یہاں سے اٹھ جاتی ہوں -

طارق - لو بیوی تاویز دیکھتی جاؤ - دریا پور کے نصف حصہ میں سے چار آنے میں تم اور خالہ باقی اکیس سالم مواضعات خدامیاں کاظم کو نصیب کرے

(۴)

برسات اور جہاڑے دنیا میں آتی اور جاتی ہیں سردار پور ایسی انوکھی بستی نہ تہی کہ ایک دن اور رات جہڑی نے تھمنے کا نام ہی نہ لیا - بارش کی اس کثرت کا نتیجہ بخار کی شدت تہ ظاہر تھی اس زور سے چمکا کہ گھر کے گھر پڑ گئے یہانتک بھی غنیمت تہا جو پڑا لوٹ پیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا - مگر اکتوبر کا شروع ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے موت کی آوازیں آنے لگیں کیسے کیسے کڑیل جوان دیکھتے دیکھتے دکھانے کے لائق

دو دو تین تین گھنٹوں میں چٹ پٹ ہوگئے ایک کہرام تھا کہ ریاست میں مچا ہوا تھا۔ یتیموں کے بین رانڈوں کے بیان ماباپوں کے نالے سینے کلیجے دہلاتے تھے کیسا قیامت خیز وقت تھا کہ لوگ بھرا گھر چھوڑ چھاڑ جنگلوں میں جا پڑے بھاڑ تھا کہ بھن رہا تھا۔ ایک پندرہ ہی دن میں بیسیوں گھر تاراج اور سیکڑوں آدمی خانماں برباد ہوگئے۔ بخار کیا قہر خدا تھا کہ ٹوٹ رہا تھا۔ ایک ایک دن میں ایک ایک گھر سے تابڑ توڑ تین تین اور چار چار میتیں نکل گئیں وسط اکتوبر میں جا کر وہ زور کم ہوا تو ذرا دل ٹھکانے ہوئے سترہ تاریخ کا ذکر ہے۔ طارق اور کاظم دونوں باپ بیٹوں نے خاصی اچھی طرح نہاری لی انڈے کھائے باتیں کیں ناشتہ سے فارغ ہونا تھا کہ طارق کے ہاتھ پاؤں ٹوٹنے لگے حرارت ہوئی بخار چڑھا اور اس غضب کا چڑھا کہ دوپہر سے پہلے پہلے طارق لوتھ پوتھ تھا۔ دل تو پہلے ہی ہوا ہو رہے تھے طارق کے پڑتے ہی سب کے چھکے چھوٹ گئے۔ ڈاکٹر حکیم تو ہیں۔ یہ۔ وہ۔ تمام سرا پورا امنڈ پڑا۔ جو جو کچھ جس جس سے ہوسکا اپنی کرنی میں کسر نہ کی مگر بخار ہی نے جنبش نہ کی تین دن اور تین رات اسی افراتفری میں گذر گئے زندگی کی امید تو پہلے ہی دن ختم ہوچکی تھی مگر ہاں سانس کے ساتھ تھوڑی سی آس باقی تھی۔ چوتھے روز حالت اور بھی خراب ہوگئی زبان بند آنکھیں پھٹی کی پھٹی۔ رونا پیٹنا مچ گیا۔ دو دن اور ڈیڑھ رات یوں ہی گذرے۔

فرزانہ کے خدمت گذار ہونے میں کلام نہیں مگر بدنصیب چار دن اور چار رات بیٹھے بیٹھے ختم ہوگئی۔ پلک سے پلک جھپکانی حرام تھی۔ دہاڑوں رو رہی تھی۔ پانچویں روز پٹاری پر سر رکھ کر لیٹی تھی کہ زنانے کا بخار آدھمکا۔ آدھی رات کا وقت ہوگا کہ طارق نے آنکھ کھولی دیکھتا کیا ہے کہ شبانہ

قدموں سے آنکھیں مل رہی ہے۔ یہ ننھی سی معصوم جان جس نے ابھی مشکل سے اپنی عمر کی آٹھ منزلیں طے کی ہونگی اچھی طرح جانتی تھی کہ باپ میری صورت سے بیزار اور بھائی کا عاشق زار ہے مگر اس محبت سے مجبور ہو کر جو فطرت نے اسکی طینت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی وہ دیوانہ وار باپ کی صورت دیکھ دیکھ کر بیقرار ہو رہی تھی اس کے ہاتھ اوٹھا کر اپنے منہ سے ملتی اس کے منہ پر منہ رکھتی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال بھینچ بھینچکر چمٹتی اور لپٹ لپٹ کر روتی۔ گویا باپ نے اسے کبھی منہ نہ لگایا بلکہ سنگدل اس کی جان کا سدا دشمن رہا۔ مگر وہ ہمیشہ باپ کے نام کی دیوانی رہی دور سے اس کا منہ دیکھتی اور نہال نہال ہوتی۔ گود میں بیٹھنا کبھی نصیب نہوا لیکن وہ گھر میں گھسا اور اوسکی جان میں جان آئی۔

طارق نے آنکھ کھولکر جسوقت پانی مانگا ہے اور شعبانہ بیتابانہ پانی کو لپکی ہے کائنات کی ہر شے آدھی رات کے وقت اسکو دعائیں دے رہی تھی۔

طارق پانی پیکر سو گیا۔ کاظم اپنے دوستوں کی صحبت میں مزے کر رہا تھا۔ شعبانہ باپ کا سر دبا رہی تھی اور آنکھ سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔

گنتی پوری کرنے کو تو کوڑی بھر سے زیادہ آدمی موجود تھے مگر غرضمند تھے۔ دردمند کوئی نہ تھا۔ فرزانہ کے پڑتے ہی سب ڈھیر ہو گئے ماما ئیں اصیلیں۔ چھوکریاں۔ مغلانیاں کھانے اور غرانے والیاں تھیں۔ ہاں ایک اس بڑھیا کے کلیجہ کو تو ضرور لگ رہی تھی جس نے طارق اور طارق کے باپ دونوکو دودہ پلایا۔ مگر پانچ اوپر سو برس کی عورت آنکھوں سے اندھی کانوں سے بہری۔ چلنے کی وہ نہیں پھرنے کی وہ نہیں خدمت اور تیمارداری تو الگ رہی یہ عالیشان محل سرا اور ایک ٹڈروں ٹوں شعبانہ بیمار

باپ کے سرہانے بیٹھی حسرت و یاس سے اسکی صورت دیکھ رہی تھی اور معصوم دل اندر سے صدا دے رہا تھا کہ شبانہ باپ چند لمحہ کا مہمان ہے۔ جو صورت دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی وہ اب ہمیشہ کو چھوٹی قریب آگیا وہ وقت کہ جس باپ کو دیکھ کر چلوؤں خون بڑھتا تھا وہ پیوند زمین ہو جائے" داغ پدری کا خیال اور مفارقت ابدی کا کھٹکا ایک کاری تیر تھا جو ننھے سے دل پر جا کر لگا اور شبانہ بے اختیار چیخ مار کر باپ سے لپٹ گئی

"اے اللہ میرے ابا جان کو اچھا کر دے"

شبانہ کے چیخ مارتے ہی طارق نے آنکھ کھولی مظلوم اور معصوم بچی کے ننھے ننھے ہاتھ باپ کے گلے میں پڑے ہوئے تھے منہ اس کے منہ پر تھا اور سنگدل باپ کی ڈاڑھی بیٹی کے آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی وہ پژمردہ دل جسکی تمام آرزوئیں چند لمحہ پہلے بجھ گئی تھیں جس پھول کی تمام پنکھڑیاں مرجھا چکی تھیں۔ باپ کے ہوشیار ہوتے ہی باغ باغ ہو گیا۔ اسوقت شبانہ فرط محبت میں ایسی بیقرار ہوئی کہ اس نے باپ کے منہ کو بیساختہ بوسہ دیا۔ اور عاجزی سے کہنے لگی

ابا جان کیسا جی ہے؟ پانی لاؤں؟

طارق کا بخار اتر چکا تھا اور گو طبیعت ضعف و نقاہت سے نڈھال ضرور تھی مگر تکلیف کو سکون تھا۔ چار بج رہے تھے شمع کی روشنی جھلملا رہی تھی اور شبانہ کی وہ آنکھیں جو پانچ روز سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں باپ کے چہرہ پر اسکی نگاہ سے شفقت پدری کی متوقع تھیں مگر افسوس بدنصیب بچی کی محبت کا بدلا نفرت نکلا اور جس آنکھ سے شفقت کی امید تھی اس سے غصہ ٹپکنے لگا۔ طارق کو اسوقت شبانہ کی صورت زہر معلوم ہوئی اور اس سوال کا

جواب یہ ملا +

ہاں پانی پیئوں گا مگر اپنی اماں کو جگا دے وہ پلائیگی۔

شعبانہ۔ انکو بھی بخار ہو گیا میں ابھی لاتی ہوں۔

طارق۔ نہیں! اان ہی کو جگادے۔ یا کاظم کو بلوالے۔

شعبانہ۔ بھائی جان تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔

طارق۔ بس تو اپنی ما کو جگا۔

بہ ظاہر فرزانہ کا بخار طارق سے زیادہ اور تکلیف اِس سے کم نہ تھی بیمار تھے تو دونوں اور لاچار تھے تو دونوں۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ مرد تھا یہ عورت طارق اگر دنوں کا بیمار اور چند لمحہ کا ہشیار تھا تو فرزانہ کئی راتوں کی جاگی اور کئی گھنٹوں کی بیمار۔ طارق کو اگر پانچ روز تک بخار کی تکلیف اور درد کے کرب سے دم بھر آرام نہ ملا تو فرزانہ کو بھی پانچ روز اور چھ رات روٹی کا بھورہ تک حرام تھا۔ وہ سینہ میں شور بہ شور تھا تو یہ بھی کچھ کم زور نہ تھی فرق بیّن یہ تھا کہ اسکا بخار اُتر چکا تھا اسکو بخار چڑھا ہوا اس پر طرہ طارق ماشاء اللہ پورا جوان چیر و چار بگھار و پانچ۔ فرزانہ غریب دھان پان عمر بھر کی روگی بارہ مہینہ کی بیمار۔ جسکو گرمی دانہ بھی موت کا بہانہ تھا۔ وہ گھر کا رئیس تھا تو یہ بھی کچھ گری پڑی نہ تھی۔ مانا کہ سردار پور میں طارق کا راج تھا مگر فرزانہ بھی وہ عورت تھی جو سردار پور والوں کی لاج رکھہ گئی۔ ایسی حالت میں طارق کا یہ حکم کہ فرزانہ اٹھکر پانی پلائے اور شعبانہ پاس سے اُٹھ جائے سراسر بیجا تھا۔ مگر خدا کی مار ہندوستان کے اس طرز معاشرت پر جس نے عورت کو لونڈی اور ماما سے بدتر بنا دیا بیمار بیمار۔ دونوں ایک، جیسا انسان وہ ویسی انسان یہ المختصر شعبانہ الگ جا بیٹھی مگر دل کے ٹکڑے اُڑ گئے فرزانہ گرتی پڑتی

اٹھی. پانی پلایا. دس بجے طارق کی حالت بدلی. اچھی طرح باتیں کر رہا تھا کہ اُچھو ہوا! آنکھیں اور منہ کھلے کا کھلا رہا اور روح عالم بالا کو سدہاری بچہ ہو یا بڈھا کوڑے کا ڈھیر کوئی نہیں ہوتا۔ موت امیر اور غریب سب کی یکساں۔ مگر چند روز بعد کچھ نہیں بیوی بچے تھے یا بھائی بہن اور کہرام ہوا یا بین لیکن سال ہی بھر کے اندر اندر طارق کی یاد بھول بسر گئی دنوں کو جاتے دیر نہیں لگتی آنکھ بند کرتے چھ برس گذر گئے اور جو شعبانہ کل کیڑا تھی آج ماشاء اللہ پوری عورت ہو گئی امارت کی شہرت ریاست کا چرچا اور سب سے بڑھکر شعبانہ کی اپنی شکل صورت ایک دو نہیں پانچ پیغام اُن تعلقوں سے آئے جو سردار پور کی پوری ٹکر کے تھے اور کچھ شک نہیں کہ اگر اُنمیں سے ایک ہی منظور ہوتا تو شعبانہ عمر بھر راج کرتی۔ مگر خدا سمجھے اس باپ سے جو بیٹی کے حق میں یہ کانٹے بو گیا کہ وصیت نامہ میں بیٹی کا نکاح اس خالہ زاد بھائی سے تجویز کیا جو دو دو دانوں کو محتاج تھا کنبے کو تو جو چاہے کہو مگر علت غائی بیٹی کا سر کچلنا اور بہن کو زندگی بھر بھائی کا دست نگر کہنا تھا۔ مردے کو بُرا کہنا گناہ ضرور ہے مگر خدا معاف کرے کہ نیت پاک ہے۔

وہ خوب سمجھتا تھا کہ کہیں اور ہوئی تو یہ احمد خانی شورہ پشت کوڑی کوڑی کو گھولیں گے اور بنے بنائے تعلقہ کی تکا بوٹی ہو جائے گی۔ اس بیچارے کو روٹی تو نصیب ہے ہی نہیں عدالت کرے گا تو کس برتے پر باپ کی یہ تجویز کاظم کے واسطے اونگتے کو ٹھیلتے کا بہانہ تھا۔ بتیرا ہی سب نے سر پٹکا۔ ماں تک نے ہاتھ جوڑے مگر اسی سنگدل کے کان پر جوں نہ چلی آخر کس باپ کا بیٹا تھا۔ بائیس ہزار روپیہ کے مالگذار نے بہن کے نکاح کا بار اسطرح اوا کیا کہ تمام دنیا سے تھڑی تھڑی کی کمبخت فقیر بھی

بیٹی کا مال رکھ لیتے ہیں۔ مگر اس بے ایمان نے حقیقی ماجائی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینک دیا۔ فرزانہ کی مامتا ضرور تھی ہر چند تڑپڑا ئی اور پٹپٹائی مگر بیٹے نے ایسا شکنجہ میں کسا کہ تل بھر نہ اکسنے دیا۔ اور دن دہاڑے شعبانہ بھائی کی دہلیز اور ما کے آغوش سے اسطرح رخصت ہوئی کہ خدا دشمن کی بیٹی کو نصیب نہ کرے۔

شعبانہ کا شوہر علی گوہر بد مزاج یا فسادی تو نہ تہا مگر اول درجہ کا کاہل اور پرلے سرے کا عہدی۔ سو رہنا اور کہا لینا یہ دو کام تہے۔ وہی گذارے کا بیس پچیس روپیہ مہینہ آنا اور تیس دن پورے ہو جانے۔

سنا تو یہ تہا کہ اولاد دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے مگر دیکھا یہ کہ اس سے بڑھکر دنیا میں کوئی مصیبت نہیں۔ شعبانہ کے بچے کوڑہ میں کہاج تہے ہر سویں دن کا جو نمبر لگا اور اوپر تلے گد بد ہونے شروع ہوئے تو پورے پانچ ہوتے اور غضب یہ سب بچے اور ایک نہ مرا۔ پانچ بچے دو میاں بیوی ایک بڑھیا ساس ایک اندہے سسر نو بندے اور پچیس روپے۔ پانچ سات برس تو شتم پشتم گذر ہوئی مگر ۵۷ء کے بعد من بہر کے گیہوں بارہ سیر اور ڈیڑہ سیر کا گہی تین پاؤ رہ گیا تو اب شعبانہ کی زبان پر اللہ ہی اللہ تھا۔

فرزانہ کی زندگی تک پہر غنیمت تہا کہ وہ ان حالوں میں بھی بیٹی کے ساتھ لگی لپٹی رہتی۔ ہاتھ سے۔ پاؤں سے روپیہ سے پیسہ سے جسطرح بھی ہوتا اُس سے سلوک کرتی اسکی سوت سے وہ رہا سہا سہارا بھی گیا گذرا ہوا۔ مگر صد آفرین اس غیرت والی بچی کو دنیا بھر کی مصیبتیں اٹھائیں۔ غیروں کے احسان گوارا کیئے مگر بھائی بھاوج کے آگے ہاتھ نہ پہیلایا اور شاباش ہے اُس بے غیرت

اور ظالم بھائی کو کہ جس بہن کے ایک نہ دو اکٹھے گیارہ اور سالم موضع حات
ہضم کر گئے اس کے پھلوا سے بچے آدھی آدھی کو محتاج رہے اور دل
نہ پسیجا کمبخت اپنے کانوں سے سنتا کہ مری ہوئی ماں کی یادگار شبانہ اور
اس کے بچے دو دو دانوں کو ترس رہے ہیں اور آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا اپنی
آنکھ سے دیکھتا کہ یہ مظلوم بہن اور معصوم بھانجے بھانجیاں فقیرانہ زندگی
بسر کر رہے ہیں اور کان پر جوں نہ چلتی۔ سنوں کھانا اور تھانوں کپڑا تقسیم
ہوتا مگر بہن کی تقدیر کا ایک دانہ یا ایک چیتھڑا حرام کیسی قابل نفرین
زندگی تھی اس بھائی کی جس کے ہاتھوں ایک سال میں پچیس ہزار روپیہ
نقد اپنی آسائش میں صرف ہو۔ اور بہن بھانجیوں کے سر پر ثابت
اوڑھنی تک نہ ہو،

انگریزی کی یہ مثل کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی شبانہ کے معاملہ میں
اصل ہو گئی شوہر لاکھ اصدی اور کاہل تھا مگر پیسہ نہیں دھیلا اور دھیلا
نہیں دمڑی۔ سوکھی روکھی۔ تازی۔ باسی۔ موٹا جھوٹا کچھ نہ کچھ تو لاتا ہی تھا
بدنصیب کی تقدیر نے وہ بھی نہ رکھا اور علی گوہر خاصا اچھا بھلا چنگا۔
تین دن کے بخار میں چٹ پٹ ہو گیا۔

افلاس کو ڈیرے ڈالے تو مدتیں ہو چکی تھیں۔ میاں کی موت نے
بے والی وارث کر کے شبانہ کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ کوئی جھوٹی سچی غمخواری
ہی کر لیتا جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں ہوتیں ڈھنڈھار گھر ہوتا وہ ہوتی ننھے
ننھے بچے ہوتے اور فاقوں پر فاقہ ہوتا۔

شبانہ اسوقت انقلاب زمانہ کی پوری تصویر تھی خدا کی شان جس کے دروازہ
کے در سے سیکڑوں رانڈیں پلیں اور یتیم بڑھے اُس کے اپنے

تو اسے چلنے کے جاڑوں میں سوں سوں کرتے پھرتے اور رات کو پھٹی ہوئی دری اور پیر پولیں لپٹ کر پڑ رہتے۔

متواتر تین سال اسطرح گذرے کہ شبانہ اور اس کے بچوں کو پیٹ بھر کر ٹکڑا نصیب ہوا۔ نہ ڈھنگ کا چیتھڑا راتیں بیسیوں ایسی بیت گئیں کہ شبانہ نے اپنے بھوکے بچوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔ اور دن سیکڑوں اسطرح گذر گئے کہ بن باپ کے بچوں نے حقیقی ماموں کے پڑوس میں ایک دیوار بیچ مٹھی مٹھی چنوں پر شام کر دی۔

آخر وہ وقت آگیا کہ ضرورت نے شبانہ کی آن تڑوا دی یہ وہ دن تھا جب شبانہ تین وقت کے فاقہ زدہ بچوں کی واویلا کی تاب نہ لا سکی اور حقیقی بھائی سے یہ التجا کی کہ "بیرن ان بے باپ کے بچوں کو جنکا خدا کے سوا کوئی وارث نہیں اپنے رحم سے جلا دے"

مگر بھائی کے اس جواب نے کہ شبانہ "ابھی تو نے نالش نہیں کی" بہن کی تمام توقعات پر پانی پھیر دیا اسنے بصد حسرت و یاس بھائی کے چہرہ پر وہ نظر ڈالی جس سے عاجزی اور مجبوری ٹپک رہی تھی۔ بھوک سے کلیجہ کھسیج رہا تھا اور کلیجے کے ٹکڑوں کی بھوک۔ انکا بلکنا اور رونا کلیجے کے ٹکڑے اڑا رہا تھا۔ اتنا کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں رانڈ دکھیاری کس برتے پر نالش کروں گی لُٹے ماں جائے معصوم بچوں پر آج تیسرا فاقہ ہے اور انکی ممتا تیرے در پر کھینچ لائی تھی۔ چلی تو آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور گھر پہنچی تو پہلونٹی کا دس برس کا پلا پلایا بچہ ہیضہ میں مبتلا تھا۔

کیسا دردانگیز سماں تھا رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی چراغ ٹمٹما رہا تھا اور وہ شبانہ جسکو ادھی کی کوڑیاں دوائی تک کو نصیب نہ تھیں

اپنے لال کو کلیجہ سے لگائے میٹھی اللہ اللہ کر رہی تھی دل ہوا ہو رہا تھا آنکھ سے ساون بہادوں کی جھڑیاں لگ رہی تھیں۔ چراغ بجھ گیا اور اندھیرے گھپ میں بدنصیب ماں نے چند لمحہ کے مہمان بچہ کو ٹٹول ٹٹول کر پانی پلایا کالم کا دسباری گھنٹہ چار کا گجر بجا رہا تھا کہ بچہ بالکل سرد پڑ گیا شعبانہ بے اوسان ہو کر اوٹھی اور بتیا بانہ باہر آئی تارو ل بھری رات حسرت نصیب ماں کے سر پر تھی اور پچھلے پہر کا سناٹا معبود حقیقی کی یاد دلا رہا تھا سجدہ میں گری اور کہا۔

"الٰہ العالمین دس برس کی محنت ہے رحم کر"

دفعتہً بچہ کی آواز آئی۔ "اُسے بی اماں آؤ۔

بیقرار ہو کر دوڑی اور چھاتی سے لگا کر لیٹ گئی۔

شعبانہ اپنے فاقہ زدہ بچہ سے لپٹی پڑی تھی کہ آخری سسکی نے وہ چاندسی صورت ہمیشہ ہمیشہ کو ماں سے جدا کر دی۔ منہ پر منہ رکھکر پیار کرتی ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر آنکھوں سے لگاتی اور ہائے کا نعرہ لگا کر انگ جا پڑتی دل تڑپتا پھر اٹھتی پیٹتی اور کہتی ہائے اللہ میرے مردے کو روشنی بھی نصیب نہ ہوئی۔

سترہ جنوری ۱۹۱۰ء وہ کمبخت روز تھا جسکی نظیر تاریخ سردارپور میں نظر نہیں آتی صبح صادق کا سہانا وقت تھا اور ایک چھوٹا سا قافلہ ایک عورت اور پانچ بچے چار زندہ اور ایک مردہ کلکٹر صاحب کے بنگلہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ میم صاحب باہر نکلیں تو شعبانہ نے کہا۔

میں والی سردارپور کی حقیقی بہن اپنے اس بچہ کا کفن آپ سے لینے آئی ہوں جسکو ماموں کے پڑوس میں آخر وقت چراغ تک نصیب نہ ہوا سرکار! یہ لال جو آپ کے سامنے مردہ پڑا ہے چوتھے وقت کے فاقہ سے

میری گود میں رخصت ہوا۔ چار معصوم آج چار وقت سے ایک ایک دانہ
کو محتاج ہیں باپ کی ریاست میں میری تقدیر کا ایک پیسہ نہ تھا مجھ رانڈ دکھیا کی
پر رحم کیجئے۔ میرے ایک بچے کی مٹی ٹھکانے لگا دیتے اور اپنے بچوں کا
صدقہ ان بچوں کے پیٹ میں کچھ ڈال دیجئے جنکا بھوک کے مارے آنکھوں میں
دم ہے +

(۴)

مئی سنہ ۰۳ء کی گیارھویں تاریخ ٹھیک دوپہر کے وقت عدالت العالیہ
الہ آباد میں چوٹی کے وکلا جمع ہیں اور ایک مسلمان عورت برقع اوڑھے
دو بچوں کا ہاتھ پکڑے کٹہرے میں کھڑی ہے۔ گردن نیچی ہے اور شرم
اتنی اجازت نہیں دیتی کہ اپنا مدعا بیان کرے۔

یہ مظلوم عورت وہی بدنصیب شبانہ ہے جس کے ساتھ کلکٹر صاحب
کی میم کو اتنی ہمدردی ہوئی کہ اپنے پاس سے روپیہ دے کر وکیل کیا مقدمہ
کے مصارف برداشت کیے اور تقسیم جائداد کا دعویٰ دائر کر دیا۔ آج مقدمہ
کی آخری پیشی ہے اور زبدۃ العلما حاجی الحرمین امام الفضلا
شمس الکملا مولانا مولوی مفتی ابوالمتین محمد فخرالدین مدظلہ کی شہادت
پر فیصلہ کا انحصار ہے مسٹر سٹویٹ مدعیہ کے پیروکار ہیں اور باقی جماعت
مدعا علیہ کی جانب دار۔ دو بجے کے قریب مقدمہ پیش ہوا تو مفتی صاحب نے فرمایا

میری عمر اسی سال کی ہے اس نواح کے قریب قریب تمام
تنازعات اسی خاکسار کی تجویز پر منفصل ہوتے ہیں مدعیہ کا یہ دعویٰ
کہ وہ شرع اسلام کے بموجب ریاست سردارپور میں ایک
تہائی کی حصہ دار ہے باطل ہے۔ ہمارے ہاں عام

دستور ہے کہ لڑکیاں ترکہ پدری سے حصہ نہیں پاتیں اور یہ رواج قریب قریب سو سال سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ میری رائے میں مدعیہ ترکہ کی مستحق نہیں اور اسکا دعویٰ خارج ہونیکے قابل۔

مفتی صاحب کی رائے پر تمام عدالت میں سناٹا چھاگیا اور ججان عدالت حیرت سے زبدۃ العلما کا منہ تکنے لگے۔ مدعیہ کے وکیل نے کہا،

وکیل۔ جناب کا مذہب۔؟

مفتی صاحب۔ اسلام!

مسٹر سٹویٹ۔ قرآن مجید کی بابت آپ کا کیا یقین ہے؟

مفتی صاحب۔ میں اوسکو کتاب اللہ یقین کرتا ہوں۔

مسٹر سٹویٹ۔ آپ احکام قرآنی کے پابند ہیں!

مفتی صاحب۔ بشرطیکہ رواج کی پابندی اس حکم سے متناقص نہو۔

پادری جیکب صاحب نے جو مذہب عیسوی کی اس نواح میں اشاعت کرتے پھرتے تھے اور معہ اپنی جماعت کے عدالت سے باہر موجود تھے مفتی صاحب کے یہ الفاظ سنکر کہ

"میں کتاب اللہ کے ان احکام کا پابند ہوں جو رواج سے متناقص نہوں"

ہیئر ہیئر کے نعرے لگائے اور مدعیہ کا دعویٰ خارج ہوگیا۔

حیات مستعار کی اُس بستی میں جو اقلیم ناپائدار سے تعبیر کیجاتی ہے غضب ایک دریائے ناپیداکنار لہریں لے رہا ہے۔ بار آور درختوں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں اور میووں سے لدی ہوئی ڈالیاں جھوم جھوم کر

زمین کو چوم رہی ہیں کیسا دلفریب منظر ہے صبح صادق کا سہانا وقت طائران خوش الحان کی نغمہ سنجی نشۂ حیات کو دو آتشہ کر رہی ہے۔ مذہب مقدس کو بدنام کرنے والے مدعیان اسلام اس زمین پر ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ زندگی کے اکثر ساز اور دنیا کے بہت سے نشیب و فراز پورے ہوئے۔ عمر کی بڑی بڑی گھاٹیاں طے ہو چکیں منزل مقصود دکھائی دے رہی ہے اور وہ وقت سر پر ہے کہ موت جسکو مذہب ہادم اللذات بتا چکا روز روشن کو کالی اندھیری رات بنا کر جزائے اعمال کے شکنجہ میں کسدے اور یہ صفحہ دنیا سے ناپید ہو جائیں۔

مگر نہیں! نہیں، نفس کے بندوں! اور آنکھوں کے اندھوں! دنیا تمہارے کارنامے فراموش نہیں کر سکتی۔ جبتک مسلمانوں میں فرقہ نسواں کا وجود باقی ہے تمہاری عنایتیں روز روشن کیطرح چمکتی رہیں گی! مظلوموں کی فریاد تمہاری قبروں پر نوحہ خوانی کریگی، اور مجروح دلوں کے نالے مدۃ العمر تمہارے فاتحہ خواں ہونگے۔

تم میں سے اکثر تم سے رخصت ہوئے اور گو بظاہر خالی ہاتھ گئے۔ مگر درحقیقت بڑے بڑے توشہ ساتھ لے گئے! دیکھو ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھو، یہ پکے پکے مزار اور ٹوٹی پھوٹی قبریں ان ہی آن بان والوں کے نشان ہیں۔ خود غرضی ان کے ڈھیروں پر برس رہی ہے اور فلک پیر ان کے مظالم یاد کر کے اپنے نفرت کے پھول چڑھا رہا ہے۔

غفلت میں رہنے، نفاست سے چلنے، اور مٹی میں بسنے والی صورتو عروس دنیا جس کے تم دیوانے رہے تمہارے ساتھ چھوڑ چکی اور ظلم و ستم کی گٹھریاں تمہارے سر پر رکھکر منہ موڑ گئی۔ تم نہیں ہو مگر یہ پیرزال تمہارے اعمال کو از سر نو زندگی بخش رہی ہے۔ جو بیج تم نے کل ڈالے تھے وہ آج

پھل سے آئے مصلحت وشفقت کا بڑا حصہ مر مر کر اور پٹ پٹ کر زندگی بسر کر رہا ہے اور یہ بھولی بھولی صورتیں حسن کی دیویاں اور عصمت کی مورتیں تڑپ تڑپ کر راتیں اور دن گذار رہی ہیں۔

پتھر سے بدتر دل رکھنے والی روحوں، تم ختم ہو چکے مگر تمہارے ظلم ختم نہیں ہوئے۔ تمہاری آتش نشاں طبیعتوں سے وہ وہ چشمے پھوٹے ہیں جو قیامت تک خلق خدا کو کھولاتے رہیں گے۔

دنیا اور دنیا کے کارخانے نیست و نابود ہو جائیں مگر تم ایسی یادگار چھوڑ گئے ہو کہ یہ قیامت میں بھی زائل ہونے والی نہیں۔ آنیوالی نسلیں اور پیدا ہونے والی بیٹیاں میدان حشر میں بھی تمکو فراموش نہ کریں گی۔

عزیزو، اور بھائیو، جو مرحلہ تم طے کر چکے ہیں ہمیں طے کرنا باقی ہے دور نہیں ہے وہ دن کہ قانون قدرت ہمیں تم تک پونچا دے۔ اس صاف گوئی کو معاف کرنا اور اس لیے کہ تمہارے مقام ہم سے بہتر اور ہمارا خدا تم سے قریب تر ہے ہماری دعاؤں میں شریک ہو اور التجاؤں پر آمین کہو خالق حقیقی! ہماری ان پیاری بچیوں کا تیرے سوا کوئی وارث نہیں دنیا انپر بھاری ہے اور زندگی انپر سخت۔ ان کی حالتوں پر رحم کر اپنی شفقت کا ہاتھ انکی حمایت کو بڑھا انکی شکایت سن اور کرم فرما۔

افسوس گیارہ تاریخ کے بعد جس روز مقدمہ فیصل ہوا شبانہ کے حالات باوجود تلاش کے کہیں نہ مل سکے سرواہ پور والونکو پھر اسکی صورت دیکھنی نصیب نہوئی خدا معلوم آسمان کھا گیا یا زمین زندہ رہی یا مر گئی یہ علم تو خدا ہی کو ہے لیکن یہ یقین ہمکو بھی ہے کہ بدنصیب شبانہ اور مسلمان علامہ فخرالدین کا مقدمہ ایک اور عدالت میں بھی فیصل ہوگا اور وہ اس حاکم کی عدالت ہوگی جسکے اتنی وابدی راج کے گیت دنیا کا ہر ذرہ گا رہا ہے۔ راشد الخیری

قطعہ

بہت سے مسئلے پیشِ نظر ہیں اہلِ عالم کے ولیکن مسئلہ ایسا نہیں کوئی بھی پیچیدہ
کہ ہم واقف تو ہوں کیا ہمکو کرنا چاہیے لیکن جو نوبت کام کی آئے تو ہمکو کچھ نہو پروا
نہیں معلوم کیا ہمکو کہ ہم اب مٹتے جاتے ہیں ہماری ہستی قومی کا بگڑا جاتا ہے نقشا؟
نہیں معلوم کیا ہمکو کہ ہم کمزور ہیں کیسے؟ اور اِس عالم میں جو کمزور ہے وہ جی نہیں سکتا
نہیں معلوم کیا ہمکو کہ ہیں اک قوم جاہل ہم؟ اور اپنا کام بے تعلیم ہرگز چل نہیں سکتا
ہمیں معلوم سب کچھ ہے ولیکن کچھ نہیں کرتے بغیر از سودنِ دستِ تمنا کچھ نہیں ہوتا!
پسے جاتے ہیں ہم زیرِ قدم اقوامِ عالم کے اور اپنا حال یہ ہے ہم سے کچھ بھی ہو نہیں سکتا
رکھا ہے ذوقِ عیشِ رفتہ نے لبریزِ کیفیت ہم اپنے خوابِ ماضی میں ہیں مستقبل سے بے پروا
جو منہ پر آتے کہتے ہیں جو جی میں آئے کرتے ہیں ہمیں کس بات کا ڈر ہے ہمیں کس بات کی پروا
مزے کی زندگی ہے وقت بیکاری میں کٹتا ہے غمِ امروز کی کچھ فکر نے اندیشۂ فردا
ادا سے ہیں غفلت نوازی سے ہمیں غربت کیا ہے نام روشن ہم نے ہی اسلام کا کیسا!
مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں اپنی محفل میں توجہ کے ذرا قابل نہیں دنیا و مافیہا
کہیں ہے فاقہ مستی اور کہیں عشرت پرستی ہے غرض جو بات ہے اپنی سراسر ہے وہ نازیبا
ہوئی ہے متبدل اس دور میں اس قوم کی حالت یقیں آتا نہیں اس پہ گزشتہ عہدِ زریں کا
نہ کچھ غیرت رہی دل میں نہ ہے کچھ حوصلہ باقی اب اس سے بڑھکے ناکامی کا نقشہ اور کیا ہوگا
ابھی تو ہے اگر ہمکو سنبھالے تو سنبھلتے ہیں۔ وگرنہ ڈھب تو کوئی بھی نہیں اپنے سنبھلنے کا

شب تاریک و بیم موج و گردابی چنین حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

رضا علی وحشت

تاریخ بیجانگر

مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقدار رائچور کے اسم گرامی سے علمی دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ مولانائے محترم نے اپنے والد بزرگوار شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کی قابل قدر علمی خدمات میں جو کچھ اضافہ فرمایا وہ ادب کے دلی شکریہ کا مستحق ہے آپ کی تصانیف اقبال مطلع العلا وغیرہ نے جو قبولیت حاصل کی وہ محتاج بیان نہیں تاریخ بیجانگر مولانائے موصوف کی اس سعی محنت و جانکاہی کا نتیجہ ہے جو آپنے اس کے مکمل کرنے میں گوارا فرمائی۔ کتاب متعدد سادہ و رنگین نقشوں سے آراستہ ہے اور یہ خوبی اسکی قدر و قیمت کو دوبالا کر رہی ہے ہر واقعہ قابل مصنف کی محنت و تلاش کا پتہ دیتی ہے۔ چھپائی کاغذ اور بالخصوص ٹائٹل پیج قابل داد ہے ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ پبلک میں قوم مولانائے موصوف کی یہ محنت قدر سے دیکھی جائیگی اور قدردانان ادب قابل مصنف کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ۸/) مصنف سے رائچور دکن سے مل سکتی ہے۔

حضور نبوی میں خون شہدا کی نذر

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا

قیود شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظام کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

ہوا نہ بس تو اجل اشتیاق آزادی
سمند عمر کو اک اور تازیانہ ہوا

فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھکو
حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھکو

کہا حضور نے اے عندلیب باغ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمی نوا سے گداز

ہمیشہ سرخوش جام ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرت سجود نیاز

اڑا جو پستی دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھکو ملائک نے رفعت پرواز

نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

کہا یہ میں نے کہ سچی خوشی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ریاض دہر میں یوں تو ہزار رنگ کے پھول
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں۔
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(اقبال)

کوہِ علم

سال کے اس موسم میں جب آسمان کی صفائی۔ زمین پر بچھے ہوئے رنگا رنگ میوے۔ درختوں کی بدرنگ پتیاں اور آغاز خزاں کا دلکش مگر چند روزہ منظر دماغ کو آزادہ رو اور تخیل کے مناسب بنا دیتے ہیں میں ایک خوبصورت اور خوش سواد گاؤں کی سیر کر رہا تھا جب عجائبات قدرت کے نظارے نے ماندگی پیدا کر دی، میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا جس پر ہری ہری کائی جمی تھی۔ میں اپنی گرد وپیش کی چیزوں سے دلخوش کن تخیلات کے مزے لوٹنے میں مصروف تھا کہ خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ آبشار کی خوش آئند صدا اور قریب کے شہر کی گونج نے میرے دماغ کو ایک راحت فزا سکون بخشا اور نیند نے چپ چاپ مجھپر غلبہ کر لیا۔

چشم زدن میں میں نے اپنے تئیں ایک لق ودق وادی میں پایا جسکے وسط میں نہایت بلند پہاڑ واقع تھا جو پہلے کبھی میرے وہم میں بھی نہ آیا ہوگا۔ یہ آدمیوں کی کثیر التعداد جماعت سے اٹا تھا جس میں اکثر لوگ نوعمر نظر آتے تھے اور پرحوصلہ بشرے کے ساتھ آگے کو بڑھے پڑتے تھے۔ اگرچہ راستہ اکثر مقاموں پر بہت ڈھلوان اور نہایت دشوار گذار تھا ؎ (داغ)

اللہ رے جوش وحشت اہل کے گرد پڑتا ہے فراغ   خار صحرا پا نویں ہے شوق ہامون دلیں ہے

میں نے غور کیا تو دیکھا کہ جنھوں نے ابھی ابھی پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا ہے وہ اپنے تئیں چوٹی سے کچھ دور نہیں سمجھتے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں متواتر نئی نئی پہاڑیاں پیش نظر ہوتی جاتی ہیں چنانچہ پہلے جسکو بلند ترین قلہ تصور کرتے تھے آگے چلکر دوسری پہاڑی کا دامن نظر آنے لگتا ہے آخر کار معلوم ہونے لگا کہ اس پہاڑ کی چوٹی بادلوں میں غائب ہوگئی ہے۔ میں ان تماشے تعجب خیز نگاہوں سے دیکھنے میں مصروف تھا کہ یکایک میری عقل سلیم نے آکر مجھ سے کہا تیرے سامنے جو پہاڑ ہے اسکا نام کوہ علم ہے۔ چوٹی پر صدق کا مندر ہے جسکا گنبد بادلوں سے بھی بلند ہے اور دیوی کے چہرے پر نور کی نقاب پڑی ہے۔ ذرا اس کے پرستاروں کے ہجوم کو ملاحظہ کر اور ہمہ تن ہوش وگوش ہو جا!!

میں نے دیکھا کہ اس پہاڑ پر چڑھنے کا کوئی سیدھا راستہ اگر ہے تو ایک ہی دروازے کے ذریعہ سے جس کا نام **باب الالسنہ** ہے۔ یہ پھاٹک ایک عورت کے زیر نگرانی ہے جس کے چہرے سے غور و فکر ترشح ہے اور جب تک ہر وقت ہلتے رہتے ہیں گویا آپ ہی آپ کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ اس عورت کا نام **حافظہ** ہے۔ اس کے احاطہ میں پہونچکر میں پریشان ہو گیا۔ ایسے جو صداؤں سے ٹھٹک گیا کیونکہ ان عجیب و غریب آوازوں سے میں گھبرا گیا تھا جسکی کوئی مثال اگر ہو سکتی ہے تو شہر بابل کے خلط السنہ کے واقعہ سے

اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں قلعہ کوہ کی جانب اٹھائیں جہاں کی ہوا صاف اور رحمت افزا تھی اور ساتی پرستی پھلواں وغیرہ سبزے سایہ کئے ہوئے تھے اور پری کے چہرے سے نور کی شعاعیں نکل نکلکر اس کے پرستاروں کے گرد و پیش دوڑ رہی تھیں۔ میں بے ساختہ بول اٹھا خوش نصیب اُن کے جنہیں

اس پہاڑ پر چڑھنے کی قدرت ہو ۵ (غالب)

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں۔

یہ کلمے جوشوں میں میری زبان سے نکلے ہی تھے کہ میری نظر ایک اور پری پر جا پڑی جس کی صورت سے سابق الذکر کی نسبت زیادہ تجلی برس رہی تھی اور میری بغل میں کھڑی تھی وہ بولی نہیں! بلکہ خوش نصیب اُن کے جنہیں نیکی قصر القناعۃ تک پہونچادے۔ میں نے پوچھا کیا نیکی اسی وادی میں رہتی ہے اُس نے جواب دیا۔ "ہاں میں اسی وادی میں رہتی ہوں اور اس پہاڑ کو اپنے جلوے سے زینت دیتی ہوں میں جہو پٹر وادی میں رہنے والوں کو ان کی محنت و مشقت میں مدد دیتی ہوں حکیم و فیلسوف کو اس کے غور و فکر میں اطمینان بخشتی ہوں میں شہر کی بھیڑ میں بھی ملی جلی ہوں اور زاویہ نشین پر اس کے کنج میں رحمت نازل کرتی ہوں ہر اس دل میں میرا مسکن ہے جو مجھ سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ میں اپنے مشتاقوں کے لئے ہر وقت حاضر و مستعد ہوں بیشک سامنے تمہیں اوج تمود پر پہونچا سکتا ہے مگر اطمینان قلب اور سچی خوشی سے منزل کی راہ ایک میں ہی ہوں"۔ وہ یہی یوں گفتگو کر رہی تھی کہ میں نے غایت شوق اور تمنائے ہم آغوشی میں اپنے بازو اس کی طرف اس جوش سے پھیلا دئے کہ میری آنکھ کھل گئی ۵

جو کھلیں ساری آنکھیں تو نہ باغ تھا نہ وہ گل وہی درد ہے قلق ہے۔ وہی آہ ہے بکا ہے۔

محمد مسلم عظیم آبادی۔

غزلیں

شده در عشق تو رسوا دلِ دیوانهٔ من — بر زبان همه عالم بود افسانهٔ من
کرده بلقیس ُرُشے جائے بکاشانهٔ دل — غیرتِ قصرِ سلیمان شده ویرانهٔ من
بیش ازین نیست مرا طاقتِ دردِ هجران — صبر تا چند بیا دسبرِ جانانهٔ من
تا که پابستِ سرِ زلف و رازِ تو شدم — سر وساں بانگل استاین دلِ دیوانهٔ من
زاهد المعنه مزن بر من رندے که ملک — آمده سجده کناں بر درِ میخانهٔ من
همه عمرم بسر آمد بامید یکه شبے — جلوه فرماشود آن شوخ بکاشانهٔ من

سرِ راهِ تو مقیم است بخواری ارشد
حالِ زارش بنگر دلبرِ جانانهٔ من

جناب مولوی شیخ علی باقر صاحب مرحوم متخلص آباد عظیم آبادی

نزع کا ہنگام ہے شوقِ لقائے یار ہے — اب خدا چاہے تو کوئی دم میں بیڑا پار ہے
کب فقط اہلِ زمیں کو حسرتِ دیدار ہے — آسماں پر ہر ستارہ دیدۂ بیدار ہے
خوب ہے واعظ دکھائی باغِ جنت کی بہار — حاصلِ جنت تماشائے جمالِ یار ہے
اُس کو ناخوش کر دیا اسکی تلافی کیا کریں — چارۂ عصیاں اگر توبہ ہی استغفار ہے
ہے جو یاں ہشیار سچ پوچھو تو دیوانہ ہے وہ — ہے جو دیوانہ حقیقت میں وہی ہشیار ہے
کب نہاں پردہ میں ہے وہ چہرۂ عالم فروز — خود حجابِ آنکھوں کا اپنی بیچ میں دیوار ہے
گوش جویائے صدائے جانفزا ہے دوست ہیں — چشمِ مشتاقِ تماشائے جمالِ یار ہے
میکدہ میں آ اگر منظور ہے تحقیقِ حق — ہر در و دیوار یاں کی کاشفِ اسرار ہے
کیا کہوں آباد میں اُس مہوش قاتل کی شان — آستینیں تا بہ مرفق دوش پر تلوار ہے

۲- خاتیہ ۲ [illegible] - بتقریب تاج پوشی قیصر ہند نمبر دو حصہ بجائے ۸ کے ۶ دیئے جائینگے۔

وصل حبیب

ناول نہیں یہ حبیب اداؤں کی ہے تصویر — رنگ اس میں نئی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

حسن تو بھی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا

کہتی ہے جھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی - از بھوپال - امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیرجی شبیر علی صاحب - از بجنور - الحمد للہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول حسب مراد زیور طبع سے آراستہ ہوکر نور افزائے چشم مشتاقین ہوا - اوس کی ضرورت نہیں - کہ آپ میں قابلیت خداداد ہے - حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے اوس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مشرف احسین صاحب سوداگر از ملتان - آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) قاضی عبدالشکور صاحب - از خطو بائی ضلع بلند شہر - وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی - حقیقت آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

(۵) مولوی نصیح الدین صاحب از سنبل مرادآباد - وصل حبیب دیکھا - ماشاء اللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کرکے دماغ سے خوب کام لیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو ہرکیشن داس صاحب منصف رد - از دہلی - آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا - بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو بنسی گوپال صاحب کشنداس - از حیدرآباد دکن - آپکے مسلسل ناول وصل حبیب کے ہر دو حصہ کو واقعی نہایت محو مسرور پڑھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شعیب صاحب مترجم - شکر گویا ادارہ - کتاب (وصل حبیب) کو ترکیا امید سے زیادہ لطف اوٹھایا عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے - چھوٹے چھوٹے گرچست و برمعنے جملے مصنف کو ادبی قابلیت کی شہادت دے رہے ہیں - عبارت کا زور - شعر کی ترتیب جملوں کی ترکیب - الفاظ کی بندش - صاف بتلا رہی ہے کہ مصنف کوشش کیا تمام بکمال مجبور ہے - مذکورہ بالا صفات نے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے - ہر ناول کو ایکبار دیکھکر انسان آسودہ ہوجاتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار ہی کیا دس بار میں بھی سیری نہیں ہو سکتی بلکہ اور شوق شتعال بن جاتا ہے۔ انتہی

(۹) رسالہ کاشف الاسلام مرادآباد بابت مئی ۱۹۱۱ء - ناظرین واقف نہیں کہ ہم مخرب اخلاق ناولوں کے کس قدر مخالف ہیں - وصل حبیب کو ہم نے کچھ بے چین نگاہوں سے بغور دیکھا - ہمارا خیال تھا - کہ موجودہ لغو افسانوں کی طرح یہ بھی ہوگا - مگر کس قدر خوشی ہوئی کہ مصنف نے بالکل ہمارے خیال کا چربا اپنی تصنیف میں اتار دیا ہے - زبان کی سلاست نے اردو میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے - ناول بہ وجوہ بہت اچھا اور قابل قدر ہے - اور ایسے ہی کتابوں کی اشاعت کے ہم موئد ہیں۔

(۱۰) اخبار [illegible] ماہ [illegible] - وصل حبیب نے ہم کو مشتاق وصیفہ کا مشتاق بنایا اور ہی یہ ہوجئے

مہتمم کتبخانہ حبیبیہ - ڈاکخانہ گوہر گنج - ریاست بھوپال

(نوٹ) [illegible] ۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء مخصوص ہیں [illegible] تاریخوں کے پورے قیمت بھیجا یگی محصول ڈاک [illegible]

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق عصمت سے بہتر ناصح مصلح کا رہنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائے گا کہ کوار پتے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے اُنہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں اُن کو پیش آئینگی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہییں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُرلطف و باطمینان بسر کرانے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے۔ عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آدمی کو وہ بے فکر پرورش کر رہی ہیں وہ کس محنت و شفقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُن پر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا۔

ٹائٹیل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ صاف ستھری تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی قوت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ کیا ہوگا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ بھر میں ۴۲ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں۔ قیمت۔ سالانہ (عہ)

منیجر عِصمت و تمدن

(دہلی)

جلد ۱ — نومبر ۱۹۱۱ء — نمبر (۵)

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا مخزن

اڈیٹر شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین:۔

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری دہلوی
بابت ماہ محرم الحرام ۱۳۲۹ھ (تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا) قیمت فی پرچہ (۴)
کتبہ احقر ابو جعفر حامد میرزا دہلوی

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عِصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کواری لڑکیوں کے واسطے عِصمت سے بہتر سہیلی عِصمت سے بہتر شفیق رفیق عِصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عِصمت اُن کو بتلائے گا کہ کوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہییں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و باطمینان بسر کروانے کے واسطے عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عِصمت ہے عِصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے فکری سے خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں آپ پر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دینگے عِصمت بتلائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عِصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا +

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا۔ عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عِصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ہر مہینہ ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں قیمت سالانہ (۳ روپے)

منیجر عِصمت و تمدن

(دہلی)



قیصرہ جرمنی اور اُن کی صاحبزادی

تمدّن

محبت اور کشش

اس رسالہ کے ناظرین سب جانتے ہوں گے کہ کشش اُن تمام چیزوں میں پائی جاتی ہے جو مادّی کہلاتی ہیں۔ جہاں کہیں مادّہ ہے کشش ضرور موجود ہے عام طور پر اس کی جو شکلیں نظر آتی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو کشش اتصال کہلاتی ہے۔ یہہ کشش ہر مادّی چیز کے ذرّوں میں کم و بیش موجود ہے۔ اس کے سبب سے ہر چیز کے ذرّے ایک دوسرے سے ملے جلے رہتے ہیں۔ اگر یہہ کشش نہوتی تو دنیا میں کوئی چیز متشکل نظر نہ آتی۔ اس کشش کے سبب سے مختلف مادّی چیزوں کے ذرّے آپس میں مِل کر نئی نئی شکلیں بناتے رہتے ہیں۔ لوہا کیا چیز ہے؟ مادّی ذرّوں کا ایک مجموعہ ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے نہایت گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ مٹی کیا چیز ہے؟ یہہ بھی مادّی ذرّوں کا ایک مجموعہ ہے مگر اس میں ذرّوں کا ملاپ اسقدر گہرا نہیں ہے جیسا کہ لوہے میں ہے

اسی سبب سے مٹی کا ٹکڑہ تھوڑی سی طاقت لگانے سے پاش پاش ہوجاتا ہے برخلاف اس کے لوہے کے ٹکڑے کو توڑنے کے لیے بہت بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایک کشش وہ ہے جو کشش شعری کہلاتی ہے۔ اس کے سبب سے تمام مسامدار مادی چیزیں پانی جیسی سیال چیزوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ اسفنج کو دیکھو کہ وہ پانی کو کس طرح اپنے اندر جذب کرتا ہے ایک اور کشش ہے جو کیمیائی کشش کہلاتی ہے۔ اس کے سبب سے عنصر یعنی مفرد چیزیں ایک دوسرے سے ملتی اور مرکب چیزیں بناتی ہیں۔ یہ مرکب چیزیں اُن مفرد چیزوں کی نسبت جن سے ملکر وہ بنتی ہیں صفات اور خواص کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً آکسیجن اور ہیڈروجن دو ہوائی عنصر ہیں۔ اُن کے آپس میں ملنے سے پانی بن جاتا ہے۔ اور پانی کے خواص اور صفات اِن دو ہوائی مفرد چیزوں کے خواص اور صفات سے جداگانہ ہوتی ہیں۔ کھانے کا نمک کلورین اور سوڈیم سے ملکر بنتا ہے۔ کاسٹک جس کے چھونے سے بدن سیاہ پڑ جاتا ہے اور جل جاتا ہے۔ شورہ کے تیزاب اور چاندی سے ملکر بنتا ہے۔ ایک اور کشش ہے جو مقناطیسی کشش کہلاتی ہے۔ یہ وہ کشش ہے جس کے سبب سے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے ایک مشہور کشش وہ ہے جو برقی کشش کے نام سے موسوم ہے۔ ایک وہ کشش ہے جو کشش ثقل کہلاتی ہے۔ اس کے سبب سے زمین اُن تمام چیزوں کو جو اُس پر موجود ہیں اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ پتھر کو کیسی ہی بڑی طاقت سے آسمان کیطرف پھینکو وہ ضرور زمین پر واپس آنے لگا۔ اس سے بھی زیادہ شاندار وہ کشش ہے جو تمام ستاروں کے درمیان موجود ہے۔ ہر ستارہ

دیگر ستاروں کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ مثلاً زمین سورج۔ چاند اور دیگر تمام ستاروں کو کھینچ رہی ہے۔ اسی طرح سورج زمین چاند اور دیگر ستاروں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اسی کے سبب سے ہر ستارہ اپنے خاص مدار میں گردش کرتا ہے اور کوئی ستارہ کسی اور ستارہ سے ٹکرانے نہیں پاتا۔

نباتات اور حیوانات میں جو کشش اتصال موجود ہے اُس کے سبب سے اُن کے اجزا باہم پیوستہ رہتے ہیں اور وہ شعوری کشش کی مدد سے اپنی غذا کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں۔

غرضکہ تمام مادّی اور حیوانی دنیا کی زندگی کا مدار کشش پر ہے اور کشش قدرتی طور سے اُن کے اندر موجود ہے اور اپنا کام ہر وقت کرتی رہتی ہے۔ اگر کشش اِس عالمگیر طریقے سے دنیا کی تمام مادّی چیزوں میں نہ پائی جائے تو یہ بات یقینی ہے کہ نظام کائنات کا شیرازہ بالکل بکھر جائے اور اِس لامحدود فضا میں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے گرد و غبار کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔

اب ذرا اخلاقی دنیا پر نظر ڈالو۔ یہاں بھی کشش اپنا جلوہ نمایاں طور پر دکھاتی ہے۔ محبت بھی ایک کشش ہے۔ اِس کشش میں اور اُس کشش میں جو دنیا کی تمام مادّی چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ اعتباری فرق کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ وہی ایک چیز ہے جو مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ ذرا خیال کرو کہ ہم میں سے ہر انسان اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے اور اگر وہ کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو یہ محبت بھی اپنی ذات ہی کے لیے کرتا ہے۔ محبت کی [illegible] شکل اور کوئی قسم کیوں نہ ہو ہر صورت میں اُس کے اور اُس عالمگیر کشش کے درمیان کوئی

بین فرق نظر نہیں آتا۔ جب کوئی بچہ اپنی فطرت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ
ہر چھوٹی چیز کو جو اس کے سامنے آئے مونہہ میں لیتا ہے اور اس کو نگل
لینا چاہتا ہے اور اگر کوئی بڑی چیز اس کے سامنے آئے جس کو وہ
مونہہ میں نہیں رکھ سکتا تو اس کو اپنی چھاتی سے لگا لیتا ہے اور اگر کوئی
شخص اس چیز کو چھیننا چاہے تو جہاں تک اس کے امکان میں ہے
اس کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا اور اگر وہ چیز اچانک چھین لی جائے
تو چیخ مار کر رونے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ بچے کو اسبات کی تمیز ہونے لگتی
ہے کہ کونسی چیز اس کے لیے مفید ہے اور کونسی چیز اس کے لیے مضر
ہے۔ اس حالت میں وہ صرف مفید چیزوں کو لیتا اور مضر چیزوں کو پھینک
دیتا ہے۔ یہ مضر چیزوں کو پھینکنے اور اپنے سے دور رکھنے کی عادت مجبوری
سے پیدا ہوتی ہے۔ نہ رغبت سے۔ عام طور پر تو ہر بچہ اس بات کی
طرف مائل ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچے اور کسی چیز کو ہاتھ سے
نہ دے۔ خواہ وہ چیزیں اس کے کارآمد ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ٹھیک نمونہ
اس کشش کا ہے جو مادی اجسام کے درمیان موجود ہے۔

بچے کی عمر رفتہ رفتہ بڑھتی ہے۔ سب سے پہلے وہ ماں باپ سے محبت
کرتا ہے ہوش سنبھالنے پر وہ اپنے بھائیوں اور بہنوں اور عزیز و
رشتہ داروں سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ جوانی کے عالم میں نوجوان
لڑکا نوجوان لڑکیوں کے ساتھ اور نوجوان لڑکی نوجوان لڑکوں کے
ساتھ محبت کا جذبہ اپنے دل میں اٹھتا اور ابھرتا دیکھتی ہے محبت کے
جذبہ اور جوش کے وقت جب ایک انسان دوسرے انسان کا بوسہ لیتا
یا اس کو اپنے سینہ سے لپٹاتا ہے اور اسطرح اپنے جذبہ اور جوش کا

اظہار کرتا ہے تو اس اظہار محبت کا سراغ بچپن کی اُس حالت میں ملتا ہے جبکہ بچہ ہر چیز کو مونہہ میں لیتا یا چھاتی سے لگالیتا ہے تاکہ وہ چیز اُس سے جدا ہونے نہ پائے +

اب ذرا محبت کی اُن بلند شکلوں پر غور کرو جو خاندانی یا فریقی اور قومی یا ملکی محبت کے پیرایوں میں جلوہ گر ہیں۔ ہر انسان اپنے خاندان کی عزت اور حمایت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اُس خاندان سے وابستہ ہے اور اُس کے فواید اور توقعات کا مدار اُس خاندان کا ممبر ہونے پر ہے اسی بنا پر صاف ظاہر ہے کہ خاندانی محبت کی بنیاد اپنی ذاتی منفعت کے خیال پر ہے نہ کسی اور چیز پر۔ اسی طرح جس مذہبی یا سیاسی گروہ میں کوئی آدمی شریک ہوتا ہے اُس کی حمایت وہ اس لیے کرتا ہے کہ اس گروہ کے ساتھ اُس کی ہزاروں توقعات وابستہ ہیں قومی اور ملکی محبت کی بنیا بھی اُسی ذاتی منفعت پر ہے جس کی خواہش ہر انسان کی فطرت میں قدرتی طور پر موجود ہے۔ کسی گروہ یا قوم کی طرفداری میں انسان جو ذاتی فواید حاصل کرتا ہے اگر ہم اُن سب سے قطع نظر کریں تو یہ فائدہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ ایسا کرنے والا آدمی شہرت اور ناموری حاصل کرتا ہے اور اپنی تعریف لوگوں کی زبان سے سُنتا ہے اور لُطف اُٹھاتا ہے۔ یہ ذاتی لذت بعض دفعہ انسان کو جان اور مال تک قربان کرنے پر آمادہ کردیتی ہے۔ جو لوگ رات دن کسی خاص مذہب کی پیروی میں اپنی جان کھپاتے اور محنت اور کوشش سے نہیں تھکتے وہ بھی درحقیقت اِس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ دوسری دنیا میں اُن کو لامحدود خوشی حاصل ہوگی۔ غرضکہ اس

مضمون کے اوّل میں جو کہا گیا ہے کہ ہر ایک انسان یا تو اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے۔ یا اپنی ذات کے لیے دیگر انسانوں سے محبت کا اظہار کرتا ہے یہ محبت کی تمام شکلیں اسی ایک اصل کی مختلف فرعیں ہیں اور اس اصل کا مدار اوس قدرتی کشش پر ہے جس کے سبب سے ہر نبات اور ہر حیوان اُن چیزوں کو اپنے اندر جذب کرتا ہے جو اس کے لیے مفید ہوں اور جو اس کو بقائے زندگی کے لیے کارآمد ہوں اور جس طرح اس کشش کے نہ ہونے سے تمام نباتات معدوم ہو سکتی ہیں اور تمام حیوانات روئے زمین سے غایب ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ انسانوں میں نہو تو نہ خاندانی محبت کا وجود پایا جا سکتا ہے نہ فریقی محبت کا اور نہ قومی اور ملکی محبت کا ظہور ہو سکتا ہے نہ مذہبی اور سیاسی مقبولیت کے جلوے دکھائی دے سکتے ہیں اور یہ صورت ایسی خوفناک ہے کہ اس کے سامنے انسانی تمدّن ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں ٹھیر سکتا۔

محبت کے مقابلہ میں بغض و عداوت کا جذبہ انسانوں میں پایا جاتا ہے اب سوال یہ ہے کہ جسطرح کشش بمقابلہ محبت کے مادی چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ آیا کوئی اور ایسی چیز ہے جو بمقابلہ بغض و عداوت کے مادّی اشیاء کی دنیا میں پائی جاسکے؟ جواب یہ ہے کہ مادّی چیزوں میں کشش کے علاوہ جسکو جاذبہ بھی کہتے ہیں ایک اور قوت موجود ہے جس کو دافعہ کہہ سکتے ہیں۔ جب دو کشش آپس میں ٹکراتی ہیں تو اس قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر تم ایک پتھر پر دوسرے پتھر کو ایک خاص قوت سے دے مارو تو آہستہ ہی

زور کے ساتھ یہ دوسرا پتھر اُچھٹ جائے گا۔ لیکن جو مختلف مادی اجسام میں پائی جاتی ہے وہ بھی قوت دافعہ کی ایک خاص شکل ہے خیال کرو کہ جسطرح کشش کی دو قوتوں کے ٹکرانے سے دافعہ کا ظہور ہوتا ہے اسیطرح جب دو آدمی کسی خاص چیز کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے مخالفت کا اظہار کرتے ہیں تو بغض و عداوت کی قوت فوراً آشکار ہوتی ہے۔ بغض و عداوت کی ابتدائی شکل حسد ہے اور یہ بغض و عداوت کی تمام قسموں کی اصل جڑ ہے اور تمام برائیوں اور بدیوں کی بنیاد ہے۔ یہ قوت ہر انسان کے اندر قدرتی طور سے موجود ہے مذہب کا جلوہ اگر دنیا میں نہو تو حسد کا جذبہ نہایت شدت کے ساتھ نمایاں ہو اور تہذیب اور تمدن کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکدے۔ مذہب اور تعلیم نے آجکل اس جذبہ کو لوگوں کی طبیعتوں میں پنہاں کر رکھا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ سر اسٹرک نیوٹن کے قول کے موافق کشش کی حکومت صرف مادی و جسمانی دنیا ہی میں نہیں ہے بلکہ اخلاقی و روحانی دنیا میں بھی اُسکی حکمرانی ہے اور کشش کا قانون دونوں دنیاؤں میں یکساں طور پر عالمگیر ہے۔ اور مادی اور روحانی چیزوں پر یکساں حاوی ہے +

وحیدالدین سلیم

خریداران تمدن براہ کرم خط و کتابت میں نمبر کا حوالہ ضرور دیں ورنہ تعمیل مشکل ہے +

کلام اسمٰعیل

محرم

مانا کہ بہت شوق سے کی تعزیہ داری　　مانا کہ علم دھوم سے یاروں نے اُٹھائی
مانا کہ ہوا مرثیہ خوانی میں توغل　　مانا کہ مجالس میں بہت روئے رولائے
لیکن کبھی سادات کا احوال بھی پوچھا　　صد حیف جو رحم اونکی مصیبت پہ نہ آئے
انمیں بھی تو ہے خون اُسی شیر خدا کا　　ہیں یہ بھی اسی فاطمہ کی نسل کے جائے
بیچارہ و بیکس پھریں سادات کے بچے　　کوئی انہیں مکتب میں لکھائے نہ پڑھائے
بے علم و ہنر تنگ ہے جب ان پہ معیشت　　ڈر ہے کہ زمانہ انہیں دردر نہ پھرائے
ہے کوئی جوانمرد کہ از راہ محبت　　سادات کی تعلیم میں حصے اور دلائے

رباعیات

اے بارِ خدا کہ عالم آرا تو ہے　　دانائے نہان و آشکارا تو ہے
ہر شخص کو ہے تیرے کرم کی اُمید　　ہر قوم کا آسرا سہارا تو ہے

اے بے خبری کی نیند سونے والو　　راحت طلبی میں وقت کھونے والو
کچھ اپنے بچاؤ کی بھی سوچی تدبیر　　اے ڈوبتی ناؤ کے ڈبونے والو

تھا رنگ بہار بے نوائی کہ نہ تھا۔　　ظاہر تھا زوال انتہائی کہ نہ تھا۔
کہدو ایمان سے عیدگاہ کے آنگن　　گردش میں تھا کاسۂ گدائی کہ نہ تھا

اسراف سے احتراز اگر فرماتے　　کیوں گردشِ ایام کی سیلی کھاتے
انگشت نما تھی کجکلاہی جن کی　　وہ پھرتے ہیں آج جوتیاں چٹخاتے

سلطنت اسلامی کا آخری منظر

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

(خدا کسی قوم کی حالت جب تک کہ وہ قوم اپنی حالت نہ بدلے نہیں بدلتا)

ذیل کی سطروں میں اس آیت پاک کی تاریخی تفسیر بیان کی گئی ہے دہلی کی عظیم الشان اسلامی سلطنت نے کیونکر اپنی حالت بدلی تو خدا نے اوسکی حالت بدل دی ؟ ناظرین اس سوال کا اسمیں جواب پائیں گے۔

اکبر اعظم کے جلوس کو ڈیڑھ سو برس گزر چکے ہیں سنہ ۱۱۱۸ھ میں اکانوے برس کا بڈھا شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر دکن کی پہاڑیوں میں ٹھوکر کھا کر احمد نگر میں مر چکا ہے شاہ عالم بہادر شاہ اپنے دونوں بھائیوں اعظم شاہ اور کام بخش کے خون سے ہاتھ رنگین کر چکا ہے شاہ عالم کی جگہ عظیم الشان مسند نشین ہونا چاہتا ہے ناگہاں اوس کا بڑا بھائی معز الدین جہاندار شاہ اوسپر حملہ کرتا ہے عظیم الشان کا ہاتھی توپ کے صدمہ سے بھاگ کر دریائے راوی میں مع سواری کے ہمیشہ کے لیے غرقاب ہو جاتا ہے۔ جہاندار شاہ اپنے دوسرے بھائی جہان شاہ سے شکست کھاتا ہے پھر دھوکے سے اوسکو مار ڈالتا ہے اور فوراً فتح کی خوشی میں لعل کنور اپنی معشوقہ کے ساتھ مست شراب ہے۔

جہاندار شاہ کا تیسرا بھائی رفیع القدر تیموری تاج کی اس مضحکہ خیز واقعہ کو دیکھکر غصہ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، ذو الفقار خاں وزیر اعظم مدہوش بادشاہ کو میدان میں لاتا ہے، رفیع القدر اپنی تھوڑی فوج کے ساتھ شاہی لشکر کا مقابلہ کرتا ہے اور پھر خود ہاتھی سے اوترکر تیغ و سپر لیکر تن تنہا حملہ کرتا ہے

اور مارا جاتا ہے، جہاندار شاہ اب لاہور سے شاہجہاں آباد آتا ہے۔ اور یہاں عظیم الشان کا بڑا بیٹا اپنے چچا جہاندار شاہ کے تیغ ستم سے شہید ہوتا ہے اعظم شاہ اور کام بخش کے معصوم بچے عالی تبار محی السنہ اور محمد فیروز مسند محبوس زندان ہوتے ہیں،

معز الدین جہاندار شاہ کی سلطنت کو ابھی چند روز ہی نہیں گذرتے ہیں کہ شہزادہ فرخ سیر اپنے باپ عظیم الشان کا انتقام لینے کو نکلتا ہے اور پھر قوت نہ پاکر سید حسین علی خاں صوبہ دار عظیم آباد سے اعانت چاہتا ہے، حسین علی خاں اپنے بھائی سید عبد اللہ خاں صوبہ دار الہ آباد کو لکھتا ہے آخر فرخ سیر حسین علی خاں اور سید عبد اللہ کی مدد سے دار الحکومت کا رخ کرتا ہے اودہر سے جہاندار شاہ اپنے بیٹے عزیز الدین کو پچاس ہزار سوار کا سپہ سالار بناکر بھیجتا ہے، اکبر آباد سے نکل کر اعز الدین، فرخ سیر کا حال سنتا ہے اور تیموری سلطنت کا یہ سب سے پہلا ڈر پوک شہزادہ رات کے تاریک پردہ میں چھپکر اپنی فوج سے نکل بھاگتا ہے، جہاندار شاہ بڑے سر و سامان سے نکلتا ہے اور ہزیمت اوٹھاتا ہے اور اپنی معشوقہ کے ساتھ زنانی سواری میں بیٹھکر قلعہ شاہجہاں آباد میں پناہ لیتا ہے اور پھر مارا جاتا ہے،

فرخ سیر تخت پر قدم رکھکر اپنے جور و ظلم سے دربار کے دربار کو فریادی بنا دیتا ہے، اور اپنے محسن حسین علی خاں امیر الامرا۔ اور سید عبد اللہ قطب الملک کو اپنی بد دماغی سے اپنا دشمن بنا لیتا ہے امیر الامرا اسکے قتل کا جال بچھاتا ہے، پانسہ الٹا پڑتا ہے اور خود پھنس جاتا ہے، اور نہایت ذلت سے قید خانہ میں جان دیتا ہے،

امیر الامرا اور قطب الملک اب بادشاہ گر کا لقب حاصل کرتے ہیں،

رفیع القدر کا چھوٹا بیٹا رفیع الدرجات قید خانہ سے نکلتا ہے اور پوشاک بدل کو گلے میں موتیوں کا ایک ہار ڈالکر تخت دہلی پر جلوس کرتا ہے، سادات کا سلطنت پر قبضہ ہوتا ہے۔ سید حسین علی خاں اور سید عبداللہ خاں قطب الملک خزانۂ شاہی پر متصرف ہوتے ہیں اور آخر یہ پندرہ سالہ دائم المرض شاہزادہ تین مہینے کی برائے نام حکومت کے بعد دنیا سے رخصت ہوتا ہے،

قطب الملک اور امیر الامرا رفیع الدرجات کے دوسرے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھاتے ہیں۔ محمد اکبر بن عالمگیر کا چھوٹا بیٹا نیکوسیر قلعہ اکبرآباد سے نکلکر رفیع الدولہ کے مقابلہ کو اٹھتا ہے، امیر الامرا اور قطب الملک رفیع الدولہ [illegible] اکبرآباد آتے ہیں اور نیکوسیر شکست کھاکر محبوس ہوتا ہے، اس نقل حرکت [illegible] رفیع الدولہ بیمار پڑتا ہے اور بستر پر جان دے دیتا ہے۔

امیر الامرا اور قطب الملک تخت نشینی کے لیے بہادر شاہ اول کے پوتے اور [illegible] کے بیٹے روشن اختر کو قلعہ سلیم گڑھ سے بلواتے ہیں رفیع الدولہ کی [illegible] روز کے بعد دار السلطنت کو پہونچتا ہے اور اپنے تئیں محمد شاہ [illegible] مشہور کرتا ہے یہ کل انقلابات اورنگ زیب سے لیکر اسوقت [illegible] تیرہ برس میں ہوتے ہیں۔

[illegible] شاہ گو ہندوستان کا شہنشاہ کہلاتا ہے لیکن سادات کے پنجہ میں [illegible] ہے یکایک ہندوستان میں ایک نیا انقلاب ہوتا ہے نظام الملک [illegible] صوبہ دار حیدرآباد اور امیر الامرا و قطب الملک میں عداوت بڑھتی ہے۔

سادات کا آفتاب اقبال معتدل النہار کمال سے زوال پذیر ہوچکا ہے، محمد شاہ [illegible] ہوتا ہے اور نظام الملک کو اشارہ کرتا ہے، قطب الملک اور امیر الامرا نظام الملک کے مقابلہ میں فوج پر فوج بھیجتے ہیں اور شکست اٹھاتے ہیں،

آخر قطب الملک اور امیر الامراء غصے سے بادشاہ کو ساتھ لیکر خود اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دار السلطنت سے نکلکر قطب الملک آگے بڑھ جاتا ہے اور محمد شاہ کے اشارہ سے امیر الامرا پالکی میں مارا جاتا ہے، تمام لشکر میں ایک عام غدر ہوتا ہے۔ سادات اور شاہی فوج میں ایک خونریز جنگ ہوتی ہے اکثر امرائے سادات مارے جاتے ہیں قطب الملک اپنے بھائی امیر الامراء اور اپنے خاندان سادات کا حال سنتا ہے اور بدحواس ہوجاتا ہے ادہر سے شاہی فوج اور ادہر سے نظام الملک کو دیکھکر غریق تفکر ہوجاتا ہے۔ اور التوائے جنگ مناسب سمجھکر ٹھہر جاتا ہے اور پھر فوج جمع کرتا ہے اور محمد شاہ کو چھوڑ کر رفیع القدر کے بیٹے محمد ابراہیم کو بادشاہ بناتا ہے اور نوے ہزار کی جمعیت سے محمد شاہ کے مقابلہ کو نکلتا ہے حسن پور میں دونوں فوجیں ملتی ہیں؛ دو دن ایک رات ہنگامہ کارزار گرم رہتا ہے، قطب الملک وقت دیکھکر ہاتہی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور شاہی فوج پر حملہ کرتا ہے، قطب الملک کی فوج جب قطب الملک کو ہاتہی پر نہیں دیکھتی ہے تو اوسکو مردہ جانکر بھاگ کھڑی ہوتی ہے قطب الملک اور اسکا بھائی نجم الدین علیخاں تنہا میدان میں کھڑے رہتے ہیں اور آخر زخمی ہوکر مقید ہوجاتے ہیں ابراہیم شاہ بھی گرفتار ہوجاتا ہے اور اب محمد شاہ اپنے تئیں ہندوستان کا مستقل شہنشاہ سمجھتا ہے،

لیکن اس اطمینان سے وہ دوسرا فائدہ اُٹھاتا ہے وہ عیش و طرب کی ایک مجلس ترتیب دیتا ہے۔ اور انتظام سے غافل ہوکر اپنے مصاحبین کے جھنڈ میں تفریح و طرب میں مصروف رہتا ہے، نظام الملک حیدرآباد سے آکر قلمدان وزارت ہاتھ میں لیتا ہے سلطنت کی اصلاح کرنا چاہتا ہے لیکن دربار کا عجب رنگ پاتا ہے، جہاں ہر شخص فرعون نظر آتا ہے،

اورنگ زیب کا یہ قدیم سپہ سالار محمد شاہی دربار میں اورنگ زیب اور شاہجہاں جیسا رعب اور متانت ڈھونڈھتا ہے لیکن شاہی مصاحبین میں ایک عام بے رعبی اور طوفان بدتمیزی دیکھتا ہے۔ وزیر نظام الملک کی جواں ہمتی کو دیکھکر دربار کے مسخرے اوسکو بندر کہتے ہیں، نظام الملک کہتا ہے ہاں میں بندر ہوں لیکن اگر اس بندر کا کہا نہ مانا تو اس قلعہ کے کنگرے پر نظر آئیں گے، آخر نظام الملک اصلاح سے مایوس ہوکر حیدرآباد واپس چلا جاتا ہے۔

نادرشاہ ایران سے سمرقند کی تادیب کو آتا ہے محمد شاہ کو نامۂ شوق لکھتا ہے لیکن محمد شاہی دربار سے جواب نہیں جاتا، نادرشاہ پھر لکھتا ہے پھر جواب نہیں جاتا نادرشاہی سفیر دربار میں آتا ہے۔ محمد شاہ کے مصاحبین عین دربار میں اوس سے استہزا کرتے ہیں، سفیر رنجیدہ واپس جاتا ہے، نادرشاہ پھر ایک سفیر دس سواروں کے ساتھ بھیجتا ہے سوار جلال آباد میں مار ڈالے جاتے ہیں، ایک شخص بچکر نکل جاتا ہے اور نادرشاہ سے اپنی داستان بیان کرتا ہے نادرشاہ غصہ سے آگ بگولا ہو جاتا ہے، اور آندھی کی طرح ہندوستان کا رخ کرتا ہے،

مرہٹے دکن سے باہر نکلتے آتے ہیں بھوپال تک آچکے ہیں نظام الملک بھوپال میں باجی راؤ سے صف آرا ہوتا ہے کہ یکایک نظام الملک کو نادرشاہ کی خبر پہونچتی ہے۔ وہ اسوقت دوطرفہ دشمنوں سے پریشان ہو جاتا ہے مصلحت جانکر باجی راؤ سے صلح کرلیتا ہے اور دارالحکومت کا رخ کرتا ہے کبھی خیال کرتا ہے کہ اس غافل بادشاہ اور بدتمیزی کے دربار کی تذلیل ہی بہتر ہے پھر اپنی قدیم وفاداری پر نظر ڈالتا ہے اور منزلیں مارتا ہو دہلی پہونچتا ہے

نادرشاہ سمرقند سے بڑھتا ہوا کابل پہونچتا ہے، کابل کا حاکم ناصر خاں جنگ کا منصوبہ باندھ رہا ہے کہ وہ نادرشاہ کے ہاتھ گرفتار ہو جاتا ہے پھر نادرشاہ

آگے بڑھتا ہے۔ پشاور ہوتا ہوا دریائے اٹک سے اتر کر پنجاب میں وارد ہوتا ہے
وقتل وغارت کرتا ہوا دو مہینے میں کرنال پہونچتا ہے۔ پرچہ نویس دربار حکومت کو
نادرشاہ کی اطلاع دیتے ہیں، عرائض بھیجتے ہیں، محمد شاہ ایں دفتر بے معنی غرق
مئے ناب اولیٰ، کہکر ان کاغذات کو شراب میں ڈالدیتا ہے۔ نادرشاہ جب دہلی سے
صرف چار منزل پر رہجاتا ہے تو محمد شاہی دربار کی آنکھیں کھلتی ہیں نظام الملک
کے خلاف مرضی محمد شاہ کی طرف سے امیر الامراء صمصام الدولہ، اور برہان الملک
نادرشاہ کا سامنا کرتے ہیں۔ امیر الامراء مارا جاتا ہے برہان الملک قید ہوجاتا ہے
برہان الملک کو جب امیر الامراء کے مرنے کی خبر پہونچتی ہے تو خوش ہوتا ہے
اور اپنی امیر الامرائی کی توقع کرتا ہے،

اور اسی امید پر نادرشاہ سے دو کرور روپے پر صلح کی گفتگو کرتا ہے، تمام
صلح کیلیے نظام الملک آصفجاہ جاتا ہے، نظام الملک اپنے حسن تدبیر سے
اسکو انجام دیکر واپس آتا ہے، اور بادشاہ خوش ہوکر اسکو امیر الامرا بناتا ہے
محمد شاہ بادشاہ کی ملاقات کو جاتا ہے، نادرشاہ اپنے بیٹے مرزا نصر اللہ
کو استقبال کیلیے بھیجتا ہے۔ آپ رواں سے اتر کر محمد شاہ مرزا نصر اللہ
کو گلے لگاتا ہے۔ جب دربار میں پہونچتا ہے، نادرشاہ تالب فرش
استقبال کو بڑہتا ہے، اور اپنے ساتھ مسند پر بٹھاتا ہے اور پہر
رخصت ہوتا ہے،

برہان الملک جب آصف جاہ نظام الملک کی امیر الامرائی کا حال
سنتا ہے۔ رشک سے جل بھن جاتا ہے، اور نادرشاہ سے کہتا ہے کہ دہلی
کے خزانہ کے لیے دو کرور کچھ نہیں ہیں، نظام الملک بلایا جاتا ہے
نادرشاہ اوسکو محمد شاہ کے بلانے کا حکم دیتا ہے۔ نظام الملک عذر کرتا ہے

نادرشاہ نہیں سنتا، بالآخر نظام الملک، محمد شاہ کو بلاتا ہے، محمد شاہ چار و ناچار آتا ہے، اور اپنے خدم و حشم کے ساتھ تھوڑی دیر دوسرے خیمہ میں روکا جاتا ہے، اس سے خزانہ کی کنجیاں طلب کی جاتی ہیں، آخر محمد شاہ لطف اللہ خاں، نائب دہلی کو، خزانہ کی کنجیاں حوالہ کرنے کا حکم کرتا ہے شاہ دہلی کی طرف سے نمک حرام برہان الملک اور نادرشاہ کی طرف سے طہماسپ خزانہ کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ تیموری سلاطین کی تمام نادر اور قدیم یادگاریں دہلی سے رخصت ہورہی ہیں +

پھر محمد شاہ اور نادرشاہ دہلی کو روانہ ہوتے ہیں عید الضحےٰ آتی ہے، شاہی کروفر سے ایرانی و ہندوستان کے فرماں روا عیدگاہ جاتے ہیں ... کی لاکھوں مخلوق صحن مسجد میں اللہ اکبر کہہ کر نماز کو اٹھ کھڑی ہوتی ہے ... دیکھکر کہ شاہ و گدا و ... کی گردنیں اوس بڑے شاہنشاہ کے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ خدا کی عظمت کا ایک عجیب جلوہ نظر آتا ہے،

نماز تمام ہوتی ہے اخطیب اٹھ کر اپنا خطبہ شروع کرتا ہے، محمد شاہی ... منتظر ہے کہ کب خطیب السلطان ابن السلطان الخاقان الاعظم ... دشمن اختر محمد شاہ الغازی کہتا ہے لیکن خطیب کہتا ہے تو یہ ... ہے سلطان السلاطین خاقان الخواقین معز الدین نادرشاہ الغازی ... پہلا موقع ہے کہ تیموری شاہنشی کے نام سے دہلی کی مسجدیں نہیں گونجتیں

دوسرے دن سرشام نادرشاہ کی موت کی خبر شائع ہوتی ہے۔ دہلی کی شمشیر انتقام نیام سے نکل آتی ہے اور رات کے بارہ گھنٹوں میں سات سو ایرانی گردنیں اپنے بدن سے الگ ہوجاتی ہیں۔

نادرشاہ کو اس کی خبر ہوتی ہے اور وہ غصہ سے آگ بگولا ہوجاتا ہے

اور طیش میں اوس کی زبان سے قتل عام کا لفظ نکلتا ہے العظمۃ للّٰہ شاہجہاں کی دہلی لٹ جاتی ہے، ہندوستان کی عروس البلاد خونی پوشاک پہن لیتی ہے گلی کوچہ میں خون کی نہریں جاری ہوجاتی ہیں۔ بابر اور اکبر اعظم کے جاہ و جلال کا تخت ایک ایرانی قزاق کے قدم کے نیچے ہوجاتا ہے اور اورنگ زیب عالمگیر کے شکوہ و دبدبہ کا آفتاب قزلباشوں کی خون آشام تلواروں کی شفق میں چھپ جاتا ہے۔ آخر نظام الملک دست بستہ عرض کرتا ہے ؎

کسے نماند کہ اورا بہ تیغ ناز کشی　　مگر بہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

برش سپیدت کہکر نادرشاہ بقیۃ السیف کو امان دیتا ہے۔ دہلی کو لوٹ کسوٹ کر جب واپس جاتا ہے تو تیموری نسل کی شاہزادی اپنے بیٹے نصر اسد خاں کے نکاح میں لیتا ہے، اور رخصت کے وقت اوس شاہنشاہ کے بیٹے کو خلعت دیتا ہے جسکے خلعت کی ایک دنیا تمنا کرتی ہے +

نادرشاہ کی واپسی پر محمد شاہ اپنی مکردہ فتح تا شکست کی عام خوشی مناتا ہے، نظام الملک حیدرآباد چلا جاتا ہے اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں مسند وزارت پر جلوہ آرا ہوتا ہے اور آٹھ برس تک ہندوستان کا مطلع حملوں کے گرد و غبار سے پاک و صاف رہتا ہے کہ ۱۱۶۱ھ میں یکایک خیبر کے دروں سے احمد درانی کی سرکردگی میں پھر ایک قہر آشوب فوج نکلتی ہے،

احمد شاہ نعتی خاں آغہ کو لیکر تقریبًا چہتر ہزار فوج سے لدہیانہ سے بالا بالا سرہند پہونچتا ہے۔ محمد شاہ اپنے لڑکے احمد شاہ کو اعتماد الدولہ وزیر الملک کے ساتھ ایک گراں فوج و توپخانہ دیکر روانہ کرتا ہے۔ شہزادہ احمد دریائے ستلج پر آکے مورچہ زن ہوتا ہے اور ۱۵ ربیع الاول سے ۲۰ دن تک دونوں فوجیں ہنگامہ آرا رہتی ہیں +

بائیسویں کی دوپہر کو وزیرالممالک اپنے خیمہ میں نماز پڑھتا ہے کہ درانی توپوں سے ایک گولہ آکر پھٹتا ہے اور وزیرالممالک جان دیتا ہے۔

تئیسویں کو آخری معرکہ ہوتا ہے۔ دونوں طرف کے بہادر زور آزمائی میں مشغول ہوتے ہیں کہ یکایک درانی فوجوں میں ایک آگ نمودار ہوتی ہے اس کے شعلے مشتعل ہوتے ہیں اور ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ ناچار درانی فوجیں نہایت بے ترتیبی سے پیٹھ پھیر لیتی ہیں اور کابل کا رخ کرتی ہیں۔

محمد شاہ ایک کان سے تو فتح کی خوشخبری سنتا ہے مگر دوسرے کان میں [illegible] ہے میں آ پہونچی، شاہزادہ کی طلب کو قاصد بھیجا جاتا ہے۔ شہزادہ باپ کی شدت مرض کو سنکر دہلی کا رخ کرتا ہے، پانی پت پہونچکر سنتا ہے کہ باپ تیس برس سلطنت کر کے ستائیس ربیع الآخر کو مر گیا + باقی

سید سلیمان ندوی

عید

یہ تو بعض احباب کی خواہش ہی تھی کہ تمدن کا عید نمبر نکالا جائے لیکن اب بقرعید نمبر کے واسطے تجویز بھی ہے استفسار بھی اور اصرار بھی۔ دل ٹھکانے ہوں تو ہر روز عید اور ہر رات شبرات ہو ورنہ شام عید بھی روز محرم سے کم نہیں۔ اٹلی کے مظالم نے طرابلس میں جو کچھ کیا اسکو یاد کر کے بہت کم مسلمان ایسے ہوں گے جو اس بقرعید کو ادائیگی فرض سے زیادہ وقعت دیں۔ معزز معاصر کامریڈ تیسری نومبر کے ایک تار کو جو لندن سے ایک نامہ نگار نے دیا اس طرح نقل کرتا ہے کہ "میں عربوں کے ایک گانو میں سے گذرا اور ایک ایسے خاندان کو دیکھا جو تمام مردہ پڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی بچی نے اپنا چہرہ ایک صندوق میں اس لیے چھپالیا ہے سکو دیکھو

ہم علانیہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے پہلو میں وہ دل ہے جو اپنے ان کے مستے بھائیوں اور بہنوں پر خون کے آنسوؤں سے رو رہا ہے۔ جو تاراج اور خانماں برباد ہو گئے

[illegible]

اضطراب روح

تو کس کے ہجر میں زار و نزار ہے ای روح؟
بتا تو کس کے لیے بے قرار ہے اے روح
تو ہو رہی ہے یہ بیزار اپنے مسکن سے
کہ نکلی پڑتی ہے رہ رہ کے خانۂ تن سے
یہ بیقراریوں میں ترا لب تلک آنا!
نہ پا کے راستہ مایوس پھر پلٹ جانا!
تو لب پہ آئی ہے کرنے کو کس کا استقبال؟
یہ کس کے ہجر میں تو حال سے ہوئی بے حال؟
یہ زاد بوم کو چلنے کی سعی بے حاصل!
یہ قید تن سے نکلنے کی سعی بے حاصل!
ہے تیرے کندھے پہ کیوں بار یہ تن لاغر؟
بگاڑ ہمدم دیرینہ سے ہوا کیونکر؟
تری نگاہ میں ہے گلشن جہاں کیوں خار؟
بتا کہ تجھ کو ہے کس گل کی حسرت دیدار؟
بتا کہ رہتی ہے تو بے قرار کس کے لیے؟
تڑپ رہی ہے تو سیماب وار کس کے لیے؟
بتا مجھے بھی کہ ہے کس کی طالب دیدار؟
کھٹک رہا ہے ترے دل میں آہ کیسا خار؟

یہ درد کیسا ہے دل میں ترے خلش کیسی؟
یہ ٹیس کیسی جگر میں ہے۔ یہ تپش کیسی؟

وہ ہونٹھ پنکھڑیوں سے۔ وہ ابھرے ابھرے گال
وہ انکھیں بھنورا سی اور نرم نرم یہ بال
تھی تیرے مرنے پہ بھی کس غضب کی رعنائی!
ہمیں یہ ہوتا تھا معلوم اب ہنسی آئی
وہ ہنس کے میرے گلے سے ترا لپٹ جانا
تمام غصہ و غم کا وہیں پلٹ جانا۔
وہ اسکے سر سے مرے کھینچنا ترا چادر
وہ تنگ کر کے اٹھانا مجھے بوقت سحر
مجھے نہ پا کے ترا رونا اور گھبرانا
تمام رات نہ سونا نہ کچھ قرار آنا
ہماری انکھوں میں چھایا ہے اف وہی نقشہ
وہی ہنسی وہی شوخی۔ وہی لب و لہجہ
خدا دکھائے نہ دشمن کو ایسا نظارہ
کہ دو دو تا انکھوں سے ہو جائے انکھوں کا تارا
یہ چرخ پیر کسی پہ نہ یہ ستم توڑے
پلے جو انکھوں میں آغوش میں وہ دم توڑے

[illegible]

ہے مرا طوق زندگی بیاری۔ ...

مسٹر ابلیس

(۳)

(سلسلہ کے لیے جولائی سنہ ۱۹۱۱ء کا تمدن ملاحظہ ہو)

مسٹر ابلیس – وہی نخوت وپندار کا مجسم شریر بار مسٹر ابلیس۔ وہی قہر ایزدی کے سنگِ آتش اور چقماقِ تکبر و نافرمانی کے تصادم سے پیدا ہوا ہوا لالا شرارہ مسٹر ابلیس۔ شہر... کے ایسے حصہ میں جو زیادہ تر متوسط درجہ کے اشخاص سے آباد تھا، اپنی رفتار فتنہ انگیز کے ساتھ چاروں طرف غور بیں نظر ڈالتا ہوا سُرخ سرخ آنکھوں سے نکلنے والی خون آلود نظر ڈالتا ہوا۔ برابر چلا جا رہا تھا! اس کے کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں، کہ وہ دنیا کے ہر متنفس کو۔ ہر نفس امارہ رکھنے والے جاندار کو، ممنوعاتِ شرعی کیطرف۔ بدی[۱] اور بے حیائی کیطرف۔ مائل کر دینے کی اُمیدِ قوی رکھتا تھا! اور اس کے بیان کرنے کی بھی حاجت نہیں، کہ وہ اِس فانی وسعت آبادِ جہاں کے[۲] محبت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے دِلوں کو۔ بادام دو مغز در یک پوست، کیطرح رہنے والے دلوں کو۔ ایک آن نہیں دیکھ سکتا تھا اور اپنی قوت تفرقہ پردازی کی ناقابل مقابلہ چوٹ کے ساتھ۔ پوستِ یگانگت و محبت کو چورا چورا کر کے ایک کو دوسرے سے جدا کر دینا، باہم فساد پیدا کر دینا، اپنا فرضِ عین

سلہ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ = وہ تمہیں بدی اور بے حیائی ہی (کے کام کرنے) کو کہے گا۔ (پارہ ۲۔ سورۃ بقر رکوع ۲۱)

سلہ إِنَّ الشَّيْطٰنَ...... مُبِينًا = کیونکہ شیطان لوگوں میں فساد ڈلواتا ہے اور وہ انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے (پارہ ۱۵۔ بنی اسرائیل رکوع ۷)

سمجھتا تھا! اسی لیے جب کبھی اُس کی نظر۔ خباثت آمیز اور خونریز نظر کسی نفس امارہ کا سر کچلتے رہنے والے انسان کو دریافت کرلیتی: دریافت کرلیتی اور یہہ بھی معلوم کرلیتی، کہ اُس کی ذریات کے انچھر۔ اُس کے شاگردانِ علیہ اللعن کے پراد تنزویرافسوں۔ اُس راسخ الاعتقاد شخص پرکارگر نہیں ہوتے: تو وہ خود۔ بہ نفس لعین اپنی ہستی دوزخ تاب کے ناقابل برداشت شعلوں کے ساتھہ، اُس مشتِ استخواں کو پگھلانے کے لیے تیار ہوجاتا!!

اس وقت وہ ایک ایسے مکان کے سامنے ٹھٹکا جو اس شہر کے ایک معمولی حیثیت کے تاجر کا مکان تھا! وہ ٹھٹکا تو سہی مگر کچھہ زیادہ دیر نہیں ٹھٹکا: کیونکہ اُس کی قوت تلبیس نے۔ اشہبِ شبکیاز اندیشہ سے بھی زیادہ تیز قوت تلبیس نے۔ چشم زدن میں جو کچھہ وہ دریافت کرنا چاہتا تھا بتا دیا۔ اور مسٹر ابلیس مسکراتا ہوا اپنے دہانِ آتش فشاں سے چنگاریاں اُڑاتا ہوا۔ فوراً اندر پہونچ گیا! یہہ تو صاف ظاہر ہے کہ ہر ابلیس مرید کو۔ ہر خود مختار سریر آرائے شیطنت کو۔ جہاں قسّام ازل کے فیاض ہاتھہ نے بندگانِ خدا کے سخت سے سخت امتحان لینے کے لیے اور عجیب وغریب طاقتیں عطا کی تہیں، وہاں یہہ قوت بھی عنایت فرمائی تہی کہ ہر مردودِ بارگاہ لم یزلی، انسان کی آنکھوں سے۔ اصل شئے کو چھوڑ کر محض پردۂ شبکیہ پر مرتسم ہونے والے عکس کو دیکھنے والی ناچیز قوتِ باصرہ سے۔ پوشیدہ[ا] اور غائب رہکر، جہاں چاہے جا سکتا تہا،

[ا] اِنَّہٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ط۔ وہ ابلیس اور اُس کی ذریات تکو (تم کو) اُدھر سے دیکھتے رہتے ہیں جدھر سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔

(پارہ ۸۔ سورہ اعراف رکوع ۲)

اور جو چاہے دیکھ سکتا تھا! مسٹر ابلیس بھی اسوقت اسی قوت منصبی کی امداد سے۔ اسی یکے بعد دیگرے ورثہ میں متصل ہونیوالی قوت منصبی کی امداد سے۔ بیک جنبش جسم ناری، اس مکان کے ایک ایسے کمرے کے اندر تھا جسکے کواڑ کسی نے پہلے سے بھیڑ رکھے تھے!!

اس کمرے کا فرنیچر بیش قیمت تو نہیں تھا مگر ایک سلیقہ شعار ہاتھ اور تعلیم یافتہ دماغ کا پتہ ضرور دے رہا تھا! اس سمت جدھر مسٹر ابلیس اپنے غائب از نظر رنگ میں کھڑا تھا۔ تھا اور نہیں تھا۔ ایک خوشنما مسہری بچھی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف زمین تک لٹکنے والا لوٹ جالی کا کڑھا ہوا اور صاف ستھرا پردہ "موسکیٹو نٹ" کا کام دے رہا تھا!۔ کمرے کے طول میں کئی بادامی روغن والی ایزی چیرز، اور کئی بید کی خوشنما تکیہ دار کرسیاں مع اپنے خوبصورت پھولدار گدوں کی بچھی ہوئی تھیں! سامنے والی دیوار میں ایک کارنس تھی اور اسپر عین وسط میں مائنروا[ط] کا مجسمہ۔ یونانی علم کی دیوی کا چھوٹا سا خوبصورت بت۔ اپنے کندھوں پر ایک ٹائم پیس لیے کھڑا تھا! اس کے دونوں طرف دو خوشنما گلدان اور دو نازک اور اعلیٰ درجہ کی دستکاری والے لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے رکھے تھے! کارنس کے دونوں کونوں پر سید علیہ الرحمۃ اور محسن الملک مرحوم کی تصویروں کے سوائے۔ جن میں سے ہر ایک المیونیم کے چمکتے ہوئے فریم میں محفوظ تھی۔ اور کچھ نہ تھا! اسی دیوار کے بقیہ حصہ میں، ذرا بلندی پر، لکڑی کے بیلدار چوکھٹوں میں کئی اعلیٰ درجہ کی سبز دلکش اور نظر فریب مناظر کی بڑی تصویریں لگی تھیں: اور ان سب کے اوپر سنہری

ط menerva.

بیضاوی چوکھٹے میں ایک خوبصورت نوجوان کا بسٹ تہا، اور بس! کمرے کی دوسری سمت ایک چھوٹی سی مستطیل کالی میز لگی تھی جسپر سبز بانات چڑہی ہوئی تھی یا اوپر سے رُخ جھکی ہوئی تھی! اسی میز پر - دونوں طرف مختلف کتابیں مجلد اور غیر مجلد، ضخیم اور پتلی، نہایت احتیاط کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں، بلکہ کھڑی ہوئی تہیں! اسکے سیدھے ہاتھ کیطرف ایک انگریزی وضع کا قلمدان - دوات - اور پنسل رکھنے کا سٹینڈ - شیشے کی دوات اور نئی انگریزی قلم لیے ہوئے نظر آتا تھا، اور اس کے برابر ہی کچھ سادے کاغذ اور ایک روزانہ اخبار لوہے کے پیپر ویٹ سے دبے ہوئے تھے! اسکے ہاتھ کیطرف چھ انچ اونچا کیوپڈ[1] کا سٹیچو عشق کا بھولا بھالا تیر انداز اپنی تیر و کمان کے ساتھ - اپنے سر پر چھوٹی سی پیالی سگرٹ اور سگار کی راکھ اٹھانے کے لیے، رکھے ہوئے کھڑا تھا! میز کے سامنے سیاہ بنٹ وڈ چیر، پر - بید نما مڑی ہوئی لکڑی کی کرسی پر، ایک نوجوان حسین لڑکی کسی خاص خیال میں مستغرق بیٹھی تھی!! اس حسین لڑکی کے متفکر اور پریشان مہ جبین کے - اُسکے اُلٹے ہاتھ کی کہنی میز پر ٹکی ہوئی تھی، اور وہ اسی ہاتھ پر زور دیے ہوئے اسی ہاتھ پر جھکی گاؤدم نرم نرم انگلیاں جھکتی ہوئی پیشانی سے گذر کر سیاہ گھونگر والے بالوں تک پہنچی ہوئی تھیں، اپنا عارض آئینہ آسا رکھے ہوئے آگے جھکی ہوئی اور کسیقدر سیدہی طرف مڑی ہوئی غم و شکستہ دلی کے سمندر میں شناوری کر رہی تھی؛ سیدھا ہاتھ، بے حس و حرکت، سامنے والے روزانہ اخبار پر رکھا ہوا تھا! یہ ہی تہا وہ خیال

[1] Cupid

جس کی تحریر نے۔ آج کے پرچہ کی جانکاہ خبر نے۔ اس حسین نازنین کو عجیب کشمکش میں۔ ناممکن الاظہار الجھن میں۔ مبتلا کر رکھا تھا!

وہ بار بار اپنے خیالات کی باگ روک کر۔ یاس و الم کے چھائے جانے والے غبار کو دور کرتے ہوئے۔ امید کی روح پر در جھلک دیکھنی چاہتی تھی؛ وہ طرح طرح سے اپنی سر پیٹنے والی حسرتوں کو سمجھا کر مچلنے والے ارمانوں کو تھپکتے ہوئے۔ دم توڑنے والے دل کو دلاسہ دینا چاہتی تھی! مگر کہاں؟ وہ جب کبھی دیوار پہ لگے ہوئے لسٹ پر نظر ڈالتی ایک شعلہ۔ جلتا ہوا۔ بھڑکتا ہوا شعلہ۔ اس کے سینے سے اٹھتا اور اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا! وہ گھبرا کر منہ پھیر لیتی اور اب کیوپڈ کا مجسمہ سامنے تھا: وہ جسوقت اس دیوتا کیطرف دیکھتی ایک تیر۔ تیز اور زہر میں بجھا ہوا تیر اسکی آنکھوں سے اتر کر اس کے دل و جگر میں ترازو ہو جاتا! آہ! وہ گھبراتی، وہ پریشان ہوتی، وہ انتہائے کوشش کے ساتھ سنبھلنا چاہتی؛ مگر اس کا سانس گلے میں اٹکتا تھا؛ اس کا دل مجروح دل، زخمی دل شکستہ دل سینہ کی قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا! تڑپتا تھا، تڑپتا تھا اور تڑپتا تھا!!!

کیوں؟ اس لیے کہ روزانہ اخبار کی عبارت جو کچھ کہہ رہی تھی، صاف صاف کہہ رہی تھی: اس میں کوئی دہوکا کوئی شبہ نام کو بھی نہ تھا:

نہایت مسرت کے ساتھ ہم اعلان کرتے ہیں کہ مسٹر ایس[1]۔ ایم۔ شا ایم۔ اے (کینٹب) کے سچے دل کی قدر کی گئی اور کرنل پیر[2]سن لمز

---

[1] ان حضرت کا اصلی نام سید منیر شاہ تہا اس لیے اسکو انگریزی جلا دینے میں کچھ زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ اب وہ اپنا نام S. m. Shaw لکھتے تھے۔ [2] یہ نام دراصل

کی اکلوتی لڑکی جس وقت مس نانا[۵۱] ریمرے ۔ سے نے پیش کردہ چھلے کو زیب انگشت کر لیا الیقین ہے کہ مسٹر ایس ۔ ایم ۔ شا کے حلقۂ تعارف کو اُن کی شادی پر مبارکباد دینے کا موقع آیندہ گرمیوں میں ملجائیگا، جبکہ ہمارے معزز کامیاب نوجوان اپنے ماہِ شہد[۵۲] کا لطف اُٹھانے کسولی یا مسُوری تشریف لیجائیں گے!"

یہ تھی وہ دلکش خبر جسنے اس ناتجربہ کار نازنین کے نخل آرزو کے ساتھ بجلی کا کام کیا تھا؛ اُس کی حسرتوں کو پامال کر دیا تھا؛ اُس کی دلی تمنا کو ۔ امید کی آغوش حمایت میں پلنے والی تمنا کو ۔ جڑ سے کاٹ ڈالا تھا! وہ اِس کو پڑہتی تھی اور بار بار پڑہتی تھی: سمجھتی تھی اور طرح طرح سے سمجھتی تھی؛ لیکن ناکامی اور ناامیدی کی بھیانک تصویر کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکتی تھی، اور فریب و مکاری کے جانگداز الفاظ کے سوا اور کچھ نہ سن سکتی تھی! مسٹر ابلیس اس خاص اثر کو دیکھ کر ۔ اس شریف دل کو توڑنے والے نظارہ کو دیکھکر، اس اچانک غم کے پہاڑ کے ٹوٹ پڑنے کو دیکھکر ۔ انتہائے مسرت کے ساتھ اُچھل رہا تھا، مکر و فریب کی کامیابی پر اپنی تمام

[۵۱] ۔ ریمزے تو وہی رمزی کی مسخ شدہ شکل ہے اور نانا اسطرح حاصل ہوا کہ بلقیس بیگم کو پہلے ننھو کہا کرتے تھے، اُس ننھو کو نانا کا لباس پہنا دیا گیا اور آخر میں یورپ کے قاعدہ کیموافق باپ کا نام شامل کرکے Nina Ramsay بنالیا الہدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آیا!

[۵۲] ماہ شہد Honey moon کا لفظی ترجمہ سمجھیے: چاند میں شیرینی تو پیدا ہوگئی، مگر ڈر اس بات کا رہا کہیں اس میٹھے چاند کی چاندنی پر مکھیاں نہ بھنکیں اور چیونٹیاں نہ چڑھیں!! ۔ ۱۲

خواہشات طبیعت کے ساتھ ناچ رہا تھا، اور ہوا سے ملنے والے شعلۂ آتش کے مانند ایک ٹانگ اٹھا کر تھرک رہا تھا!!

"کیا یہ وہی ایس۔ ایم۔ شاہ ہے جو اب تک برابر محبت آمیز تحریر و تقریر میں بے تابیٔ دل کا یقین دلانے والی تحریر و تقریر میں۔ اس کمسن نازنین کو میری پیاری میرے دل کی مالک، کے خطاب سے یاد کرتا رہا ہے؟"..... ہاں وہی!.... "کیا اسی مکاری اور غارتگری کو وہ محبت جیسے پاک جذبہ کے نام سے پکارتا ہے: کیا اسی تہذیب و تعلیم کی آڑ میں ننگ و ناموس کا شکار کرنے کو۔ اپنی جھوٹی محبت کے جادو سے ایک غیور دل کو زندہ درگور کرنے کو۔ وہ عشق و سچائی سے تعبیر کرتا ہے؟"..... ہاں اسی کو!!... ..."کیا ایسے ہی خودغرض اور بے ایمان، شکاری کتے پر لائق اور معزز انسان کا اطلاق ہو سکتا ہے: کیا ایسے ہی کمینہ خصال وحشی پر قربان ہونے کے لیے۔ اس کے از سر تا پا مہمل الفاظ پر نثار ہونے کے لیے آزاد اور ترقی یافتہ طبقۂ نسواں اپنی حیا و عزت کو خیرباد کہہ سکے؟"..... ہاں بے شک ایسے ہی پر!! یہ اور قریب قریب ایسے ہی اور سوالات اس مصیبت زدہ نازنین کے دم توڑنے والے دل سے پیدا ہو رہے تھے: اور یہ اور تقریباً ایسے ہی اور جوابات۔ اکثر ناترش، اور زہر دستی آمیز جوابات مسٹر ابلیس کمسن کے دل و دماغ میں حلول کر کے۔ اپنی قوت شیطنت کی بوقلموں کرشمہ سازی کے ساتھ حلول کر کے خود دے رہا تھا!!

اس غصہ خاطری کی کیفیت میں اس ہجوم یاس و ناامیدی کی حالت میں، "اس آفت زدہ نازنین نے جو ایک متمول اور تعلیم یافتہ نوجوان کے

دام تزویر میں پھنسی ہوئی تھی۔ بلکہ پھنس چکی تھی۔ اپنے روٹھے جانے والے دل کو منانے کے لیے، اپنی مشتعل ہونیوالی طبیعت کو ٹھنڈا کرنے کے لیے، کوئی شغل ڈھونڈھنا چاہا اور بلا کسی خیال کے ایک ایک مجلد کتاب سامنے والی کتابوں میں گھسیٹ لی اور اندھا دھند ایک جگہ سے کھول لی بخت و اتفاق سمجھا جائے یا زندہ کرامت! غرض جو کتاب اس نے بغیر سوچے سمجھے اٹھائی تھی وہ مرحوم حکیم شیراز کا لگایا ہوا باغ تھا جسکی مہک صدیوں بعد بھی آج تک روز اوّل کیطرح قائم تھی! اور جس سطر پر خود بخود سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ اسی حکیم علیہ الرحمۃ کا بجلی اور نصیحت سے بھرا ہوا شعر تھا:۔

"اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد"

۵ ایک آن کی آن میں تمام گذری ہوئی زندگی کا فوٹو اُس کے سامنے آگیا؛ تمام خوش کن، فرحت افزا، گھڑیاں یاد گذشتہ کے لباس میں جلوہ گر نظر آنے لگیں؛ اور تمام روح پرور، پر از جذبات محبت خلوت کے موقعہ، دماغ کے فانوس خیالی میں یکے بعد دیگرے چکر کھانے لگے! اُف! اُس کا سر چکرایا:۔ اُس کا دل بیٹھا! اُس کی طبیعت گری: اور اُس کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگا!!! ایک دل سے اُٹھنے والے بخارات کا بادل دماغ پر چھایا: آنکھوں میں گھٹا: پلکوں پر نکلا: اور دو گرم گرم قطرے۔ صرف دو چلتے اور کھولتے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ سامنے رکھی ہوئی کتاب پر گرے!!!

"قاہ! قاہ!! قاہ!!!" مسٹر ابلیس نے شرور نفس اور تباہی پر جان دینے والے مسٹر ابلیس نے۔ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تضحیک کے ساتھ

قہقہہ مارا، اوراُس یاس وحسرت کے احساس پر۔ اس بیکسی اور صبر سے پیدا ہونے والے شریف جذبہ پر۔ قوتِ آرزو فرمائی کی پوری کوشش کے ساتھ خباثت آمیز اور ہوس انگیز خیالات کا اظہار شروع کر دیا "
قاہ! قاہ!! قاہ!!! - رو! رو! رو!!! - اے بیوقوف لڑکی رو! بیکار! پکار، اور میرے اونے اشارہ پر گردن جھکا دینی والی دنیا میں کسیکو اپنی حمایت پر پکار! قاہ! قاہ! قاہ!! پھر اگر تیری حماقت بھری گریہ و زاری کوئی نہ سنے: تیری بزدلی اور جہالت کی چیخ پکار پر کوئی نہ آسکے تو یقین جان کہ نہ کوئی سنے گا اور نہ آسکے گا۔ تو میری طرف رجوع کر! مجھہ با اختیار فرمانروائے عیش و عشرت کی بارگاہ میں گردن جھکا دے! گردن جھکا دے اور دیکھہ کہ ایک لمحہ میں تمام دنیاوی کروفر، تمام ظاہری آرام و آسائش، اور تمام اس جہان کا اقتدار و تنعم ما ہر ہر قدم پر تیرے بلا گردان ہوتا ہے یا نہیں؟ "

اب اس حسرت نصیب نازنین نے گردن اٹھائی، پیشانی کا بل کھلا بحرِ حسن کی صاف و شفاف سطح پر خط کھینچنے والی موجیں پھیلتے پھیلتے کناروں کی طرف غائب ہو گئیں۔ اور اُس نے ایک گہرا۔ گہرا اور ٹھنڈا۔ سانس لیا!! اب اس دل شکستہ مہ جبین نے سامنے کیطرف دیکھا! آنکھیں اٹھیں اور کھلیں چشم بیمار کی رنجور اور ضعیف نظر کسی نوشق اور کمزور ہاتھہ سے پھینکے ہوئے تیر کی طرح لڑکھڑاتی اور ہچکولے کھاتی چلی۔ اور اسنے اپنی دماغی دوربین سے آنیوالے زمانہ کو۔ تاریک مستقبل کو سکوت کے ساتھہ دیکھنا شروع کیا!! دنیا کی چمکتی اور جگمگاتی چیزیں، اپنی ہمیشہ جیسی دل لبھانیوالی آب و تاب کے ساتھہ چپّہ چپّہ پر موجود نظر

آ رہی تھیں عجیب موثر رنگ میں جھلکرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں! کالنس پر رکھی ہوئی ٹائم پیس کی ٹک ٹک زمانہ کج رفتار کی بے پرواہ چال کے ساتھہ اپنی دونوں سوئیوں کو ہر ساٹھہ منٹ کی سرگردانی میں صرف ایک مرتبہ کچھہ سیکنڈ کے لیے ہم آغوشی کا موقع دینے والی ٹک ٹک برابر اپنے ختم ہونے والے معمول میں مشغول تھی! اور؟ اور اس خاموشی وسکوت کے عالم میں نہایت دور سے آنیوالی گانے کی آواز اس چپ چاپ لڑکی کے قوت سامعہ کو زبردستی اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی!!

"قاہ! قاہ! قاہ!" مسٹر ابلیس اب اپنی تمام کشش پُر ہوس کی انتہائی کوشش کے ساتھہ اپنے نہ محسوس ہونیوالے اثر کو قوت مسمریزم سے زیادہ کارگر اثر کے اظہار جذبہ پر تلبیس کے رنگ میں برابر ڈال رہا تھا "اے محدود خیالات رکھنے والی ناسمجھ! اے جہالت اور رسم شرافت کے جال میں تڑپنے والی چڑیا! آ سر آت سے کام لے، اپنی گاڑی کا پہیہ خود چلا! حیا وشرم کے پردہ کی دھجیاں کر، صبر وشکر کے بیہودہ اور پوچ خیال کو چھوڑ! عزت آبائی اور ننگ ناموس کے وہم کو نکال، آ اور آزادی کے تخت پر جلوہ گر ہو کر حکمرانی کر! امیرانہ اسلوب اختیار کر اور محکوم سے مجبور حاکم بن! اے کمسن لڑکی سیدھے بھولی بھالی نازنین - اگر کوئی شخص اپنی قابل ستائش چالاکی کے ساتھہ تیری مفروضہ عزت اور موہوم عصمت کے معاملہ میں دہوکا دے، تو بچتا نہیں! افسوس نہ کر! کیونکہ یہہ دنیا ہی جس میں تو رہنا چاہتی ہے محض دہوکا ہی دہوکا ہے! اور دہوکے میں دہوکہ دینا عین عقلمندی ہے! دہوکے کا احساس چھوڑ، مکر و فریب کو مردانہ سمجھہ، اور کسی سے شکست پا کر صبر نہ کر! بلکہ انتہائی بے پرواہی

کے ساتھ تو خود بھی دھوکہ دینے کے لیے کھڑی ہو جا! ایک چالباز مرد کے عوض میں تو بھی ہزاروں مردوں کو اپنے تبسم فتنہ انگیز سے تباہ کر دے اور الگ رہ! ایک دھوکہ دینے والے نوجوان کے انتقام میں تو بھی تمام نوجوانوں کو اپنے اشارہ چشم و ابرو سے تہ و بالا کر ڈال اور کسی کے قبضہ میں نہ آ! آزادی کا لطف اٹھا! عیش و تنعم کے مزے لوٹ! آہا! آہا!! اور اگر اب بھی ایک نادیدہ ہستی کی قائل ہو کر روز جزا کے خیالی پلاؤ کی امید میں حقارت اور ذلت کی زندگی بسر کرنی چاہتی ہے تو روتا رہ، یاس و حسرت سے جلنے والی شمع روا رہ، اور اس وقت تک رو، جبتک کہ تیرا موم جیسا دل پگھل پگھل کر معدوم نہ ہو جائے اور تیری ناچیز ہستی گیسوئے قضا کے اسیر میں سر نہ ٹکراتی پھرے!!" — کچھ عرصہ تک خاموش رہنے کے بعد اس ناتجربہ کار لڑکی کی طبیعت نے کروٹ بدلی، اُس نے گلستان سعدی بند کر دیا، اور ریشمین رومال سے اپنی پرنم آنکھوں کو خشک کیا! وہ اٹھی، غم و غصہ کے عالم میں کرسی کو پیچھے ہٹاتی ہوئی اٹھی، اور غیض و غضب کیساتھ دیوار پر لگے ہوئے بست کو گھور کر "نفرت و انتقام" کہتی ہوئی باہر چلی گئی!!

مسٹر ابلیس نے یمانی اور آرزو فرمائی کی مشینری میں اسٹیم کا کام دینے والا مسٹر ابلیس کامیابی و فتحمندی کے عالم میں اکڑتا اور جھومتا ہوا چلا: چلا اور وہ بھی غلط فہمی کیوجہ سے برا اثر پیدا کرنے والا شعر۔ دور کے گانے کی آوازیں کمسن لڑکی کو اپنی طرف ہمہ تن گوش بنانیوالا شعر۔ جوش تخم ریزی بجا ہو کے۔ یہ گنگناتا ہوا چلا:—

بیار بادہ کہ ایام غم نخواہد ماند چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

سلطان حیدر۔ جوش (علیگ)

گُل

دیکھو ہے صحنِ چمن میں ایک چھوٹا سا نہال — پتیاں ساری ہری ہیں پھول ہیں کیا لال لال
ایک گل ہے اسکی چوٹی پر نہایت شوخ رنگ — جسکی رنگت دیکھنے سے عقل ہو جاتی ہے دنگ
کوئی چھوٹی سی ہے پتی اور ہے کوئی بڑی — کسقدر نازک ہے اسکی دیکھئے ہر پنکھڑی
شاخ پر اس گل کی جنبش کسقدر دیتی ہے زیب — پتیوں کی سرخ رنگت ہے نہایت دلفریب

خود ہے اپنے حسن کے اوپر ہنسی آئی ہوئی
شوخ رنگت سے مگر صورت سے شرمائی ہوئی

صبح کا ہے وقت شب کی اوس ہے پھیلا ہوا — چھوٹے چھوٹے قطرے شبنم کے ہیں ابتک جابجا
اوس کے قطرے نہیں ساری موتیوں کی ہے چمک — چکنی چکنی پتیوں پر خوشنما ہے کیا ڈھلک
رنگ ہے اسکا یہ بالکل عارضِ رنگیں کا رنگ — ملتا جلتا ہے حسینوں کے رخ روشن کا ڈھنگ

پتیوں پر کیس غضب کی ہے ملاحت دیکھئے
ہیں شب نعلین کی تصویریں الٹ دیکھئے

قطرے شبنم کے چمک میں صورتِ دُرِّ عدن — دیکھئے صاف آیا ہے نظر نازک دہن
اوس کے قطرے ہیں کہ پوشیدہ کہ دل میں راز ہے — خندۂ دندان نما کا سربسر انداز ہے
ہیں یہی باتیں جسے غالب نے دیکھا غور سے — اور لباسِ نظم میں لائے وہ پھر اس طور سے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

اب زبانِ بلبلِ شیدا سے سنئے وہ غزل — ہے زمیں رنگیں ردیف گل ہے جسمیں برمحل

غزل

بلبل شیدانہ کیونکر دلسے ہو شیدائے گل | باعث رنگ محبت ہے رخ زیبائے گل
نغمہ سنجی کرتی ہیں گلزار میں جب بلبلیں | صاف آتی ہے یہی آواز ہر دم ہائے گل
عاشقوں کے واسطے ہے حسن وجہ آرزو | داغ کی دیں جگہ صحن چمن میں جائے گل
قلب عاشق کیطرح ہے آسماں پر مضطرب | ہوگیا ابر بہاری بھی مگر شیدائے گل

رنگ اسکا ملتا جلتا ہے گلوں کے رنگ سے
اے شرر داغ دل بیتاب ہے ہمتائے گل

کیوں نہ ایسے گل پہ شیدا ہوں زمانے کے حسین | سرخ پیراہن میں پوشیدہ ہے جسم نازنین
تازگی سے پتلیاں آنکھوں کی آسودہ ہوئیں | اسکی نرمی سے نگاہیں خواب آلودہ ہوئیں

چشم بینا میں کھبی جاتی ہے رنگت دیکھیے
پتیاں ریشم ہوا سے ہیں نزاکت دیکھیے

اسکی خوشبو باعث تقویت قلب و دماغ | زینت صحن چمن گلزار کا چشم و چراغ
رنگ اسکا مردہ دل کے واسطے اک جان ہے | اور مہک نازک دماغوں کے لیے ریحان ہے

پیاری پیاری شکل سے آنکھوں پہ حیرت چھا گئی
وہ ملی لذت کہ آخر روح بھی شرما گئی

گرد پھر پھر کر نگاہوں نے کیا اسکا طواف | بس گئی آنکھوں کے پردوں میں نگہت صاف صاف
نور عرفاں ہے سوق اسکا بصارت کیلئے | باعث تحریک ہے رنگ محبت کیلئے

اے شرر تشریح میں اسکی نہایت طول ہے
اصل میں ہے خون دل اور دیکھنے میں پھول ہے

احسن میرزا مشہدی۔ لکھنوی

علم ہیئات اور مسلمان

دنیا کے تمام علوم و فنون کا وجود مدبرین عالم کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے لیکن صرف علم ہیئت اپنے وجود میں ایشیا کے صحرانشین چرواہوں کا ممنون احسان ہے جو ایشیا کے کھلے میدانوں میں اپنی پر عیبت راتیں اختر شماری میں بسر کرتے تھے۔ بے شغلی سے گھبرا کر صفحہ افلاک کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے۔ مزید مطالعہ کے بعد ستاروں کی ہر سطر میں انھیں یہ عبارت نظر آنے لگی کہ "اس دائرہ افلاک کا ہر نقطۂ کوکب ایک مستحکم قانون کی سطح پر ساکن ہے یا حرکت کرتا ہے۔ کوکب کا سکون و حرکت ہماری زراعت پر خاص اثر کرتا ہے ان ستاروں کا تغیر و تبدل کسی خاص اصول پر ہے"

دماغ میں ان خیالات کے آتے ہی انہوں نے ستاروں کے نام رکھے ان کی حرکت کا اندازہ کیا ان کے منازل مقرر کیے ثوابت کی مدد سے خاص خاص سمتوں کی علامتیں قرار دیں۔ رفتہ رفتہ یہی معمولی قواعد زراعت کے فصول اور بے نشان صحرا اور بے پایاں دریا کی دلیل راہ بنے۔

مدت تک یہ چند سادہ اصول جو صحرا نشینوں کے مشاہدوں کے نتیجے تھے خلفاً عن سلف ایشیا کے جنگلوں میں گشت کرتے رہے لیکن امتداد زمانہ کا پرکار ان معمولی اصولوں کا دائرہ وسیع کر رہا تھا۔ جن کو آج علم ہیئت (اسٹرانومی) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر اب تک اس علم نے فن کی حیثیت نہیں پیدا کی تھی۔ سب سے پہلے ہندوستان میں ان چند معمولی اصولوں سے جو اب تک معلوم ہو چکے تھے۔ فن کا قالب

اختیار کیا علم ہیئت کے سرپرستوں کی فہرست میں ہندوستان کے بعد مصر کا
نام ہے۔ یہاں پہونچکر مورخین میں ایک بڑا اختلاف یہ ہوتا ہے کہ کیا مصر میں
یہ علمی فیض ہندوستان سے آیا۔ جسطرح ہندوستان کو مستقل طور پر اس کے
موجد ہونے کا حق حاصل ہے مصر کو بھی ہے؟ نہیں فیصلہ صحیح یہ ہے
کہ دنیا کے دونوں قدیم حصوں میں اس علم نے مستقل زندگی حاصل
کی۔ نہ ہندوستان اس کے لیے مصر کا ممنون ہے نہ مصر ہندستان کا کیونکہ اگر مصری ہیئات کا
ماخذ ہندستان ہوتا تو دونوں کے اصول مسائل طریقہ بحث ایک ہوتے یا کم از کم مشابہ ہوتے
حالانکہ دونوں کے اصول میں اتنا ہی بعد ہے جتنا کہ مصر کو ہندوستان
سے نیز تاریخی طور سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قدیم الایام میں
ان دونوں ملکوں میں سلسلہ آمد و رفت تھا۔ مصر
ہندوستان کا تعلق حملہ اسکندریہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور
علم ہیئات کا وجود مصر میں اس سے پہلے ہوچکا تھا۔ ایک بڑی وجہ
یہ ہے کہ ہندوستان کو اپنے علوم کے ساتھ جو بخل تھا وہ کیوں کر
اجازت دے سکتا تھا کہ ہندوستان مصر کے لیے اپنے خزانہ کا
دروازہ کھولدے۔ اس لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان اور مصر
میں الگ الگ یہ فن پیدا ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی
سرزمین اور آب و ہوا سے علم ریاضی کو ایک قدرتی مناسبت تھی۔ ہندسہ
یعنی علم نجوم کا گہوارہ طفولیت یہی ہندوستان ہے۔ لیکن مصر کا پایہ بھی
علم اقلیدس کی ایجاد ہندوستان سے کچھ زیادہ پست نہیں رہنے
دے سکتی۔

علم ہیئت نے مصر اور ہندوستان میں نشو ونما پاکر اپنے حدود سے

جب باہر قدم نکالا تو حنا بابل - ایران میں داخل ہوا - شاہان پارس میں
سے ضحاک اور جاماسب نے اوس کی زیادہ قدر کی - ان متمدن ملکوں کی
سیر کرتا ہوا فنسیفیہ اور یونان پہونچا اور گو اسی طرح علم ہیئات اپنی ترقی
کے منازل طے کرتا جاتا تھا لیکن اس کا حقیقی پہلا دن وہ تھا کہ جس دن
مصر میں اسکندریہ کی بنیاد ڈالی گئی - اب یہ مدرسہ دنیا میں علم ہیئات
کا سب سے پہلا مدرسہ ہے اس مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی قایم
کیا گیا تھا جس میں علم ہیئات کی تمام کتابیں بقدر امکان جمع کی گئی تھیں
ہپیارک یونانی اور بطلیموس مصری جو علم ہیئت کے سب سے پہلے مدون تھے
اس مدرسہ کی تعلیم کے نتائج اور اسی پراگندہ بزم کے دو رکن تھے
اور گو ان سے پہلے اور ان کے بعد بہت سے اس فن کے ماہرین
پیدا ہوئے جیسے ارشمیدس سنہ ۲۵۰ ق ع (ابقلاوس) سنہ ۱۶۰ ایلونیوس
خاون - فالیس رومی - ثاومیس انیگلوس بابلی - فرابا (بخت نصر کا منجم)
ابیون وغیرہ وغیرہ جن کی کوششوں سے ہیئات نے ایک
حد تک ترقی کی مگر ہپیارک اور بطلیموس دو ایسے شخص ہیں جن کے ذکر سے
علم ہیئات کی تاریخ کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی +

ہپیارک سنہ مسیح سے چند سال پہلے شہر بروسہ میں پیدا ہوا
تھا جغرافیہ کا طول و عرض البلد پہلے اس نے دریافت کیا تھا - ستاروں
کی ایک فہرست تیار کی - جس میں اُن کی چالوں کی تفصیل تھی - اُس کی
زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اوس نے نقطۂ اعتدال کی
رجعی حرکت دریافت[1] کی۔

[1] علم الہیئات ۱۲

بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ مدرسہ اسکندریہ میں اس نے ہیئات کی تعلیم پائی اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ مدرسہ اسکندریہ کی تاریخ میں سب سے پہلے جلی نام بطلیموس کا لکھا گیا۔ علم ہیئات کی معلومات میں معتد بہ اضافہ اسوقت سے ہونے لگا جب سے آلات رصد ایجاد ہوئے۔ آلات رصد کی ایجاد اور ستاروں کی ترمید سب سے پہلے بطلیموس نے کی بطلیموس نے ہیئات کی ایک گراں بہا خدمت یہ کی کہ اس نے علم ہیئات کی منتشر معلومات ایک کتاب کی صورت میں منتظم کر دیئے جو مجسطی کے نام سے مشہور ہے[۵۱]

چونکہ اسلامی علم ہیئات کی تاریخ مجسطی سے شروع ہوتی ہے اس لیے اس کے متعلق ہم کچھ تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں جس سے یہ قیاس ہوگا کہ جب صرف ہیئات کی کتاب مجسطی کے متعلق مسلمانوں نے اتنی جانکاہ کوششیں کی ہیں تو نفس علم ہیئات کے متعلق کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔

مجسطی ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ترتیب کے ہیں۔ چونکہ بطلیموس نے اسی کتاب کے ذریعہ سے ہیئات کے پراگندہ معلومات کو یکجا کیا تھا اس لیے مجسطی سے بڑھکر اس کتاب کا کوئی نام موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ہیئات کی سب سے پہلے جامع کتاب اوریاتوس اور آنطوتیوس کے عہد میں انہیں دونوں میں سے ایک کے لیے لکھی گئی تھی[۵۲]۔ ملا کاتب چلپی کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب ہیئات کی اعلیٰ ترین تصنیف ہے۔ بلکہ یہ کتاب اصل ہے اور ہیئات کی تمام تصنیفات اسکی خوشہ چیں ہیں۔

سب سے پہلے یحیی ابن خالد برمکی کی فرمایش سے چند لوگوں نے

[۵۱] فہرست صفحہ ۲۶۷۔ [۵۲] فہرست صفحہ ۲۶۷۔

مگر اس کتاب کو عربی عبا دہستا دسے آراستہ کیا یحییٰ کے خاطر خواہ یہ ترجمہ نہوا۔ اس لیے اس نے بیت الحکمت کے مترجمین ابو حسان اور سلم کو اس خدمت کے انجام دینے کا حکم دیا۔ ان دونوں نے ماہرین فن کی ایک جماعت کو اس ترجمہ کے لیے مقرر کیا۔ جب یہ سب ترجمہ کر چکے ان تراجم میں سے جو سب سے زیادہ صحیح اور با محاورہ تھا اس کا انتخاب کیا اس پر بھی شوق کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔

حجاج بن سطر نے مامون کے عہد میں اسکا دوبارہ ترجمہ کیا۔ تبریزی نام ایک شخص نے اس کا تیسرا ترجمہ کیا۔ ثابت بن قرہ مترجم بیت الحکمت نے اس ترجمہ کی اصلاح کی۔ اسحق نے اسکا چوتھا ترجمہ کیا جس کی اصلاح پھر ثابت نے کی۔ مامون اس کتاب کا عاشق تھا۔ مامون کے عہد میں بجلاج میں یوسف ثابت ثمرہ نے پھر اسپر نظر ثانی کی۔

اس کتاب میں تیرہ مقالے میں سے صرف پہلے مقالہ کی طرفیوں اور عمر بن الفرخان اور ابراہیم بن صلت نے تفصیل کی ہے۔ ابو ریحان بیرونی نے حشو اور زوائد سے پاک کر کے اسکو مختصر کیا۔ فاضل نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری نے اسکی شرح لکھی۔ قاضی زادہ رومی نے اس شرح پر حاشیہ لکھا فاضل جمال الدین ابوالفرح کے ایما سے محی الدین یحییٰ اندلسی نے اسکا خلاصہ کیا۔ اور مجسطی پر کچھ ایزاد کیا محقق نصیر الدین طوسی نے مجسطی کے اشکالات ایک خاص تصنیف کے ذریعہ سے حل کیے محقق شمس الدین سمرقندی نے اس کی شرح لکھی ہے بعض علمائے متاخرین نے بھی مجسطی کی شرح کی ہے[۵]۔

[۵] کشف الظنون صفحہ ۲۲۶-۱۲

مجسطی کے سوا اور کسی خاص ہیئت کی کتاب کا ترجمہ مسلمانوں نے نہیں کیا۔ دنیا کی اہل علم قوموں کی معلومات سے فائدہ اٹھایا اُن کو اپنی تصانیف میں جگہ دی اور صفحۂ عالم پر آج یونانی تالیفات کا نشان ہوتا اگر مسلمانوں کی علمی قدردانی کا ہاتھ ان کو نہ تھامتا۔ ایک انگریز مصنف کہتا ہے :-

> علمائے عرب نے ریاضیات کی پوری پوری خدمت کی اگر انکی توجہ نہوتی تو یونانی ریاضی تصنیفات کا اکثر حصہ برباد ہوگیا ہوتا۔ لیکن اصل یونانی نسخوں کے ضائع ہو جانے پر عربی تراجم میں محفوظ رہا[1]

مثالاؤس اسکندرانی جو سنہ ۹۸ء میں تھا ہیئت کا بڑا عالم تھا بطلیموس نے مجسطی میں اسکا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی تصنیفات یورپ نے عرب کے ہاتھوں سے پائی[1]۔ مسلمانوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ قدیم تصنیفات کو معدوم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اپنی خاص تحقیقات اور معلومات سے علم ہیئت کی تجدید کردی۔ علم ہیئت کیطرف مسلمانوں کی توجہ ابوجعفر منصور دولت عباسیہ کے دوسرے تاجدار کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ ابوجعفر کے بعد ہارون کے عہد تک اس علم کی ترقی ایک معمولی انداز سے ہوئی۔ مامون جب سریر آرا ہوا تو اس نے ہیئت پر ایک خاص لطف کی نگاہ ڈالی اور یہ اسلامی ہیئت کی ترقی کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں نے اس علم کو تقلیدی طور سے نہیں سیکھا بلکہ بجائے خود بھی اس کی تحقیق کی۔

[1] اکتفاء القنوع صفحہ ۲۳۲ - ۱۲ سنہ ۵۲ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۱۲۰

آلات رصد ایجاد کیے۔ زیجیں بنائیں جن میں سے اکثر آج یورپ میں چھپ گئی ہیں۔ یا قلمی محفوظ ہیں۔ آلات رصد کے نام اکثر تاریخ میں ملتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ انکا استعمال ایک مدت سے چونکہ متروک ہے اس لیے یہ بدقت سے دریافت ہوسکتا ہے کہ یہ آلے کس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے ذیل میں ہم صرف ان آلوں کے نام بتائیں گے جن کے موقع استعمال سے ہم کو کسیقدر واقفیت ہے۔ بشرطیکہ اس کی ایجاد کا شرف مسلمانوں کو حاصل ہوا ہو:-

نمبر	نام آلہ	کیفیت	کس کام کے لیئے	موجد
۱	لبنہ	مربع مستوی	اس سے میل کلی عرض البلد اور تاروں کی دریافت کی جاتی ہے	مسلمان
۲	حلقۃ الاعتدالیہ	ایک قسم کا حلقہ ہوتا ہے جو دائرہ معدل کی سطح میں نصب کیا جاتا ہے	اس سے تحویل الاعتدالی دریافت کی جاتی ہے۔	ایضاً
۳	ذات الاوتار	چار مربع اسطوانی ہیں جس کی ایجاد نے حلقۃ اعتدالیہ سے مستغنی کر دیا۔	تحویل اعتدالی اور تحویل لیل دریافت ہوتی ہے	علامہ تقی الدین
۴	ذات السمت والارتفاع	ایک نصف حلقہ ہے جسکا قطر چند متوازی السطوح اسطوانوں کی سطح ہے	اس سے سمت اور ارتفاع معلوم ہوتا ہے	مسلمان
۵	ذات الجیب	۔	۔	مسلمان
۶	المشبہ بالمناطق	۔	اس سے دو ستاروں کے درمیان کا بُعد معلوم ہوتا ہے۔	علامہ تقی الدین راصد
۷	الربع التام	〃	ایضاً	ابن شاطر دمشقی المتوفی ۷۷۷ھ

ابن الشاطر مسلمانوں میں ایک بہت بڑا ہیئت داں گذرا ہے۔ "النفع العالم" اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ایک موقع پر آلہ الربع التام کی ایجاد کی یہ وجہ لکھی ہے کہ اب تک میں نے جتنے آلات رصد دیکھے ہیں اُن سب میں کچھ نہ کچھ فروگذاشت تھی اس کی اصلاح کے لیئے میں نے الربع التام بنایا جو آسان ہے اور تمام باتوں کے برخلاف کرۂ ارض کے ہر چہار حصہ پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

رصد گاہوں کا وجود مسلمانوں سے پہلے تھا تاون اسکندرونی نے سنہ ۳۰۰ ق م میں طیمورخارس نے سنہ ۱۳۲ ق م میں اسکندریہ میں ایرن نے سنہ ۱۶۰ء میں مالانوس نے رومہ میں سنہ ۹۸ء میں بطلیموس نے سنہ ۱۲۲ء میں رصد گاہیں قایم کی تھیں عہد اسلام میں سب سے پہلے مامون نے رصد بنوائی۔

۱۔ جب مامون کے زمانہ میں مجسطی کا ترجمہ ہوا تو اُس نے اُن سب آلات کے بنانے کا حکم دیا۔ جن کا مجسطی میں ذکر کیا گیا تھا۔ دنیا کے ہر گوشہ سے ماہرین ہیئت جمع کیئے گئے جن کے ہاتھوں سے شہر شماسیہ بغداد اور دمشق میں سنہ ۲۱۴ھ میں رصد گاہیں طیار ہوئیں۔ ان رصد گاہوں نے صرف چار برس کی عمر پائی ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے سنہ ۲۱۸ء میں مامون کا انتقال ہوگیا۔ مگر اس قلیل عرصہ میں بھی چند نئی باتیں دریافت ہوئیں جو ایک کتاب کی صورت میں زیج مامون کے نام سے مشہور ہے۔ یہ رصد گاہیں یحیی ابن منصور خالد بن عبدالملک مروزی بن علی عباس بن سعید کے زیر اہتمام تھیں۔

۲۔ رصد ابی حنیفہ دینوری سنہ ۲۳۵ھ میں اصفہان میں قائم کی گئی۔ یہی

رصد میں ستاروں کے متعلق جو معلومات ہوئی تھی اُن کو ابو حنیفہ المتوفی سنہ ۲۸۲ھ نے ایک کتاب میں ترتیب دیکر رکن الدولہ دیلمی کے نام سے معنون (ڈیڈیکیٹ) کیا تھا۔

۳۔ رصد حاکمی۔ حاکم بامر اللہ مصر کا چھٹا فاطمی خلیفہ تھا اس نے مصر میں ایک رصد بنوائی تھی[۱] ابن یونس المتوفی سنہ ۳۹۹ھ میں اس کا مہتمم تھا۔ ابن یونس نے حاکم کے نام سے ایک زیچ بھی لکھی تھی۔ اس زیچ کو سنہ ۱۸۰۴ء میں فرنچ ترجمہ کے ساتھ کون سا ڈی برسفال نے چار جلدوں میں شائع کیا ہے اُس کے قلم سے اور کتابیں بھی نکل چکی ہیں جن میں سے بعض خدیوی کتب خانہ مصر میں موجود ہیں ✢

۴۔ رصد ہوا الاسلم۔ یہ رصد بغداد میں سنہ ۲۵۰ھ میں بنائی گئی تھی ✢

۵۔ رصد بیرونی ابو ریحان بیرونی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ اس کا بانی تھا۔

۶۔ رصد طوسی ہلاکو خاں نے نصیر الدین طوسی المتوفی سنہ ۶۷۲ھ کے درخواست پر مراغہ میں یہ رصد بنوائی تھی۔ اس رصد کی تیاری میں ہلاکو نے بیشمار روپیہ صرف کیئے۔ رصد کے ماہانہ اخراجات کے لیے بیس ہزار اشرفیاں مقرر تھیں۔ اس کے اہتمام کے لیے دور دراز ملکوں سے اس علم کے ماہرین طلب کیئے گئے تھے مویدعرضی دمشق سے فخر مراغی موصل سے فخر فلاطی

[۱] اس رصد کی تاریخ ہی کاتب چلپی نے سنہ ۳۸۰ھ لکھی ہے مگر کسیطرح صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کا مہتمم ابن یونس تھا۔ اور حالانکہ خود یونس کی ولادت سنہ ۳۸۰ھ میں ہے اور حاکم بامر اللہ خود چوتھی صدی میں تھا سنہ ۴۱۱ھ میں وفات پائی۔ ۱۲

تفلیس سے نجم الدین قزوین سے بلائے گئے تھے۔ ماہ جمادی الاول ۶۵۷ھ سے یہ رصد بننی شروع ہوئی تھی۔ یہاں ایک کتب خانہ بھی تھا جو بغداد شام جزیرہ کی تاراج کردہ کتابوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔

۷۔ رصد الوغ بیگ :- الوغ بیگ بن شاہ رخ بن تیمور لنگ المتوفی ۸۵۳ھ اس کا دار السلطنت سمرقند تھا۔ خود بھی علم ہیئت کا ماہر تھا اور علمائے ہیئت کا ایک مجمع بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ موسیٰ بن محمود قاضی زادہ رومی مصنف شرح چغمینی نویں صدی میں تھا اور غیاث الدین جمشید کا شاگرد تھا۔ انہیں دونوں کے مشورہ سے اس نے سمرقند میں اس رصد کی بنیاد ڈالی۔ مگر اوس کی بدقسمتی سے ہیئت کے یہ دونوں آفتاب و ماہتاب اختتام رصد سے پہلے ہی غروب ہو گئے لیکن ملک بھی باکمالوں سے خالی نہ تھا۔ جمشید کے لائق جانشین فرزند علی قوشجی کے اہتمام سے یہ رصدگاہ تکمیل کو پہونچی۔ ان مذکورہ بالا رصدوں کے علاوہ اور بہت سی رصدگاہیں تھیں۔ جیسے رصد بن اشاطر۔ رصد تابخور رصد تیاتی۔ رصد طلیطلہ مگر ان کے واضح حالات چونکہ دستیاب ہو سکے اسلیے افسوس کے ساتھ انکو قلم انداز کرنا پڑا۔

مضمون کے خاتمہ پر ہمیں اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے کہ یورپ کی گردن میں اسلامی ہیئت کا طوق تلمذ ہے کہ نہیں۔ تاریخ سے اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے جرمن کا علم دوست بادشاہ فریڈرک دوم ایک طرف تو صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے علوم سے سیراب

ہو رہا تھا۔ میدان جنگ میں مسلمانوں کے مقابلہ کیلیے صف آرا بھی ہے اور ریاضی کے مسائل ہلالی فوج کے سپہ سالار سے حل بھی کرتا ہے۔

ابن یونس المتوفی ۳۹۹ھ جو حاکم بامر اللہ خلیفہ فاطمی کا مشہور فلکی تھا جسکی کتاب الجلد اول الحاکمیہ پیرس میں چھپ گئی ہے اِس کے حالات میں اڈورڈین کرنیلیس ماٹڈیک لکھتا ہے:۔

ابن یونس نے مصر میں ہیئات کے چند طریقے استعمال کیے جن کو ابن یونس سے اس کے بعد یورپ کے ہیئت دانوں نے اخذ کیا +

سب سے بین دلیل دعوے کی ہیئت کے اُن عربی اصطلاحات سے ملتی ہے جو یورپ میں آجتک مستعمل ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کی زبانوں میں یا تو بالکل اُسی طرح ہیں یا بگاڑ کر دوسرے نام رکھ لیے ہیں تفصیل یہ ہے۔

(۱) اصطرلاب۔ (۲) العفارہ۔ (۳) ادبران۔ (۴) الراجل۔ (۵) البسر الطائر۔ (۶) النسر الواقع۔ (۷) آخر النہر۔ (۸) راس الغول وغیرہ۔ +

محمد بسم اللہ خاں بسمل۔

افسوس ہے کہ ستمبر کے پرچہ میں جو دو۔ دو کارڈ ناظرین تمدن کی خدمت میں روانہ کیے گئے تھے اسپر بہت کم حضرات نے توجہ فرمائی۔ ہم ناظرین کی اِس تجویز پر کہ تمدن کی تقطیع بڑی اور تصاویر میں اضافہ کیا جائے اتفاق کرنیکے واسطے موجود ہیں لیکن رسالہ ابھی اِس قابل نہیں ہوا کہ وہ اپنا خرچ برداشت کرے۔ ناظرین تمدن شروع سال سے تقطیع کو بڑا اور تصاویر میں اضافہ چاہتے ہیں تو صرف موجودہ خریدار۔ دو۔ دو خریدار فراہم کر دیں۔ اڈیٹر۔

نالۂ دل

مہیا ہیں تمھارے واسطے آسانیاں کیا کیا مگر اوس پر بھی تم کرتے ہو نافرمانیاں کیا کیا
مگر میری تمھیں پابندیٔ مذہب سے نفرت ہے تمھاری شرع نے دیں ہیں تمھیں آزادیاں کیا کیا
[illegible] امنت پر تم جب سے دولت ساری لٹ جائے رچائیں تم نے اس عشرتکدہ میں رلیاں کیا کیا
[illegible] نہ سکھاتے ہو نہ تعلیم انکو دیتے ہو مہیا کی ہیں بچوں کے لیے بربادیاں کیا کیا
بزرگوں نے ہمارے جو زمیں جنت بنائی تھی نظر آتی ہیں کوسوں تک وہاں ویرانیاں کیا کیا
[illegible] مریجا نب کیسے کیسے فدیے بھی ہوئیں ہیں کربلائے عشق میں قربانیاں کیا کیا
ہوئی سب زندگی برباد وحشت گاہ ہستی میں بتائیں تم سے کیا ہم سے ہوئیں نادانیاں کیا کیا
[illegible] وقت آتا ہے کہ وہ پر گرنے جاتے ہیں ابھی سے آ رہی ہیں دیکھئے انگڑائیاں کیا کیا
[illegible] کھولا [illegible] تعلیم کچھ نہ سہی نہ تم بولے دکھائیں ہیں دل بیتاب نے بیتابیاں کیا کیا
[illegible] نے اور ہمارے قوم کے رہبر کہوں کیا آپ سے بڑھتی گئیں حیرانیاں کیا کیا
[illegible] رہبران قوم میں اتنا مشرب ہو تمھارے سامنے مجھ سے ہوئیں گستاخیاں کیا کیا
[illegible] سنو اب بھی وصیت نامۂ غم کو وگرنہ پیش آئینگی تمھیں ناکامیاں کیا کیا

ہنسے کیسے مریض غم کا چہرا دیکھنے والو
کرو خوف خدا سے کچھ تماشا دیکھنے والو

عزیز لکھنوی

رباعی

ویرانہ یہ کل مکان ہی بستی تو ہے
دنیا کی بلندی اور پستی تو ہے
جو کچھ نظر آتا ہے وہ ہے وہم و گمان
ہر چیز ہے نیست صرف ہستی تو ہے

طاقِ بستان یا قصرِ شیرین

میں سنہ ۱۹۰۱ء میں براہ خشکی ایران کا سفر کر رہا تھا۔ کوئٹہ ایکطرف سے بسواری شتر وکجاوہ افغانستان و بلوچستان کے چٹیل میدان طے ہو رہے تھے اور ہر منزل نہایت سخت و صعب تھی کبھی شب بھر چلتے تھے اور دن بھر قیام ہوتا تھا اور کبھی دنکو چلنا ہوتا تھا اور رات منزل پر گذرتی تھی۔ اسیطرح چار مہینے پندرہ روز کے بعد ہمارا قافلہ خراسان پہونچا۔ اور ایک ماہ بیس یوم گذرنے پر پھر قافلہ کو حرکت ہوئی اور ہم سرزمین طوس سے نہایت افسوس کے ساتھ جدا ہو کر پایۂ تخت طہران کیطرف بسواریئے فاطر روانہ ہو گئے اور چند روز طہران میں رہکر کاظمین و کربلا کی جانب راہی ہوئے پہلا راستہ یعنے کوئٹہ سے خراسان تک جیسا سخت و دشوار گذار تھا ویسا ہی یہ دوسرا راستہ یعنے خراسان سے۔ خانقی اور خانقی سے کاظمین تک نہایت پُر فضا اور راحت رساں تہا۔ طہران سے چلکر جب ہمارا قافلہ کرمان پہونچا ہے تو نہایت کسلمند تھا۔ اس لئے شہر کرمان میں بغرض آسائش ایک نہایت عمدہ منزل برائے قیام تجویز کی گئی اور اس منزل کے بالاخانہ پر ہمارا بستر لگایا گیا دو روز رہ کر شہر کی سیر کی اور حالات دریافت کیئے تو معلوم ہوا کہ یہاں سے چند میل کے فاصلہ پر ایک مقام ایران کے یادگار مقاموں میں۔ ”طاق بستان“ ہے جسکو بادشاہ خسرو نے تعمیر کرایا تہا اور شیریں کو اکثر بیجایا کرتا تہا۔ یہ سنکر مجھکو اور میرے چند دوستوں کو بہت

بہت شوق پیدا ہوا اور آخر ایک روز اس کے دیکھنے کو سوار یئے خاطر روانہ ہوگئے تین ساعت کے بعد یہہ چھوٹا سا قافلہ وہاں پوہنچ گیا۔ مگر وہاں پہنچتے ہی کسل راہ برطرف ہوگیا۔ کیونکہ واقعی وہ مقام ہی ایسا تھا۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو ہمکو ایک نہر اور سنگین چار دیواری کے کچھ آثار نظر آئے کہ جنکا اب صرف نشان ہی نشان باقی رہ گیا تھا۔ جب اس چار دیواری کی حد سے آگے بڑہے تو ہم کو ایک چبوترہ اور پہاڑ میں ترشا ہوا ایک ایوان نظر آیا جس کی خوبصورتی نظر بین فوراً کہپ گئی۔

اس ایوان کی بائیں جانب ایک بہت بڑا درہ نظر آیا جو خاص طاق بستاں کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بلندی کو سر بفلک کہنا تو مبالغہ ہے لیکن اسمیں بھی شک نہیں کہ ہندوستان کی عمارتوں میں اس کا ہمسر شاید کوئی نہوگا اور یہہ بھی بالکل پہاڑ کو تراش کر نکالا گیا ہے۔ اسمیں داخل ہونے کے بعد سامنے کے رخ کو رستم کی قد آدم تصویر معہ اسپ و آلات حرب پتھر میں ترشی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور جیسے رستم کی بلندی شاہ نامہ میں دکھائی گئی ہے اُسی کے موافق یہ بھی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپ ایک فٹ سے کچھہ زیادہ چوڑی ہے اور رستم کے کاندہے پر برچہہ پشت پر ڈھال لگی ہوئی ہے سر پر خود بر میں زرہ سینہ کی طرف بکتر و چار آئینہ کے نشان دکھائے گئے ہیں۔ پاؤں میں گیوہ اور بہت لمبی رکاب جو سطح زمین سے صرف دو بالشت بلند ہے۔ چہرہ سے ہیبت۔ بازوؤں سے تنومندی کے آثار نمایاں ہیں۔ شہسواری کے انداز بہت خوبی سے دکھائے گئے ہیں

کھنگی کے سبب برچھی کا کچھ حصہ یعنے یونڈیکے پاس سے اور گھوڑے کا بایاں پیر گرا ہوا ہے گھوڑے کے پیچھے بہت بھرے ہوئے۔ گردن نہایت چوڑی اور بلند ہے آنکھیں خوب ابلی ہوئی اور تھوتھنی ذرا خوبصورتی کی حد سے زیادہ بھاری معلوم ہوتی ہے چارجامہ اور باگ وغیرہ کے بھی آثار پائے جاتے ہیں رستم کی کلائی بہت چوڑی اور انگلیاں خوب بھری ہوئی اور نہایت دراز معلوم ہوتی ہیں۔ بڑ میں ایرانی کوٹ۔ ہاتھو پیر داستانے چہرہ پر جلالت کے آثار نمایاں طور پر ہیں۔ اس کے پہلو میں ایک پتھر نصب ہے جس پر سیاحان دور و دراز کے مختلف کتبے مختلف زبانوں میں ہیں بعض جرمنی، بعض "لاطینی" دو ایک کتبے پڑھے بھی گئے جن میں ایک کتبہ مختار الملک حیدرآباد دکن اور دوسرا ایک انگریزی سیاح انگلینڈ کا ہے۔ رستم کا گھوڑا مع سوار پہاڑ کاٹ کر نکال لیا گیا ہے صرف ایک پہلو لگا ہوا ہے داہنی جانب کا جو رخ ہے وہ بھی بصورت دیوار ہے اور اس پر شکار گاہ بنی ہوئی ہے کہیں ہرن چوکڑیاں بھر رہے ہیں کہیں شیر کچھار سے نکل رہے ہیں کسی طرف شکاری لوگ گھوڑوں کی باگیں اوٹھائے جا رہے ہیں کہیں نہریں بنائی گئی ہیں اور کسی طرف جنگلی خار دار درخت اور گھاٹیاں وغیرہ نظر آتی ہیں ان کے علاوہ اور بہت سے مختلف جانوروں کی تصویریں ہیں جن کی اجنبی صورتیں پہچانی نہیں جا سکتیں۔ بائیں طرف بلندی پر تین روغنی تصویریں ہیں جن میں دو بہت خوبصورت تصویریں شاہزادیوں کی اور ایک مردانی صورت کی تصویر ہے جس کے سر پر تاج اور اس پر کلغی لگی ہوئی ہے جسم میں

بہت خوشنما رنگین لباس اور نشست کا طریقہ نہایت ادب آموز ہے۔ روغن کی تازگی سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حال کا لگا ہوا ہے اور واقعی دریافت کرنے سے ایسا ہی معلوم بھی ہوا۔ ان تصویروں کے نیچے ایک کتبہ ہے جو نظم میں مثل قطعہ کے ہے اور صاف پڑھا جاتا ہے مگر کہیں کہیں کے حرف خراب ہو گئے ہیں اور بعض الفاظ ایران کی پرانی زبان کا پتہ دیتے ہیں اور بغیر غور و خوض کے اُن کے معنے مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں اسکی نقل بھی میں اپنے ہمراہ لایا تھا۔ مگر اسوقت خیال نہیں کہ وہ کہاں ہے۔

درۂ کوہ سے نکلنے کے بعد وہ دیوار نظر آئی جو ایوان اور اس درہ میں حد فاصل کا کام دے رہی ہے۔ اس دیوار پر بھی ایک عجیب غریب منظر کا مرقع نظر آیا۔ یعنے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ چت لیٹا ہے اور اس کے سینہ پر دو آدمی پابجولاں کھڑے ہوئے ہیں جنکی گردن میں خاردار طوق ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں یہ مرقع دیکھکر بہت تعجب ہوا اور وہاں کے رہنے والوں میں سے جو دو ایک کو بلا کر اس راز کو دریافت کیا تو ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ جو لوگ پابجولاں ہیں یہ حرامی ہیں اور جو چت لیٹا ہوا ہے اسی کے مال کے سارق اور اسی صورت سے شاید اسکے قاتل بھی ہیں اس کے بعد اُس خوبصورت ایوان میں داخل ہوئے جو خاص "قصر شیریں" کے نام سے مشہور ہے اور جسمیں اکثر شیریں آکر بیٹھا کرتی تھی اور جشن کیا کرتی تھی۔ شیریں کے بیٹھنے کا مقام نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے بلندی پر تین چھوٹے محرابدار

درمیں اور پیچھے ایک بہت خوشنما حوض جس میں فوارہ لگا ہوا ہے
اور اس حوض کے چاروں طرف در تراشے ہوئے ہیں اور ان دروں
سے چاروں طرف راستے ہیں اور ان راستوں میں جا بجا زینے لگے
ہوئے ہیں جن سے اوپر جا سکتے ہیں لیکن یہاں سب سے زیادہ جو بات
حیرت خیز اور تعجب انگیز تھی وہ یہ ہے کہ سوائے پتھر کی ترشی ہوئی
عمارت کے یہاں اور کسی قسم کی کوئی آرایش نہ تھی مگر نہیں معلوم وہ
کیا چیز تھی جو اس مقام کو بیحد دلچسپ بنائے ہوئے تھی جس طرف
نظر پڑتی تھی محو ہو جاتی تھی جس طرف آنکھ اٹھتی تھی نگاہیں لوٹ جاتی
تھیں اور کوئی نظر بغیر قربان ہوئے واپس نہ ہوتی تھی۔ مجھے اسوقت
بھی اس بات کی حیرت تھی اور اسوقت بھی ہے۔ نہیں معلوم
کس اصول سے یہ عمارت تراشی گئی تھی کہ اگر دنیا کے معمار ہوتے
تو محو ہو جاتے اتنا لکھنے پر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو
دل آویزیاں اس عمارت میں مضمر ہیں ان کو خداداد کہنا
چاہئے اور میرے قلم سے تو اس دلچسپی کی تصویر کھنچ ہی نہیں
سکتی۔ اس لیے میں آگے چلتا ہوں حال کے درجہ سے نکل کر
بذریعہ ایک زینہ کے اوپر پہونچے اور وہاں سے جب اس
خوشنما حوض کا نظارہ کیا تو اور بھی بھلا معلوم ہوا۔ مختصر یہ کہ ہر ہر مقام
سے کسی طرح اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ لمحہ لمحہ ذوق بڑھتا
ہی جاتا تھا۔ اور انتہائے شوق کا یہ تقاضہ تھا کہ اس مقام
کو دیکھا ہی کیجئے۔ اب ہم اس ایوان سے نکلکر اس کی پشت کی
جانب جاتے تھے قدم اوٹھانے کو کسی طرح جی نہیں چاہتا تھا۔

اور دل میں رہ رہ کر یہ خیال آرہے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد اب ہمیں اس مقام کو چھوڑنا ہی پڑے گا اور سنگ جبر سے سینہ کو دبانا ہی ہوگا دل میں ایک خاص قسم کی حیرت اور مزاج میں ایک گونہ خوشی کی جھلک پائی جاتی ہے اب ہم سب کے سب خاموشی کے ساتھ دریچوں سے نکل کر باہر آئے اور پہاڑ کا نصف وہ حصہ دکھائی دیا جو تراشنے سے باقی رہ گیا تھا۔ اور ناہموار پڑا ہوا تھا مگر اوپر جانے کے لیے بیشمار زینوں کا ایک سلسلہ بنا دیا گیا تھا کہ اگر کوئی اوپر جانا چاہے تو جا سکتا ہے اس کے معائنہ کے بعد اب ہمارا مختصر قافلہ دوبارہ پھر اس قصر کے سامنے آیا اور رخصتی نگاہوں سے بحالت مجموعی جو اس منظر کو دیکھا تو سوائے تراشے ہوئے پتھر کے اور کچھ نہ تھا جو فن ہند کے کمال کا ایک کامل نمونہ کہا جاتا ہے۔

احسن میرزا. شررہ مشہدی

حسن تمانی یہ کتاب جو لڑکیوں کے واسطے ایک دلچسپ ہونے کے علاوہ آئندہ آنے والی زندگی کا ایک مفید سبق اور عصمت ایجنسی نے قابل مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر لڑکی کے مطالعہ سے گذرے تاکہ دنیا کے نشیب و فراز اور زندگی کی تمام ضرورتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے قیمت دس آنہ

نشتر فرنگ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ کی بیش بہا تصنیف جس کا ایک ایک حرف لڑکیوں کے واسطے نعمت ہے عصمت ایجنسی نے مصنف موصوف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت اور لاگت سے تیار کی ہے۔ زبان کا لطف سلیقہ تمام قصہ کی دلچسپی۔ غرض اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف دلچسپ ہی ہے بلکہ لڑکیوں کے واسطے نہایت مفید ہے۔ خود قابل مصنف کا نام اس بات کی کافی ضمانت ہے کتاب کس قدر قیمتی ہوگی قیمت مجلد آٹھ آنے (۸)

لڑکیوں کی انشا جس کا ایک ایک خط دلچسپ ہونے کے علاوہ لڑکیوں کے واسطے ایک نصیحت کا دفتر ہے مولوی محمد عبد الاکرم صاحب فرخ کا نام ہی اس کتاب کی خوبیوں کے واسطے کافی ضمانت ہے۔ قیمت ایک آنہ پیسہ خریداران عصمت سے (۸)

مجذوب کی بڑ

صبح کو جب روز روشن آشکارا ہو گیا — یعنی وہ سلطان مشرق کار فرما ہو گیا
ظلمتِ شب کا اثر آنکھوں سے سب جاتا رہا — ذرّہ ذرّہ روشنی میں دُرِّ یکتا ہو گیا
چار سو چلنے لگی کیسی ہوائے زمہریر — روح پرور جانفزا ہر ایک جھونکا ہو گیا
خامشی میں لے رہا تھا میں تصور کے مزے — سر میں پیدا خود بخود شورِ جنوں زا ہو گیا
چھا گئی آنکھوں میں حالت خوابِ مقناطیس کی — عالمِ ارواح پیشِ چشمِ بینا ہو گیا
شیشۂ دل بن گیا دورِ جنوں میں جامِ جم — مغزِ سر میں مرتسم اک نقشِ زیبا ہو گیا
دیکھتا کیا ہوں کہ ہے رخِ کتابی روبرو — دفعتہً میں مائلِ تصویرِ لیلا ہو گیا
غش پہ غش آنے لگے دیکھی جو وہ تن کی کل — منظرِ دلکش فروغِ طورِ سینا ہو گیا
وقتِ نظارہ تھا میں ساغر کشِ صہبائے حسن — بیخودئ شوق میں محوِ تماشا ہو گیا
ساغرِ میخانۂ جاوید حاصل تھا مجھے — فیضِ ساقی سے میں رندِ بادہ پیما ہو گیا
دین و دانش کھو کے پایا ایک لطفِ بے حساب — ملتِ پیرِ مغاں میں مل کے رسوا ہو گیا
پرتوِ روح القدس گویا شرابِ ناب تھی — دل مرا آئینۂ حالاتِ اشیا ہو گیا
دیدۂ دل بن گئے صغریٰ و کبریٰ کی مثال — اور نتیجہ یہ کہ لطفِ مے دوبالا ہو گیا
ہستئ موہوم کو سمجھا میں اک نقشِ حباب — صورتِ دریائے بے پایاں ہیولا[۵۲] ہو گیا
ایک ہی حسنِ جہاں آرا نظر آیا مجھے — نظمِ عالم بستۂ ترکیبِ اجزا ہو گیا
ایسا کچھ دیکھا کہ بس ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے — طائرِ ادراک میرا بالِ عنقا ہو گیا
ذہنِ عالی نے دکھائے کیسے کیسے سبز باغ — ولیہ رازِ گلشنِ ایجاد افشا ہو گیا

۵۱- میسمریزم - ۵۲- ہیولائے عالم -۱۲-

کلکِ قدرت کی نظر آنے لگیں صنّاعیاں — نخلِ خرما بڑھتے بڑھتے نقشِ طغرا ہوگیا
طبعِ معنی خیز میں پیدا ہوئی بالیدگی — تازہ مضمون خوشۂ زر کا ثریّا ہوگیا
کنزِ مخفی تھا مرے سینے میں نورِ معرفت — مطلعِ انوار یہ قلبِ مصفّا ہوگیا
تھا ازل سے دفینۂ علمِ اسما بالیقین — تخمِ روزِ اولیں دیکھا تو طوبیٰ ہوگیا
ایک تصویرِ خیالی تھی مرے پیشِ نظر — اور میں ہر لحظہ محوِ حسنِ اعضا ہوگیا
حیرت افزا تھا تماشائے جمالِ دلربا — صورتِ آئینہ گویا مجھکو سکتا ہوگیا
وہ بتِ بیدادگر نازک کمر نازک خرام — دوش پر زلفِ رسا دل جسپہ شیدا ہوگیا
حسنِ عارض دلستاں رشکِ بہارِ بوستاں — قد کہ یا سروِ رواں یا حشر برپا ہوگیا
وہ لٹوا آنکھیں سحر فن ہر اک ادا میں بانکپن — وہ معمّائے دہن تقریر سے وا ہوگیا
ہنسکے فرمایا کہ اے سرمستِ جامِ بیخودی — خوابِ غفلت میں ہے کیوں آخر تجھے کیا ہوگیا
ہر طرف سرگرم ہے بازارِ یونیورسٹی — علم کا ہر سر میں پیدا آج سودا ہوگیا
اک خمارِ مستیٔ دوشینہ سر سے دور کر — پیشِ پا افتادہ جب یہ کارِ فردا ہوگیا
ہند میں بنجائے اسلامی اگر دارالعلوم — پھر یہ سمجھو وصل کا میرے سہارا ہوگیا
علم کی دیوی ہوں میں اک پیکرِ علوی ہوں میں — میرے سائے سے ہرا باغِ تمنّا ہوگیا
گلشنِ اسلام میں آتی ہے اب فصلِ بہار — لو مبارک عیش کا سامان مہیّا ہوگیا
بلبلوں نے باغ میں ڈالی ہے طرحِ آشیاں — نالہ ہائے زار سے اک شور برپا ہوگیا
یادگارِ اوجِ قومی پر عیاں ہونیکو ہے — صفحۂ دنیا پہ جیسے بیتِ حمرا ہوگیا
چھوڑدو پابندیٔ تقلیدِ شیخ و برہمن — جبہ سا یہ آستاں رشکِ کلیسا ہوگیا

سنکے باتیں اس بتِ کافر کی میں بھی اے سفیر
کشتۂ اندازِ اعجازِ مسیحا ہوگیا

سفیر

روس میں اسلام

اب سے کئی سو برس پہلے مشرقی روس میں فنی اور ترک آباد تھے ان قوموں کے مختلف قبیلوں کا مذہب بت پرستی تھا، جب ملت اسلام عالم کون ومکاں میں جلوہ افگن ہوا۔ تو اسکا پرتو اس سرزمین پر بھی پڑا۔ اور طالبان راہ حق ظلمت کے بحر زخار سے نکلکر صراط مستقیم پر آنے لگے، تیرہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کی تعداد غیر مسلم و بُت پرست اقوام کے جم غفیر میں اتنی تھی جیسے شب تار میں چند تارے کہ تاتاری وسط ایشیا سے طوفان کی طرح اُٹھے، اور اصلی باشندوں کو مارتے ہٹاتے ملک کو زیر نگین کرتے بلدہ کزان میں آکے ٹہیرے، تھوڑے زمانہ بعد شمال و مغرب کے مزید اضلاع کو تسخیر کیا، کزان کو مفتوحہ ملک کا دارالامارت بنایا اور اس پر ایک خان یا گورنر مامور کیا۔ شروع شروع میں تاتاری خود بت پرست تھے، لیکن رفتہ رفتہ اسلام کے دائرہ میں آگئے۔ ان کے ورود پر نصف صدی بھی مشکل سے گذرنے پائی تھی کہ اس حصہ روس میں اسلام کا بول بالا ہوگیا۔ دو صدی تک تاتاریوں نے ملک کو انگوٹھی میں نگینہ کیطرح جڑے رکھا یک بیک باد مخالف چلی، زمانہ نے کروٹ بدلی، اور ہر کما لے را زوالے کے خدائی قانون نے ملک کو تہ و بالا کردیا۔ تاتاریوں کا ستارۂ اقبال نکبت و زوال میں آیا۔ اُن کی تلوار آبدار میں وہ جوہر نہ رہے چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں مغربی روس کی عیسائی طاقت نے

مملکت قزان کو اپنے ملک میں ختم کر لیا - ہلال کی بجائے صلیب پھریرے پر لہرانے لگی -

قزان جو اسلامی علم و عمل کا مرکز تھا، اب عیسوی تبلیغیوں کا صدر مقام قرار پایا، اور روسی چرچ کے مشنری انجیل کی تعلیم و تلقین میں مصروف ہوئے - لاٹ پادری گری اور دیگر پرجوش بطریق بشپ کی متحدہ کوششوں سے ابتدا میں تھوڑے سے بت پرست عیسوی گلہ میں داخل ہو گئے - ان کو "استارہ کرشت شینی" یعنے قدیم بپتسمہ یافتہ گروہ کا لقب دیا گیا - بطریق اعظم گری قزان کے دست راست بشپ ..... وارسنو کے انتقال کے بعد تثلیث ثلثہ کا طلسم ٹوٹ گیا - اور استارہ کرشت شینی اپنے آبائی مذہب پر آ گئے -

اس کے بعد حامیان توحید فی التثلیث نے انتہا درجہ جد و جہد کی لیکن ..... ہی بگڑی ہوئی بگڑ ان کے دم میں نہ آئی - جب روحانی ہتھیار کند پڑ گئے تو گورنمنٹ سے مدد مانگی گئی - چنانچہ صیغۂ کلیسا کی التجا پر روسی گورنمنٹ نے بپتسمہ پانے والے لوگوں کو مختلف دنیاوی فوائد، مراعات اور انعام کا لالچ دیا - بت پرست قیدیوں کو مذہب عیسوی قبول کرنے پر رہا کر دیا - ٹکس اور زمین کا محصول وغیرہ معاف کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بت پرست اقوام کی ایک تعداد کثیر نے نیا مذہب قبول کر لیا - مگر یہ لوگ جب پادریوں کی نگرانی سے آزاد ہو گئے تو مقدس ثلث ثلثہ کو ..... ہاتھ سے سلام کر کے رسول مقبول کے دین میں آ گئے -

بیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں عیسائیوں کی طرف سے ان حملات کے سدباب کرنے کی سمت جو کوشش ہونی چاہیئے تھی ..... ہوئی مدرسے، جنہیں تعلیم روسی زبان میں ہوتی تھی - مکتب کے

اصلی باشندوں پر اچھا اثر نہ ڈال سکے۔ بہرحال دولت روس نے کئی بار صحیفہ مقدسہ کو قبائل کی مقامی بولیوں میں ترجمے کرا کے شائع کیا۔ مگر یہ ترجمے ناقص تھے اور لوگوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ قبیلوں کی مختلف زبانیں جاننے والے پادری نہ تھے، ان کی زبان میں کتابیں نہ تھیں اور نہ باقاعدہ مدارس تھے، اس لیے عرصہ مذکورہ بالا میں ہزارہا بپتسمہ یافتہ تاتار، شواشیر اور دوسری قومیں مسلمان ہوگئیں۔

اسوقت تک اسلام کی بنیادیں نہایت مستحکم ہو چکی تھیں، گو اصنام پرست اقوام اسلام کی اشاعت میں بہت کچھ سینہ سپر رہیں۔ لیکن امتداد زمانہ میں انکے شبہات زائل ہوگئے، خیالات میں انقلاب ہوگیا، اور اسلام کے فضائل دلوں پر اچھی طرح چھا گئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں بہت سے جدید بپتسمہ یافتہ تاتار و کرشٹ شینی "نہایت راسخ العقیدت مسلمان ہوگئے تھے اور قدیم بپتسمہ یافتہ تاتاریوں کے اصول مذہب بھی اسلام کی کسوٹی سے رگڑ کھا کر کھرے ثابت ہو چکے تھے چنانچہ امید تھی کہ کچھ زمانہ بعد تمام بپتسمہ یافتہ و دیگر اصنام پرست قومیں مسلمان ہو جاتیں اگر پروفیسر ایلنسکی مشہور مستشرق روحانی جنگ کا بیڑا نہ اٹھاتا اور گورنمنٹ مذہبی آزادی پر تیغ نہ لگاتی۔ یہ شخص کلیسائی اکاڈمی اور بیت العلوم کزان کا پروفیسر تھا۔ عربی، فارسی، ترکی اور دیگر مشرقی زبانوں میں کامل مہارت رکھتا تھا اور فلاڈلفیا (امریکہ) کی اکاڈمی آف سائنس کا بھی ممبر تھا۔

۱۸۵۷ء میں پروفیسر موصوف نے کتب مقدسہ کے بپتسمہ یافتہ تاتاری اقوام کی زبانوں میں ترجمے شروع کیے۔ مگر تاتاریوں کی علمی زبان سے السنہ (عربی) کی فصیح تراشوں اور بلیغ مصطلحات سے مرصع تھی۔ صحرا نورد قومیں انہیں

خاک ہی نہیں سمجھ سکتی تھیں، اسلیے اس نے اپنا ترجمہ ان لوگوں کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں جیسے
کیسے کیا۔ اس شخص میں تعصب خانی جوش کی طرح بھرا ہوا تھا۔ اور نہ صرف اسلام سے
بلکہ اسکی ہر چیز سے انتہا درجہ بغض رکھتا تھا۔ اس نے عربی کے غلط العام لفظوں کا بھی
جہاں تک بن پڑا قلع قمع کیا اور اسپر مستزاد، تاتاریوں کا رسم الخط عربی طرز پر تھا اسکو
بھی اڑا دیا۔ اور اسکی بجائے سلیویا روسی حروف تہجی کو رائج کیا۔ ایلنکی کا دلی مقصد
یہ تھا کہ وحشی اقوام میں سے وہ تمام باتیں جن میں مسلمانی کی ہلکی سی جھلک یا عربی
کی فدائی یا چاشنی نظر آئے اٹھا دے، اسکا ساتھ دینے کے لیے ہزارہا عیسائی
اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ عیسائیوں کی اس باقاعدہ اور دولتمند جماعت نے
ایلنکی کی سرکردگی میں خانہ بدوش اقوام کی مختلف بولیوں میں انجیل تبلیغ کی
اس کے بعد کلیسائی اصول کے مطابق گاؤں در گاؤں مدرسے کھولے؛
بپتسمہ یافتہ گروہ کے متعدد افراد کو بیش قرار تنخواہوں پر مقرر کرکے دیسی اقوام
میں بھیجا۔ روسی گورنمنٹ نے جو مسلمانوں کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کو
دیکھکر چوکنی ہوگئی تھی، اس تحریک کا صدق دل سے خیر مقدم کیا، اور ایلنکی
کی دامے درمے ہر طرح مدد کی۔ چنانچہ اس شخص نے گورنمنٹ کی اعانت اور
محب عیسویت کی مالی وعملی دستگیری کی بدولت، ۳۵ سال کی لگاتار کوششوں
اور جانبازیوں سے، پادریوں کے شمار کے مطابق، اسی ہزار وحشی وبت پرست
آدمیوں کو صلیب کی پناہ میں لیا۔ ۱۸۹۱ء میں ایلنکی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے
بعد اس کے رفقا نے عیسائی بنانے کا کام بڑی سرگرمی سے جاری رکھا اور اسے
خوب ترقی دی۔ ایلنکی نے اپنی زندگی میں ایک ترجمہ کرنے والی کمیٹی بھی قائم کی تھی
جس نے مذہبی کتابوں کا ترجمہ شائع کرنے کے علاوہ درسی کتابیں، قصے کہانیاں
کتب سیر وتواریخ، طبی وزرعی، اور اصناف علوم کی مختلف کتابیں انطباع

گیس جنکی تعداد سنہ ۱۹۱۱ء تک ۱۹۔یا ۲۰۔مقامی زبانوں میں ۹۰۰ کے قریب پہنچ چکی ہے
النسکی نے واقعی میں توسیع واشاعت مذہب میں بہت بڑا کام کیا۔ مسلمان تو
توحید فی التثلیث" کے "برتر از ادراک وفہم" گورکھ دہندے میں کب مبتلا ہونے والے
تھے۔ لیکن قسیسوں کے اس گروہ نے اصنام پرستوں کو ثلث ثلثہ کی پرستش کی
لاینحل فلاسفی کے گرداب میں ایسا ڈالا کہ ہزار ہا بلکہ ایک لاکھ سے اوپر آدمی اب
اسمیں غرق ہیں۔ بہرکیف اسلام کے قدم اچھی طرح جم چکے تھے اور اس کی
کشش مقناطیسی تہوڑی بہت عیسوی بہیڑوں کو راہ پر لگاتی تھی۔ مگر سنہ ۱۹۰۵ء
تک اُسے وہ بات نصیب نہیں ہی تھی کہ "ویسلز آف دی لارڈ" کا گلہ بڑھی
چسر سپاہی کی ستی توڑا کر اسلام کے قلعہ امن وسکون میں آجاتا تھا۔ کلیسا
کی نگہبانی کے علاوہ گورنمنٹ روس نے تبدیل مذہب یا مسلمان ہونے کے
متعلق نہایت جابرانہ قانون منضبط کر دیے تھے اور مذہبی آزادی جو دنیا
کے ہرایک مہذب ملک میں باشندونکو حاصل ہے، یہاں نام کو بھی نہونے
کے باعث لوگ علی الاعلان مسلمان نہیں ہو سکتے تھے بلکہ در پردہ اس کے
روحانی فیض عام سے مستفید ہو رہے تھے۔ چنانچہ ۱۷۔اپریل سنہ ۱۹۰۵ء کی
مذہبی آزادی کا فرمان اجرا ہوتے ہی وہ تمام عیسائی جو پچھلی نصف
صدی میں دین اسلام کی برکات سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔
عیسویت کی جبری جہُول اتار کر آغوش اسلام میں آگئے۔ انکی تعداد عیسائی
لوگ چالیس ہزار بتاتے ہیں۔ اور سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک پانچ ہزار
سے دس ہزار مزید عیسائیوں کے قبول اسلام کا پادری لوگ
اندازہ کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سید شوکت دہلوی

پیام اجل

نہیں معلوم ہمکو کب کہ پیغامِ اجل آئے — مگر اک وقت ایسا ہو۔ کہ آکر ہم کو گھبرائے
عزیزوں میں ہوں بیٹھے۔ یا کہ ہوں پردیس کے اندر — کہاں پر جان لینے کو فرشتہ سر پہ آجائے
نہ دے فرصت کہ ملنے کو کسی کے ہم کریں چارہ — نہ دے مہلت کہ ہمکو دیکھنے کو کوئی راہ پائے
زن و فرزند رہ جاویں مگر مَل مَل کے اپنے ہاتھ — وہ ہونے کا سماں خالق نہ دشمن کو بھی دکھلائے
جو ہوں پسماندگاں کی حالتیں بھی رحم کے قابل — چلے جاتے ہیں پھر بھی جانے والے کس طرح ہائے
ارادہ اسکا کر لینا کہ تھوڑا وقت ہے باقی — یہ بہتر ہے اگر کچھ زادِ راہ بھی جمع ہو جائے
کرو نیکی۔ کہ اب ہے وقت تمکو مل گیا تھوڑا — غنیمت جان لو یہ دم کہ آئے یا نہیں آئے
اسے سمجھو کہ آپ ہو بھی نہ غافل اس سے ہو جانا — کھڑی ہی موت ہے سر پر جو کہ ہستی کو مٹا جائے
نہیں معلوم ہیں اے برق کیا لینے کو آئے تھے — کہ حسنِ حوریاں گور کی مٹی جہاں کھائے

شہد کی مکھی

محنت سے اپنے ہوتی مشہور ہے یہ مکھی — دولت بڑی کما کر مسرور ہے یہ مکھی
اور کاہلی سے دیکھو معذور ہے یہ مکھی — ہمت بلند کرنے مجبور ہے یہ مکھی
کتنی ہی مکھیاں ہیں صورت میں اس سے اعلیٰ — لیکن نظر میں سب کے منظور ہے یہ مکھی
اِک بوند رس کی خاطر لاکھوں ہی پھول ڈھونڈے — کوشش سے پھر نہ گاہے مشکور ہے یہ مکھی
حیراں ہیں مہندس اِسکی عمارتوں سے — ہر لب پہ ذکر اس کا۔ مذکور ہے یہ مکھی
محنت کریں جو انساں دولت سے گھر بھریں وہ — نکتوں سے حکمتوں کے بھرپور ہے یہ مکھی
ہیں انتظام اس کے اک سلطنت سے بڑھکر — سب نظم و نسق میں ہی منصور ہے یہ مکھی
کچھ رلیناں ہیں انہیں ہر سر محال پر اب — بیکار جو کہ بیٹھے۔ مقہور ہے یہ مکھی
محنت میں نام اس کا اے برق بڑھ گیا ہے — خدمت پہ اپنے ہر وقت مامور ہے یہ مکھی

میر کریم الد ۲۰، ۱۹،

پیٹ کی منگنی

اگر سلمہ نے زاہدہ کے ٹھیکرے میں روپیہ ڈالے تو کیا نئی بات ہوئی۔ اور کونسا گناہ کیا۔ ظاہر تھا کہ سلیم کے لیے زاہدہ سے اچھی دلھن کہاں ملے گی حقیقی چچا کی لڑکی۔ ایک دادی کے پوتا پوتی عمر میں بھی صرف دس مہینہ کا فرق ایک سال کی پیدائش، وفاتوں میں ہوئے میاں سلیم اور خالی میں ہوئیں بی زاہدہ اور پھر اللہ رکھے دونوں اپنی ماں کے پیلوٹھی کے بچے اور ماں باپ بھی کیسے۔ سلمہ زاہدہ کی خالہ اور شریف سلیم کے چچا۔ اگر نابچوں میں رسم ادا ہوئی تو کیا زیادتی ہوئی ابھی زاہدہ پیٹ ہی میں تھی کہ بات چیت ہو چکی تھی۔ اور سلمہ بیچاری پر ہی کیا منحصر ہے؟ خود نفیسہ ہنسی خوشی سنتی اور جب بات نکلتی کبھی ہاں کے سوا نہیں نہ کہتی۔ خالی کی ساتویں جمعہ کے دن جب بی زاہدہ اپنی قسمت کا لکھا پورا کرنے اس دنیا میں تشریف لائی ہیں تب تو گویا بات پکی ہی ہوگئی۔ ادھر دائی کے منہ سے نکلا۔ لڑکی ہوئی، ادھر سلمہ نے پیغام دیا اور ٹھیکرے میں روپیہ ڈال کر گویا مہر کر دی۔ بھرا پُرا گھر کچھ نہ ہوگی کچھ نہ ہوگی تو چالیس پچاس بیویاں تو ہونگی اور پھر کیسی سب ایک کف ایک خاندان کی۔ سب ہی نے سُنا اور سب ہی نے پسند کیا۔

زمانہ کے بھی عجیب رنگ ہیں اسکی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ ایک امیر ہے تو ایک غریب ایک خوش ہے تو ایک رنجیدہ۔ ایک ہنستا ہے تو ایک روتا۔ ایک کماتا پیتا ہے تو دوسرا ننگا بھوکا اگر اکرم اور شریف بھائی بھائی تھے تو ا

نتیجہ نہیں نکلتا کہ دونوں قسمت بھی ایک ہی لکھوا کر لاسکے بلکہ زمانہ گذرتا گیا اور دونوں بھائیوں کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا گیا۔ ایک کے دروازہ پر ہاتھی جھومتے تھے تو دوسرے کے دروازہ میں کوا بھی نہ تھے مگر اگر امیر تھے تو اپنے گھر کے اور شریف بیچارہ غریب تھا تو اپنے لیے۔ خدا کو منہ دکھانا ہے تنخواہیں کہیں گے تو اور تہوار میں کہیں۔ گئے تو کہیں گئے بیچی ایک وہ نہیں اسکے پانچ بچوں کا ساتھ۔ قحط کا زمانہ اور کل ۵۰ روپیہ مہینے کی آمدنی !!! پانچ بچے دو نیاں بیوی ایک ساس اوپر سے بھنگی بہشتی سب ہی کا خرچ تھا۔ مگر واہ ری رفیقہ سارے جہاز کو چلا رہی تھی مگر کیا مجال کوئی کانوں کان بھی خبر ہو جائے۔ بہن نے مشروع اور کمخواب پہنے تو اسنے سوسی پہنی۔ وہاں روز نئے نئے تھان پھٹے تو اس نے پیوند لگا کر گذر کی۔ کیسے گیہوں کھائے تو اس نے چنے کھا کر ہی خدا کا شکر ادا کیا۔ وہاں ایک چھوڑ دس دس دائی کھلائی۔ نوکرنیاں۔ مامائیں تھیں۔ تو اس نے خود بچوں کو بھی کھلایا کھانا بھی پکایا اور سی کر بھی پہنایا۔ مگر کسی دن بہن کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ ہاتھ پھیلانا تو بڑی بات ہے اس نے ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی کیا مجال جو اسکا کوئی بچہ کھانے کے وقت چچا یا خالہ کے ہاں جا نکلے۔ ہائے مفلسی میں آٹا گیلا۔ ساس پڑ گئیں بیمار۔ چھوٹے بچے کی نکلی چیچک خود کو شروع ہوا نواں مہینہ اور دو بڑے لڑکے کا آیا امتحان فیس بھی چاہیئے کتابیں بھی باہر امتحان دینے جائے گا۔ ڈھنگ سلیقہ کے چار کپڑے بھی ہوں۔ میاں بیچارہ گم سم۔ فکروں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا۔ نہ اٹھائے بنتی ہے نہ دھرے بنتی ہے کیا کرے کیا نہ کرے۔ مگر اوس بیوی بندی کو دیکھیے

کہ اس حالت میں وہ میاں کی بھی دلدہی کرتی۔ ساس کی بھی خدمت کرتی بچوں کو بھی پالتی اور گھر کا سارا کام سینا پرونا۔ کھانا پینا بھی کرتی سوائے اس کے دوسرا کون کرنے والا بیٹھا تھا۔ مگر ہم پھر یہی کہیں گے کہ اس اللہ کی بندی کے منہ پر سوائے شکر کے کبھی شکایت نہ آئی +

سچ ہے وقت پڑے پر کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ بھائی بھائی کو اور بہن بہن کو بھول جاتے ہیں سلمہ اور رفیقہ ایک ماں کے پیٹ کی دو بہنیں اور اکرم اور شریف ایک باپ کے دو بیٹے مگر زمانے نے انہیں اتنا دور کر دیا اتنا غیر کر دیا کہ گویا کوئی رشتہ ہی نہ تہا۔ وہی سلمہ جو کبھی رفیقہ پر جی جان چھڑکتی تھی۔ غریب بہن کو ایسی بھولی کہ بھول کر بھی یاد نہ کیا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ اگر وہ پوچھتے بھی اور مدد کو طیار بھی ہوتے تو رفیقہ ایسی نہ تھی جو اوس کی پھوٹی کوڑی کی بھی روادار ہوتی۔ وہ کہتی تہی اور کھلے خزانہ کہتی تہی کہ فاقہ کروں گی بھوکی مروں گی مگر اپنے عزیزوں کی دست نگر نہ ہوں گی۔ اور تو اور وہی سلمہ جو زاہدہ کو مانگ چکی تھی وہی سلمہ جو سلیم کو رفیقہ کی خدمت میں دیکھ چکی تھی جب اپنا وقت آیا اور غریب رفیقہ نے نثار کے لیے ریحانہ کو مانگا تو صاف انکار کر گئی۔ بہن بھانجے کا خاک بھی تو خیال نہ کیا۔ مانا کہ رفیقہ غریب تہی مفلس تھی۔ مگر تھی تو اسی کی بہن خون تو ایک تھا۔ ایک نانی کے نواسی نواسہ اور ایک دادی کے پوتی پوتا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ غریب نثار کو ریحانہ سی امیر دلہن نصیب ہو جائے۔

جہاں رفیقہ میں اور بہت سی خوبیاں تہیں وہاں چند عیب بھی تھے وہ جاہل تھی منہ پھٹ تہی موقع اور مصلحت اوس کے یہاں کوئی لفظ

نہ تھی۔ بس کا انکار کرنا تھا کہ بس آگ ہی تو لگ گئی سا ایری غریبی کا خیال بالائے طاق رکھ وہ کھری کھری سنائیں کہ سلمہ کا جی ہی جانتا ہوگا کہیں اور ہزاروں میں کہیں سنائیں اور بیچ کھیت سنائیں۔ بات کہنے میں آتی ہے آخر وہ کس بات میں کم تھی۔ دونوں بہنوں میں خوب خوب چوٹیں ہوئیں۔ مگر وادری رضیفہ نا امید ہو کر بھی اپنی بات پر جمی رہی اور زاہدہ کا نام بھولکر منہ سے نہ نکالا۔ بھڑکانے والوں نے بھڑکایا اور لگانے والوں نے لگائیں مگر اس نے سب کی سنی ان سنی کر دی۔ اگر کوئی کہے کہ امیر گھر تھا۔ زاہدہ کو سلیم سا امیر دولہا کہاں نصیب ہوتا۔ ایسے خاموش ہو رہی ہوگی۔ مگر نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ سلمہ زاہدہ کی خاک نہیں ساس ہوگی اور آپس کی لڑائی نے زاہدہ بیچاری کے راستہ میں کانٹے بچھا دیے ہیں پھر بھلا جانتے بوجھتے کوئی اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اس طرح چولہے میں جھونکدیتا ہے کہ وہی ایسا کرتی۔ مگر نہیں۔ اسے خیال تھا تو اپنی بات کا اور قایم تھی تو اپنے وعدہ پر۔ ورنہ ایک غریب مفلس کو بیاہ دیتی اور سلیم کا نام بھی نہ لیتی۔ اپنی اپنی قسمت کا سب لکھا لائے ہیں زاہدہ کی روزی تھی سلیم ہی کے ہاتھ میں نہ تھی وہ بات کی پکی یاد کرتی تھی اس وقت کو جب اوس نے حامی بھری۔ روتی تھی اوس بدنصیب کی قسمت کو جو ایسی ساس کی بہو بنکر جائے گی

صبح سے شام ہوئی اور شام سے صبح۔ جاڑوں سے گرمی۔ گرمی سے برسات اور برسات سے پھر جاڑے اور اس طرح دنوں سے مہینے اور مہینوں سے سال گذرتے گئے۔ پیدا ہونے والے پیدا ہوئے اور مرنے والے

مرے مگر نہ آئی موت تو اون بدنصیبوں کو جنہیں ابھی دنیا میں بہت کچھ مصیبتیں جھیلنی تھیں جنھیں اپنے عزیزوں بھائی بندوں اور تو اور ماں باپ کے ہوتے ہوئے ایک نگاہ محبت کو ترس ترس کر کڑھ کڑھ کر مرنا تھا۔ جو گھڑی جو ساعت گذرتی وہ زاہدہ کمبخت کو اوس راستہ کے قریب کرتی جاتی جس میں اوسے غیروں سے کے نہیں، خود اپنے ماں باپ کے بوئے ہوئے کانٹوں پر سے گذرنا تھا۔ اب وہ کوئی بچہ نہ تھی جو کچھ سمجھتی نہو سب کچھ سمجھتی تھی سب کچھ جانتی تھی مگر کیا کرتی؟ دل تو کہہ رہا تھا مگر کیا زبان بھی کہہ سکتی تھی کہ میری اچھی اماں اپنے رسم ورواج اپنے قول وقرار اپنی لڑائی بھڑائی کے دیوتاؤں پر ایک غریب بے کس کم نصیب لڑکی بدنصیب زاہدہ کی قربانی مت چڑھاؤ۔ جب آپس کی نزاع نے میری قسمت کے لکھے کو بھی بدل دیا تو پیر امارت کو کیا میں آگ لگاؤں گی للہ اوس منحوس گھڑی سے مجھے بچاؤ جو سر پر بھوت کی طرح چڑھے آتی ہے خدا کے واسطے میرے حال پر رحم کرو تمہیں اپنی ماںتا کا واسطہ مجھے خالہ جان کے غصّہ اور انتقام کی آگ میں جانتے بوجھتے جھونکو اگر تم کسی غریب مفلس کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دو گی تو میں خوش میرا خدا خوش مگر للہ امیر سلیم کی دلہن بنا کر مجھ بدنصیبوں جلی کے جنم میں کیڑے مت ڈلواؤ۔ کاش وہ یا کوئی ہندوستان کی لڑکی اپنی زبان سے بھی ایسا نکال سکتی +

اے ہندوستان مقدس ہندوستان کی شریف زادیوں باعصمت کی دیویاں!! اسعادتمند لڑکیوں!!! ایسی خاتونیں جو اپنے والدین کی بیجا خواہشوں کی قربانی کے واسطے پیدا کی گئیں۔ اور جو سعادتمندی کے

زیور سے ایسی آراستہ تھیں کہ اپنے ماں باپ کی بیجا خواہشوں اور نا روا حقوق کے پر خار راستہ پر ننگے پیروں نہیں بلکہ سر جھکائے اپنی آنکھوں سے گذر گئیں زمانہ تمھیں کبھی نہ بھولے گا۔ کیا ہوا اگر انہوں نے تمھاری طرف سے خون سفید کر دینے غیر تمھاری بیکسی کی موت پر روتے ہیں اور روئیں گے آسمان خون کے آنسو بہاتا ہے اور بہائیگا۔ زمین کو زلزلہ آتا ہے اور آئیگا اور آخر کو اُس احکم الحاکمین کی عدالت میں جو سب پر غالب ہے۔ تمھاری دادخواہی کریں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمھاری سعادتمندی تمہیں اس عدالت میں بھی چارہ جوئی کرنے سے باز رکھے گی مگر جان لو کہ وہ عالم الغیب تمھارے دلوں سے واقف ہے اور اُس کا انصاف کبھی روادار نہ ہوگا کہ اُس کی بے زبان مخلوق کمزور مخلوق پر ظالم یہ کچھ ستم توڑیں اور صاف بچ جائیں نہیں ہرگز نہیں۔ ہم تم نہیں سب دیکھیں گے۔ آسمان و زمین دیکھیں گے اور دیکھیں گے۔ جاندار و بے جان دیکھیں گے اور کانپیں گے کہ وہ عادل حقیقی جس کی ایک صفت قہر بھی ہے کس طرح تمھاری دادرسی کرتا ہے اللّٰہم حفظنا۔

باقی دارد

ضیار عباس بدایونی

... شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنہوں نے تمدن کی توسیع اشاعت میں حصہ لیا
... جنر ... وحید احمد صاحب فاروقی۔ ایم لطیف احمد صاحب بمبئی۔ مسٹر عبدالحکیم صاحب ... خیال ... ن عسکری صاحب مرزاپور۔ مولوی عبدالرزاق صاحب سنبھل۔ شیخ غوث محمد صاحب ہیڈ ماسٹر فتی ... ل احمد صاحب بھوپال۔ نواب سید ابوالقاسم خانصاحب لکھنؤ۔ ڈاکٹر محمد سلیمان خانصاحب شموگہ ... بنت ... الباقر صاحبہ۔ قاری سرفراز حسین صاحب میرٹھ۔ شفاعت حسین صاحب ... پوری مولوی محمود حسن صاحب ٹونک ... منشی ... صاحب ...

مگر کیا دیکھا؟

دلی دیکھی، دلی والے دیکھے، گورے دیکھے، کالے دیکھے، بستی، بستی کی رونق، بستی والوں کے کارنمایاں، جو کچھ دیکھا، دل کھولکر دیکھا، اور پیٹ بھر کر دیکھا، مگر کیا دیکھا؟ ایک قصبہ دیکھا، جس کے مرغزار، ایک گھر دیکھا جس کے در و دیوار، عبرت کی داستان سناکر، آٹھ آٹھ آنسو رولا رہے تھے؛

چودھویں تاریخ کا آسمان سر پر تھا، رات آدھی کے قریب گذر چکی تھی، اور دریائے جمنا قلعہ شاہجہانی کو کنارہیں سے لہریں لے رہا تھا، شہر کا چپہ چپہ، چوتھی کی دلہن بنا ہوا تھا، رعیت شاد، دل آباد، بڈھے شاداں، بچے فرحاں، غرض ہر پیر و جوان، تاج برطانیہ کی ترقی کا طلب گار تھا،

سر بفلک عمارتیں دیکھیں، زمیں دوز زیارتیں دیکھیں، دیسی دیکھے بدیسی دیکھے، باجے دیکھے گاجے دیکھے، مگر کیا دیکھا؟ وہ مکان دیکھا جس کے مکین؛ وہ آسمان دیکھا، جس کی زمین، اپنی کہانی سے سننے والوں کے دل ہلا رہی تھی۔

تقاضائے شوق، اور مدتوں کی آرزو، گلی گلی اور کوچے کوچے لیگئی مرحوم ذوق کے مکان کا پتہ اور نشان تک نہ تھا، ہر چند دل بیتاب تھا مگر اس زمین کی خاک بھی میسر نہ آئی جو کبھی ملک الشعرا کا مسکن تھی۔ البتہ ایک جنگل تھا، ہو کا میدان جہاں ہر طرف سے یہ صدا آرہی تھی،

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

تاہم وہ گلیاں آنکھ کے روبرو نہیں جن کے مقابلہ میں دکن کا زر و جواہر ہیچ تھا، قدم جن پتھروں پر پڑ رہے تھے انکا اسوقت زبان حال سے یہ کہنا ہمیشہ یاد رہے گا،

"کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر"

شہر کی چہل پہل، اور آبادی کی رونق سے فراغت پاکر، ان لوگوں کا دھیان آیا جو سرزمین جہاں آباد پر علوم کے ایسے فانوس روشن کر گئے جو مدتوں جگمگاتے رہیں گے، خاک دلی کا ہر ذرہ ان کے مقدس نام آنکھوں سے لگا رہا تھا اور گو ان کے فانی اجسام نیست ہو چکے تھے، مگر ان کی زندگیاں مٹ کر بھی آب و تاب سے چمک رہی تھیں +

شہر سے باہر نکل کر دیکھا تو ایک سناٹا چھایا ہوا تھا بڑے بڑے تاجدار خاک کی بستی میں پڑے سوتے تھے اور جن کے سینوں نے تخیل کے جواہرات سے خلق اللہ کو مالا مال کیا آج اپنے پتھروں کا ڈھیر تھا، جہاں آباد اُن کھنڈروں پر ناز کر رہا تھا، جن میں وہ لاجواب ہیرے اور موتی دفن تھے، جن کی آب و تاب، آج بھی قمر چہاردہم کو شرمندہ کر رہی تھی رات بھیگ رہی تھی، اور جنگل سنسان تھا، مگر اب آنکھ کے سامنے وہ چمنستان تھا جہیں خوش رنگ پھول ہر چہار طرف کھلے ہوئے تھے۔ سحر اپنے دامن سے ان مٹنے والوں کے مسکن پر جھاڑو دے رہی تھی اور ماہتاب اپنے ہاتھ سے ان کے چراغ روشن کر رہا تھا،

زندے دیکھے، مردے دیکھے، قبروں کے ڈھیر دیکھے، قسمت کے پھیر دیکھے، مگر کیا دیکھا؟

وہ خاک دیکھی جس میں تاج مغلیہ کے گوہر آبدار دبے ہوئے تھے، اور وہ مقبرہ دیکھا جس میں ہمایوں جیسا تاجدار موت کا شکار ہوا پڑا تھا، شاہان مغلیہ کی عظمت وجبروت اور دنیا کی ناپائداری کا نقشہ آنکھ کے سامنے تھا، عجیب مؤثر سماں تھا، آنکھیں بند ہوگئیں اور پہلو کی قبروں سے یہ صدا سنائی دی،

"تاج مغلیہ، کی بچی کھچی نشانیاں، ابھی چند بیگمیں دلی میں موجود ہیں، جن کے ہاتھ کام اور جن کی آنکھیں یاری نہیں دیتیں مگر پیٹ ان سے دن بھر ٹوپیاں سلواتا ہے اور اس طرح یہ بدنصیب شہزادیاں ٹوپیاں اور صدریاں سیکر اپنا پیٹ پالتی ہیں،

خدا ہز مجسٹی ملکہ مریم کی سلطنت میں وسعت اور عمر میں برکت دے توقع ہے کہ تشریف آوری کے موقعہ پر اپنی اس وفادار رعیت کو فراموش نہ کریں گی +

راشد الخیری

اعلان۔ قدردان تمدن اور حامی زبان اردو یہ سنکر خوش ہونگے کہ ہمارے ایک کرم فرما جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تجویز فرماتے ہیں کہ بیس پرچے قسم اوّل کے ان طلبا کے نام دوسری جلد آپ کی طرف سے جاری کئے جائیں جو نصف قیمت سے زیادہ تمدن کا چندہ ادا نہیں کرسکتے۔ تمدن اپنے محترم کے اس عطیہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے اور ہم نہایت خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ وہ دس مسلمان اور دس ہندو طلبا جو پورا چندہ ادا نہیں کرسکتے اپنی درخواستیں روانہ کریں اور ان کے نام (عہ) میں رسالہ ایک سال کے واسطے جاری کیا جائیگا۔

اڈیٹر۔

غزلیں

کوئی مجھ سا مستحقِ رحم و غمخواری نہیں
سو مرض ہیں اور لقا ہر کوئی بیماری نہیں

ہو گیا شاید کہ صرف سوز و غم سب خونِ دل
آنسوؤں کا اب وہ دریا آنکھ سے جاری نہیں

ہر قدم پر باغِ عالم میں بچھا ہے دامِ حسن
کون ایسا ہے جسے ذوقِ گرفتاری نہیں

عشق [illegible] اِس مرض سے وہ پریشانی بڑھی
میرے غمخواروں کو اب یارائے غمخواری نہیں

جان دیکر بھی جو ہاتھ آئے تو ارزاں جانیے
سہل ایسی جنسِ الفت کی خریداری نہیں

[illegible] کی جھڑکیاں ہم لاکھ کھائیں عشق میں
رازِ دل کہتا مگر شرطِ وفاداری نہیں

میری حالت دیکھ کر کیوں تم نے ٹھنڈی سانس لی
بیکسوں پر رحم آئینِ ستمگاری نہیں

مجھ سے عہدِ دردِ الفت کی شکایت ہے فضول
اے دلِ ناداں تجھے احساسِ خودداری نہیں

[illegible] کہاں یہ نا امیدی میں امید
دل کو خوش کرنا ہے شغلِ گریہ و زاری نہیں

ہم [illegible] چپ بیٹھے ہوئے لیکن ہے دل مصروفِ عشق
اِس عدیم الفرصتی کا نام بیکاری نہیں

آنکھوں سے نظر آتی ہے ہر شے دہر کی
عالمِ رویا میں فرقِ خواب و بیداری نہیں

[illegible] مجھ [illegible] سوزِ دل
ڈھونڈتے ہے تو راکھ میں اب کوئی چنگاری نہیں

ترکِ دنیا پر ملی یارانِ شاطر سے نجات
کنجِ عزلت میں نظر کچھ خوفِ عیاری نہیں

نیرنگ

[illegible] غم ہے کہیں مفلسی کی عید
ہوں جس کے پاس دام و درم ہے اسی کی عید

[illegible] ہر خوشی
یہ کیا کہ ہو کسی کا محرم کسی کی عید

[illegible] قوم کی امداد فرض ہے
مل جل کے ہو سبھی کی خوشی ہو سبھی کی عید

[illegible] ہوا جہاں سے جدا
ہر چند میٹھی عید ہو لیکن ہے پھیکی عید

یوں کر رہی ہے دل میں جگہہ بات بات پر جیسے ہو میری دوست پرانی کبھی کی عید
یارب تو مجھکو داغ محبت نصیب کر یارب ہو تیرا غم میری افسردگی کی عید
دل اسطرح سی جاں تیرے شوق دید میں گویا ہو روز مرگ میری زندگی کی عید

رکھتا ہے یاس تجھ سی شہادت کی آرزو
یہ خستگی کی داد ہے یہ بیکسی کی عید

المرسل- خاکسار حمید معتمد (اعزازی) (یاس ٹونکی)

پھر آج غیر کو نزدیک یار دیکھتے ہیں دکھاتا ہے جو ہمیں کردگار دیکھتے ہیں
کہیں چھپائے سے چھپتی ہے آنکھہ الفت کی نظر بچا کے ہم اونکو ہزار دیکھتے ہیں
خدا ہی خیر کرے آئے گی بلا کوئی کہ بزم میں وہ مجھے بار بار دیکھتے ہیں
کمال جوش یہ ہے الفت لب لالین ہم اپنے دل میں جو پنہاں شرار دیکھتے ہیں
مکدر آپ کا دل ہم سے رہتا ہے ہر دم اس آئینہ میں ہمیشہ غبار دیکھتے ہیں
خدا ہی خیر کرے یہ تڑپ معاذ اللہ وہ آج دل کو میرے بار بار دیکھتے ہیں
کہاں چھپاؤں بھلا اس کو اونکی نظروں سے وہ آج دل کو میرے بار بار دیکھتے ہیں
محال ہے کہ ہماری طرح سے دے کوئی دل حضور بزم میں کیوں بار بار دیکھتے ہیں

یہ کہہ رہا ہے ہر اک کچھہ بتائیے تو شہید
کمال آپ کو ہم اب بیقرار دیکھتے ہیں

حضور ملک معظم نے اپنی تشریف آوری سے جو فخر سرزمین ہند کو عطا فرمایا دلی کا چپہ چپہ اسکا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ ہمارے شہنشاہ کی خود تشریف لاکر رعیت کو اپنے دیدار سے مشرف کرنا وہ کرم خسروانہ ہے جو صدیوں بعد ہمکو میسر آرہا ہے۔ دلی دعا ہے کہ خداوند کریم شہنشاہ اور ملکہ معظمہ کا سایہ مدتوں ہمارے سر پر قایم رکھے جن کے عدل و کرم پر تمام رعیت کے دل فریفتہ ہو رہے ہیں +

[illegible] جس میں [illegible] عجیب و غریب بلا تصویر ہند ہر دو حصہ بجائے دو روپیہ کے ایک روپیہ آٹھ آنے میں ہے

وصل حبیب

[illegible] دیکھو ادا اُس کی بہار صورت | رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

شہرا تو یہی جہاں میں مرا فسانہ کیا
کہتی ہے مجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

[illegible] صاحب ارشد تھانوی - از بھوپال - امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

[illegible] صاحب - از بجنور - الحمد للہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول حسب دلخواہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر نور افزائے
چشم مشتاقین ہوا اسکی تعریف اور داد کی ضرورت نہیں - کہ آپ میں قابلیت خداداد ہے حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے
[illegible] اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر [illegible] صاحب سوداگر از ملتان - آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) [illegible] صاحب از ڈبائی ضلع بلند شہر - وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی - درحقیقت
آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

(۵) مولوی فصیح الدین صاحب از سنبھل مراد آباد - وصل حبیب دیکھا - ماشاء اللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کرکے
دل سے خوب کام لیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو [illegible] صاحب منصور - از دہلی - آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا - بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو [illegible] صاحب کندن از حیدر آباد دکن - آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر حصہ کو واقعی نہایت
عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

مولوی محمد [illegible] صاحب مترجم ٹرکو تھ بیا از آرہ - کتاب (وصل حبیب) کو نیکہ امید سے زیادہ لطف اوٹھایا عبارت
سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے چھوٹے چھوٹے مگر چست و برمعنے جملے مصنف کی پوری قابلیت کی شہادت
دے رہے ہیں عبارت کا زور اشعار کی ترتیب - جملوں کی ترکیب الفاظ کی بندش صاف بتلا رہی ہے کہ مصنف
کو مشرقی علوم پر کمال عبور ہے - مذکورہ بالا صفات نے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ہر ناول
کو ایک بار دیکھکر انسان آسودہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار میں کیا دس بار میں بھی سیری
نہیں ہو سکتی - یہ تو مونس تنہائی بن جاتا ہے - انتہے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد بابت ۱۹۱۱ء ناظرین واقف ہیں کہ ہم مخرب اخلاق ناولوں کے کس قدر مخالف ہیں وصل حبیب
کو ہم نے نکتہ چین نگاہوں سے بغور دیکھا - ہمارا خیال تھا کہ موجودہ لغو فسانوں کی طرح یہ بھی ہوگا - مگر کس قدر
خوشی ہوئی کہ مصنف نے بالکل ہمارے خیال کا چربہ اپنی تصنیف میں اوتار دیا ہے زبان کی سلاست تھیم اور بندش میں ایک
قابل قدر اضافہ کیا ہے - غرض ناول بلحاظ جودت بہت اچھا اور قابل قدر ہے - اور ایسے ہی کتابوں کی اشاعت کے ہم موید ہیں
(۱۰) [illegible] صاحب [illegible] سالہ ریاست کشمیر از سری نگر - وصل حبیب نے ہم کو مشتاق مصنف کا [illegible] بنایا ہے اوسکی بہجہ سے

مہتمم کتب خانہ حبیبیہ ڈاک خانہ گوہر گنج ریاست بھوپال

(نوٹ) فرمائش میں رسالہ ہذا کا حوالہ ضرور دیجئے (رعایتی فرمائش کے لیے ۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲- دسمبر ۱۹۱۱ء مخصوص ہیں علاوہ ان تاریخوں کے پوری قیمت لیجائیگی محصول ڈاک بذمہ خریدار)

راحت زمانی

مولوی سید احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک
نہایت سود مند کتاب ہے مصنف نے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی
ہے بیگماتی زبان قلعۂ معلی کے محاورے قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کئے
چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف
سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف
مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ر

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کیواسطے مولوی
عبدالراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کیواسطے کچھ لکھنا بے سود ہے
خط ایسا موثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ)
ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸)

جلد ۱ نمبر ۶

دسمبر ۱۹۱۱ء

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر۔ شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری دہلوی

قیمت سالانہ قسم اول ۴؎ قسم دوم ۲؎ تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۲۹ھ قیمت فی پرچہ ۶؎ مہتمم جعفر الزمان صاحب مینیجر دہلوی



تمدن

شہنشاہ و شہنشاہ بیگم شاہجہان آباد میں

دھن بھاگ اے سرزمین شاہجہان آباد! مدتوں پیچھے! اور صدیوں بعد!
تیری آنکھیں! اپنے شہنشاہ کے دیدار سے منور ہوئی ہیں! اگلے فسانے
بھول جا! قدر دانی کی آنکھوں سے دیکھ اور میزبانی کے آغوش پھیلا کر
اس حکمراں کا خیر مقدم کر! جو سات سمندر پار سے تیری عزت افزائی کو آیا!
چمنستان ہندوستان کے نونہالوں! تصور کی آنکھوں سے دیکھو!
دلی کا چپہ چپہ تم کو رنگ برنگ کے تماشے دکھائیگا! اور یہ بگڑ بگڑ کر
بسنے والی دلی! اپنی تاریخ سنا کر تم کو محو کر دے گی! یہی ہے وہ سرزمین
سر تیموری اور نادری تلوار نے خون کے دریا بہائے اکبر کی بے تعصبی

اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی! شاہجہانی عمارتوں کو دل میں جگہ دی۔ اور اورنگ زیب جیسے فرشتہ رحمت کی مقدس پیشانی اسی خاک پر حقیقی شہنشاہ کے حضور میں جھکی! جشن اکبری! اور شاہجہانی چہل پہل! کی دیکھنے والی دلی! مٹنے والی روحوں پر آج وفاداری کے پھول چڑھا! ہمایوں کی روح کو فاتحہ سے یاد کر! اور اُس بادشاہ کے حق میں دعائے ترقی و دولت و عمر کے نعرے لگا! جس نے تیرے اُجڑے دیار گل و گلزار بنا دیئے!

۷ر دسمبر ۱۹۱۱ء

کیسی مبارک رات اور خوشگوار صبح ہے! سینکڑوں بندگان خدا اپنے بادشاہ کے دیکھنے کو اندھیرے منہ گھر سے نکل پڑے! پردہ نشین بیبیوں کس طرح رات کاٹی؟ تمہاری مشتاق نگاہیں! تمہاری دلی دعائیں! شاہی سواری کے ساتھ ہیں! اور قدر دان بادشاہ! جس نے دلی کے جنگل کو منگل کر دیا! تمہارے اُجاڑ شہر کو آباد کر دیگا! دلی! ہائے دلی! بگڑی ہوئی دلی! دار السلطنت ہوگی اور خاک دلی کا ہر قدہ اس ذرہ نوازی کی داد دے گا! دیکھنے والوں تامل کی نگاہوں سے دیکھنا! مدتوں کی لٹی گھٹی دلہن آج اپنا بناؤ سنگار کرتی ہے! خدا اس کا سہاگ قیامت تک سلامت رکھے اور یہ تاج جس نے اس کا روپ بدلوا دیا مدۃ العمر اس کے سر پر لہلہاتا رہے!

سلیم گڑھ سے شاہی کیمپ تک مسلح فوجیں دو رویہ کھڑی ہیں وفاداری کا دریا ان کے دلوں میں لہریں لے رہا ہے اور مشتاق نگاہیں قلعہ معلی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں سیلانیوں کا ٹڈی دل غول

گوشۂ پیر اور پتھر کو نیچڑ کا نوپتہ اور چھتو نیر اس مبارک وقت کا انتظار کر رہا ہے جب سلامی کی توپیں فضائے عالم میں گونجکر شاہی تشریف آوری کی مبارک باد دلّی کے ہر گوشہ میں پونہچا دیں!

لیجیے لیجیے! شاہی ٹرین چمنستان سلیم گڑہ میں گلگشت کرتی ہوئی آ پہونچی۔ شہنشاہ معظم فیلڈ مارشل کی وردی زیب تن ستارہ ہند کا تمغہ لگائے باہر تشریف لائے قیصرہ سپید اطلس کی پوشاک آرڈر اوف کارٹر کراون اوف انڈیا کے تمغہ لگائے گاڑی سے اُتریں گارڈ اوف اونر نے سلامی دی اور ہز ایکسیلنسی نے استقبال کیا!

لو دلّی والو! مبارک! قلعۂ شاہی کی توپ اس وقت اس جلیل القدر شہنشاہ کی سلامی اُتار رہی ہے جس کے عدل و کرم نے تمھارے دل مسخر کر لیے!

اللہ اللہ کیا وقت ہے ہندوستانی رؤسا حضور شاہی میں باریاب ہو رہے ہیں اور قلعۂ معلی اپنے شہنشاہ کی عنایت خسروانہ پر عقیدتمندی کے پھول برسا رہا ہے۔ کہاں ہو؟ اکبری درشن کر کے اشنان کرنے والے ہندو مسلمانو! آؤ ہماری خوشیوں میں شریک ہو! اور دیکھو! ہماری ترسی ہوئی نظریں! اپنے شہنشاہ کے درشن کر رہی ہیں! اُٹھو اُٹھو بیخبری کی نیند سونے والو! اُٹھو! اور اس جشن کا لطف تم اُٹھاؤ! سینکڑوں برس بعد دلّی دلّی بنی ہے! دور دور سے لوگ اس کی رونمائی کو آرہے ہیں!

قلعہ کے دلی دروازہ سے جس پر تاج برطانیہ کا جھنڈا لہرا لہرا کر خوش آمدید کے نعرے لگا رہا تھا۔ جلوس شاہی روانہ ہوا۔ وسط میں ہلے

سیکشن ہیں گورنر لفٹنٹ گورنر اور چیف کمشنر معہ افواج اس کے بعد سرزمین ہندوستان کا وہ مالک و مہان جس کے دیکھنے کو آنکھیں مدتوں سے ترس رہی تھیں۔

معزز دوستو! وہ الفاظ کہاں سے لاؤں اور کیا دیکھا ہے خوش نصیب تھیں وہ آنکھیں جنھوں نے وہ سماں دیکھا! دیکھا اور ایسا دیکھا کہ اب نظر آنے کی امید نہیں! ملکہ الگزنڈرا کا لال تاج برطانیہ کا گوہر آبدار! حضور شہنشاہ معظم مشکی گھوڑے پر سوار تھے پیچھے لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ کریو پہلو بہ پہلو اس کے بعد علیا قیصرہ کی گاڑی۔ خوش نصیب رعیت چیرز اور خوشی کے نعروں سے اپنے جوش کا اظہار کر رہی تھی۔ شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ کی جو ادا اس وقت دلی والوں کے دل سے گئی وہ وہ امپیریل مجسٹی کا خلق تھا شادمانی اپنے جواہرات دونوں چہروں پر نچھاور کر رہی تھی اور ہاتھ اپنی رعیت کے اظہار جوش کو سچے دل سے قبول کر رہے تھے

اب جلوس اس مقدس عمارت کے قریب ہے جس کا ایک ایک پتھر شاہجہاں کی متبرک روح پر صبح اور شام سلام بھیج رہا ہے۔ مسجد جامع شہنشاہ معظم کی تمام مسلمان رعایا کی وفاداری کا پھریرا سنہری حرفوں میں اڑا رہی تھی۔ ہزارہا مسلمان مرد اور عورت خانہ خدا میں بیٹھے اپنے شہنشاہ کے حضور میں اخلاص و عقیدت کے تحفے پیش کر رہے تھے جلیل القدر بادشاہ اور عالی مرتبہ بیگم محبت کی آنکھوں سے دیکھتے اور شکر کے کانوں سے سنتے چاندنی چوک پہونچے۔ والیان ریاست کی سواریاں جلو میں تھیں ان کی زرق برق پوشاکیں فوج کی رنگ برنگ کی وردیاں جلوس کی عزت کو دوبالا کر رہی تھیں۔ کیسا مؤثر سماں تھا۔ کہ آجتک اس کا

خیال کرکے دل نہ سے لے رہا ہے دلی کی در و دیوار سے بہار کا موسم ٹھیک رہا تھا حقیقت کے بودہ - برہما کے سیوا کلیاں لگ سئے طرے باندھے ہشاش بشاش چلے جارہے تھے الغرض ایک ایسا عالم تھا جس کا مزا الی یومنا ہنا ما آنکھیں لوٹ رہی ہیں - دلی کی سرزمین طرح طرح کے جواہر اوگل رہی تھی اور آسمان فرحت و انبساط کی بارش سے دم بھر کو نہ رکتا تھا پہاڑی پر پہونچکر ممبران لیجسلیٹو کونسل کا اڈریس پیش کیا گیا جو وفاداری کی ہوائیں گونجتا ہوا حضور اقدس تک پہونچا - بڑے بڑے راجہ مہاراجہ بادشاہ و شہنشاہ جو دلی کی سرزمین پر حکومت کرچکے آج خاک کی بستی میں پڑے سوتے تھے اور نظام عالم کے زبردست ہاتھ انکو تھپک تھپک کر لوریاں دے رہے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی بلا شرکت غیرے اس قدر وسیع سلطنت کا حکمراں نہ ہوا جو ہمارے شہنشاہ کے زیر نگین ہے

تاریخ اس تشریف آوری پر مدۃ العمر یادگار رہیگی اور دیر امپیریل مجسٹیز کے اس کرم خسروانہ سے جو فخر ہندوستان کو حاصل ہوا جہاں آباد کا ذرہ ذرہ اس کی تصدیق کرے گا - ہر طرف سے یہ صدائیں آرہی ہیں "خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے"

سہ پہر کے قریب جب شہنشاہ معظم کیمپ میں داخل ہوئے تو چند والیان ریاست کو شرف باریابی حاصل ہوا -

۸ تاریخ کی صبحکو باقی والیان ریاست نے اپنے ہر دلعزیز شہنشاہ کے روبرو سر تسلیم خم کیا اور شام کے قریب خاندو سا خان کی کھڑکی سے باہر اس پارک میں جو اسی غرض سے تیار کیا گیا تھا -

ٹیپ ٹاپ سے اپنی ہمت کے نمونے دکھائے تو غربا کا اشتیاق
دیدار ان کی عالی حوصلگی اور وفاداری کا نمونہ تھا۔ دیدار شاہی کے
بھوکے اور فرمان شاہی کے پیاسے صبح ہی صبح آموجود ہوئے
تھے۔ بیس ہزار کے قریب فوج وسط صحن میں مسلح کھڑی تھی اور لاکھ
ڈیڑھ لاکھ آنکھیں محبت کا سرمہ لگائے وفاداری میں ڈوبی ہوئی
اپنے شہنشاہ کے جمال جہاں آرا کی منتظر تھیں گیارہ بجتے ہی ہز ایکسیلنسی
ڈریگن گارڈ کو جلو میں لیے تشریف فرما ہوئے یہ سماں بدستور تھا کہ توپوں کی
گونج نے امپیریل مجسٹیز کی تشریف آوری کا مژدہ لائی۔ سواری کا قریب
پہنچنا تھا کہ تمام حاضرین آداب شاہی کے واسطے سروقد کھڑے ہو گئے
فوج نے سلامی اُتاری باجوں نے اظہار شادمانی کیا رعیت نے چیرز
کے نعرے لگائے اور سواری شامیانہ میں آئی۔

شہنشاہ و شہنشاہ بیگم نے اس زمین کو جو مدتوں سے منتظر تھی اپنے
قدموں سے مالامال کیا چھوٹے چھوٹے شہزادوں نے آگے پیچھے
سے خلعت شاہی کو سہارا دیا ہز ایکسیلنسی نے استقبال کیا اور بادشاہ
معہ بادشاہ بیگم تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے +

اعلان و تقریر شاہی کے بعد اب وہ مبارک سماں تھا جب تمام
عہدہ داران و والیان ریاست تاج برطانیہ کے روبرو سر تسلیم خم کرتے
تھے سب سے پہلے وائسرائے نے آگے بڑھ کر اظہار اطاعت کیا اور پھر
یکے بعد دیگرے تمام حکام و والیان ریاست نے۔ اس رسم کی ادائیگی
نے تقریباً ایک گھنٹہ لیا۔ مگر دلچسپ نظارہ تھا۔ اظہار [illegible] صداقت
وفاداری کا نشان تھا جو ادنیٰ و اعلیٰ دونوں کے واسطے باعث فخر تھا

سچ یہ ہے جس حکومت نے ہندوستان کو تمام قیدوں سے آزاد کردیا وہ ہر عزت و احترام کی جائز مستحق تھی رعیت کے دل حکام سے زیادہ شاہ کے کرم کا اعتراف کررہے تھے +

اب شاہ اور بادشاہ بیگم تخت سے اٹھے اور ہاتھ میں ہاتھ دیگر شاہی خیمہ کیطرف روانہ ہوئے دلی کی زمین دلہن بنکران قدموں پر نثار ہورہی تھی اور آسمان آج ڈھائی تین سو برس بعد رعیت کی دعاؤں پر آمین کہہ رہا تھا ویر امپیریل ہجسٹیز دلیس نے جبے تخت پر قدم رکھا ویرا یکسیلنز دائیں طرف اور بیچ ادھر اُدھر موجود تھے چند لمحہ گذرے ہونگے کہ نقیب آگے بڑھا بگل بجایا اور ہیرلڈ نے شہنشاہ کی تخت نشینی کا اعلان انگریزی میں اور ملک عمر حیات خاں صاحب نے اردو میں کیا اور ہز ایکسیلنسی نے وہ فرمان شاہی سنایا جس نے ہر کروڑ اور ہندو مسلمان کا کنول کھلا دیا۔

۱۲ دسمبر کو دس بجے کے بعد اعلیٰ حضرت نے فوجی افسروں کو شرف ملاقات بخشا اسوقت توپخانہ کے وہ سات بہادر پیش کیئے گئے جنھوں نے اپنی جانبازی کمیل کر فیروزپور کے توپخانہ کو بچایا تھا ان جاں نثاروں کی محنت ٹھکانے لگی قدردانی نے اِن کے حوصلے بڑھائے تاج شاہی نے انکی جرأت و شجاعت کی داد دی اور شہنشاہ معظم نے اپنے ہاتھ سے شاہی تمغہ انکی سینوں پر لگا زمانہ قدیم کی یہ رسم کہ جاں نثار سورما اپنی تلواروں کے دستے بادشاہ کے روبرو جھکادیں اس وقت ادا کی گئی اور تین معزز ہندوستانیوں نے اپنی تلواریں حضور شاہی میں جھکائیں اور شہنشاہ معظم نے اپنا ہاتھ ان کو لگادیا۔

شام کے وقت قلعہ میں گارڈن پارٹی ہوئی یہ عجیب دلکش سماں تھا۔ شاہان مغلیہ کے جشن کانوں سے سنے اور تاج برطانیہ کی چہل پہل آنکھوں سے

دیکھی قلعہ معلّٰی آج چوتھی کی دلہن بنا ہوا تھا۔ ہری ہری گھاس کے تختے رنگ برنگ کے پھول انواع و اقسام کی بیلیں اس عروس کا زیور تھیں فوّارے چھوٹ رہے تھے۔ اور وہ در و دیوار جو شاہجہاں و ممتاز محل کے جلسوں کو ترس گئے تھے آج اپنی عزت افزائی پر ناز کر رہے تھے زمین تاج برطانیہ کے قدموں کے واسطے آنکھیں بچھا رہی تھی۔ ساڑھے تین بجے بادشاہ اور بادشاہ بیگم ثمن برج میں تشریف لائے اور مشتاق رعیت کو اپنے دیدار سے منور کیا جہرکوں کی سیر کرتے ہوئے جس کے نیچے جمنا اٹھکیلیاں کر رہی تھی دیوان خاص میں تشریف لے گئے +

آج رات کو شہر پر عجیب جوبن تھا روشنی نے دلّی کو جگمگا دیا قلعہ میں آتشبازی چھوٹی اور شہر میں وہ عالم ہوا کہ دلّی منہ بول اٹھی۔

۱۴۔ دسمبر کو فوجی معائنہ ہوا اور پچاس ہزار فوج شہنشاہ کے سامنے گذری ایک خاص وقت میں اور ایک خاص مقام پر فوج کا اسقدر اژدہام ہندوستان میں پہلا اتفاق تھا یہ ایسا دلچسپ اور انوکھا نظارہ تھا کہ مزے لوٹنے والی آنکھیں آجتک اسکو یاد کر رہی ہیں شام کو خطابات تقسیم ہوئے اسوقت شہنشاہ معظم سٹار اوف انڈیا کا لباس زیب تن کیے تھے سب سے پہلے ملکہ معظمہ نے اپنا سر شہنشاہ کے آگے جھکایا اور اعلیٰ حضرت نے تمغہ گرانڈ کراس اوف دی ایمپیر عطا فرمایا اور رخسار کو بوسہ دیا۔

۱۵۔ دسمبر کو وہ مبارک رسم ادا ہوئی جو دلّی کو دلّی اور دلّی والوں کو زندہ کر گئی یہ دار السلطنت کا سنگِ بنیاد تھا جو گورنمنٹ اوف انڈیا کے کیمپ کے باغیچہ میں رکھا گیا +

پڑھنے والوں، وہ وقت پھر آئے گا کہ دلّی ایک چیز ہوگی، جو بابل

آج فسانہ ہو گئیں، یہاں پھر نظر آئیں گی! اسی خاک سے پھر ایسے ایسے
لوگ اٹھیں گے! جن پر دلی فخر کرے گی۔ باکمالوں کا مجمع پھر دکھائی دے گا!
گو ہوا کا رخ بدلا ہوا ہوگا، اور زمانہ اگلے نداقوں کی ہنسی اڑائے گا!
مگر اسی بستی میں وہ صورتیں ہی دکھائی دیں گی، جو بزرگوں کے نام آنکھوں
سے لگائیں، عالم تنہائی میں سونیوالوں میری مبارک باد قبول کرو، جو خزانے
تمھارے ساتھ دفن ہوئے، اب دنیا ان کی قدر کرے گی، بڑے بڑے
محقق تمھارے مٹی کے ڈھیروں کی پرستش کریں گے، اور مغربی سیاح
یونیورسٹی کی لالٹین سے تمھارے کھوج لگائیگا، زمانہ کی اندھیری
گھپ رات سر پر ہوگی، اور علوم کی جگمگاتی روشنی میں تمھاری خاک
کا ہر ذرہ اکسیر کا کام دے گا! ہماری ہڈیاں گل کر خاک ہو چکی ہونگی،
مگر دلی کو دار السلطنت دیکھنے والی آنکھیں، ہمارے بیان کی تصدیق
کریں گی، اٹھنے والی روحوں، ظاہری آنکھوں نے تمھارے فانی اجسام
چھپا دیئے، مگر وہ وقت آگیا کہ تلاش کی آنکھیں، تمھارے ان پھولوں کو
سر پر رکھیں جن کی مہکار بقار دوام کے خلعت سے وابستہ ہے۔
یہ پھانس دلمیں کھٹک رہی ہے اور کھٹکے گی، کہ! قدردانی کے
دریا جن کی موجیں آبدار موتیوں اور چمکتے ہوئے جواہرات سے خلق خدا کو
مالامال کرتی تھیں خاموش پڑے ہیں، ہوا کے تھپیڑے مینہ کے چھینٹے
اور بڑے بڑے طوفان اوپر ہی اوپر گذر رہے ہیں۔ مگر! نہیں! نہیں!
دل بیقرار! اس باسی کڑھی میں پھر ابال آئیگا! اور تاج برطانیہ! جس نے
اس خاک پاک کو کندن بنا دیا، یونیورسٹی کے انعام سے، ان مردوں کو
جلائے گا! یہ بند پانی اور ٹھیرے ہوئے دریا پھر حرکت کریں گے

شہنشاہ معظم کی مسیحائی اِن بیخبروں میں جان ڈالکر ان گمناموں کے نام روشن کرے گی، اور زمانے کا ساتھ نہ دینے والی قوم، جو کرہ ادبار میں مٹ کر خاک ہوگئی، احساس کے خلعتِ فاخرہ سے مزین ہوگی اور ان سروںپر جو فلاح قوم سے ٹکریں مار رہے ہیں، اپنے ہاتھ سے، سدا بہار پھول چڑہائیگی۔

۱۶- دسمبر جس دم قدم کی تمام چہل پہل اور رونق تہی یعنے شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ آج دلی سے روانہ ہوئے اور دلی نے بادشاہ اور بادشاہ بیگم کو خدا حافظ کہا سلیم گڑھ کا اسٹیشن انواع اقسام کی گلکاریوں سے آراستہ تہا اور رعیت ویرا مپیریل میجسٹیز کی جدائی سے بہت ہی متاثر تھی اظہار وفاداری اور عنایت خسروانہ کا شکریہ وہ سلام تھے جنکی ہر چہار طرف سے بوچھار ہو رہی تہی شہنشاہ کی محبت نے یوں ہی دلوں میں گھر کر لیے تہے اسوقت ہز میجسٹی کا دیر تک چلتی گاڑی میں کہڑا رہنا اور اپنی رعیت کے سلاموں کا جواب دینا ایک ایسا مؤثر نظارہ تھا کہ بہت سی آنکھیں اِس جدائی پر آنسو بھر لائیں +

دلی دعا ہے کہ خدا ویرا مپیریل میجسٹیز کو سلامت رکھے!

ایڈیٹر

جھروکہ- یہ ایک مکان ہے جسکی کہڑکیاں دریا کی طرف ہیں اور اکبر بادشاہ کے زمانہ میں تیار ہوا اِس وقت اس کا نام درشنی تہا اور لوگ یہاں سے بادشاہ کا درشن کرتے تھے شاہجہان تک یہ طریقہ جاری رہا اورنگزیب نے اِس کو موقوف کر دیا اور اس کا نام جہروکہ رکھا گیا جو سیرو تماشہ گاہ مقرر ہوئی +

نوید مقدم شہنشاہی

از تصنیف مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رئیس شہر میرٹھ

نو بہارِ بوستاں آنے کو ہے خسروِ گل ہم عناں آنے کو ہے
بہرِ استقبالِ رایاتِ بہار لشکرِ سرو رواں آنے کو ہے
شاخِ گلبن پر باندازِ خطیب عندلیبِ خوش بیاں آنے کو ہے
صحنِ گلشن میں بطورِ ترجمان طوطیِ شیریں زباں آنے کو ہے
پیشِ گل ہر طائرِ رنگیں نوا تہنیت گو، مدح خواں آنے کو ہے
پیکِ ہُدہُد مژدگانی کے لیے بال افشاں بے زماں آنے کو ہے
ابرِ گوہر بار بحرِ مغربی سوئے مشرق دُرفشاں آنے کو ہے
راہِ دریا سے سفینوں کی قطار صورتِ سیارگاں آنے کو ہے
نوجواں بنکر نگاہِ خلق میں داستانِ باستاں آنے کو ہے
جامِ صحت بنکے بزمِ عیش میں گردشِ رطلِ گراں آنے کو ہے
خانہ باغوں کے لیے کشمیر سے کشتِ زارِ زعفراں آنے کو ہے
بلدہ کاشی سے زربفتِ نفیس از برائے سائباں آنے کو ہے
زینتِ درہائے ایواں کے لیے کوکیو سے پرنیاں آنے کو ہے
طاقہ طاقہ مخملِ روم و فرنگ فرشِ راہِ دوستاں آنے کو ہے
طبلہ طبلہ مشکِ تاتار و ختن حسبِ حکمِ میزباں آنے کو ہے
میوہ کابل سے تو مسقط سے رطب بہرِ نقلِ میہماں آنے کو ہے
وہ مہوبے سے تو یہ قنوج سے عطرِ گل اور برگِ پاں آنے کو ہے

لے کے جنسِ نادراتِ روزگار — مجمعِ بازارگاں آنے کو ہے
خاص کجلی بن سے پیلِ دیوزاد — ساتھ لیکر پیلباں آنے کو ہے
گلۂ گلگون و شبدیز و سمند — ہمرہِ سوداگراں آنے کو ہے
اُشترانِ تند جیسلمیر سے — لیکے خیلِ سارواں آنے کو ہے
بے شمار اسٹاک موٹر کار کا ۔ — ملکِ یورپ سے یہاں آنے کو ہے
صنعتِ پرواز کا موجد گروہ — لیکے اپنی کشتیاں آنے کو ہے
مردمِ آفاق کا جمِ غفیر — کارواں در کارواں آنے کو ہے
شہری و دہقاں کا انبوہِ کثیر — مرزباں سے تا شباں آنے کو ہے
جذبۂ شوقِ تماشا دیکھئے — تا بہ پیرِ ناتواں آنے کو ہے
خیمہ و خرگاہ کا شہرِ جدید — زیرِ سقفِ آسماں آنے کو ہے
ہر طرف سے لشکرِ آراستہ — مثلِ دریائے رواں آنے کو ہے
نیزہ برداروں کے بیم کوچ سے — راستوں میں نیستاں آنے کو ہے
رائفل بر دوشِ پیدل کا قشوں — ہمدمِ برقِ دماں آنے کو ہے
توپخانوں کا گرجنا گھورنا — گویا بھادوں کا سماں آنے کو ہے
وقتِ ہر شلک دہانِ توپ سے — بانگِ دیوِ ہفت خواں آنے کو ہے
عرضِ لشکر کے لیے میدان میں — شاہِ باچتر و نشاں آنے کو ہے
موجِ برقِ نامہ بر لائی خبر — اک نیا دورِ زماں آنے کو ہے
دیدہ و دل منتظر ہیں سچ بتا — کون آتا ہے؟ کہاں آنے کو ہے
جارج پنجم خسروِ گیتی ستاں — جانبِ ہندوستاں آنے کو ہے
وارثِ تاج و نگینِ قیصری — داورِ دارا نشاں آنے کو ہے
آفتابِ مملکتِ ہندوستاں — سمتِ ارضِ عز و شاں آنے کو ہے ۔

لے پئے تسلیم شاہ جم شکوہ — ہر امیر ملک راں آنے کو ہے
دیرجات و سندھ و پنجاب و دکن — باسر و با چشم و جاں آنے کو ہے
تبت و برما و بنگال و اودھ — بلکہ تا بامِ جہاں آنے کو ہے
عتبۂ علیا کی جانب با خلوص — طبقۂ نواب و خاں آنے کو ہے
گرد بر گردِ سرادقہائے شاہ — جیشِ رایانِ و راجگاں آنے کو ہے
راجپوتانہ سے با خیل و حشم — ماہ و خور کا خانداں آنے کو ہے
رُبعِ مسکوں سے برسمِ تہنیت — نائب ہر قہرماں آنے کو ہے
تازہ کرنے ملک پیمانِ وفا — بادشاہِ مہرباں آنے کو ہے
مژدہ اے دہلی کہ تیرے ارک میں — مرکزِ امن و اماں آنے کو ہے
مُستقرِ ملک میں قرنوں کے بعد — موکبِ صاحبقراں آنے کو ہے
چارسوئے ملک سے بہرِ نثار — حاصلِ دریا و کاں آنے کو ہے
مہر و الفت کی گراں مایہ متاع — بر سبیلِ ارمغاں آنے کو ہے
مقدمِ شہ میں زبانِ خلق پر — "شاد باش و دیرماں" آنے کو ہے
گرمیِ ہنگامۂ جشنِ جلوس — آخرِ سالِ رواں آنے کو ہے

مدح سنجی کے لیے دربار میں
شاعرِ جادو بیاں آنے کو ہے

نیلی چھتری - دلّی میں دریائے جمنا کے پار سلیم گڑھ کے نیچے یہ ایک بنگلہ نما گنبد ہے جو نیلی چھتری کے نام سے مشہور ہے نوسو انتالیس ہجری میں ہمایوں نے اسکو بنایا جہاں سے وہ دریا کی سیر کرتا تھا اسکو جہانگیر کا بنگلہ بھی کہتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ عمارت قدیم ہے اور جہانگیر نے اسکی مرمت کی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پانڈوں کے وقت کی یہ عمارت ہے جہانگیر نے اسکی مرمت کی اور یہ کتبہ لکھوا دیا۔

اللہ اکبر مدحیہ جہانگیر شاہ ابن اکبر شاہ سنہ ۵ عجب فرح بخش جائے کامرانی است ✤ نشیمن گاہ جنت آشیانی است

شاہی میلہ

یوں تو ہندوستان سدا ہی سے میلوں ٹھیلوں کا گھر رہا مگر دلی کے بنفکروں نے اِس فن کو بھی معراج کمال پر پونہچا دیا برس کے تین سو پینسٹھ دنوں میں دو سو سے اوپر میلے گن لو۔ تھیٹروں کے دروازوں اور چوک کی سیڑھیوں پر جو جگھٹا رہتا ہے وہ الگ رہا۔ اِس خیال سے کہ کوئی اٹواڑ خالی نہ گذر جائے۔ جمعرات کو پیر غیب ہی پر میلا جما دیا۔ گھر میں فاقہ ہے تو بلا سے اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں تو ان کی تقدیر مگر ان سیلانی جیوڑوں کے میلہ میں فرق نہ آئے لڑ کر جھگڑ کر چھین کر جھپٹ کر کسی نہ کسی طرح آٹھ پیسے کارخاندار سے لینے۔ منڈے نے برتن تک بنیئے کے ہاں پونہچوا دیے اور گھر والی فاقے کرتے کرتے کانٹا ہو گئی مگر شوقینوں کی وضع میں فرق نہ آیا پھٹی پرانی صدری گلے میں ڈالی اور پرانا دھرانا چادرہ بغل میں لے نکل کھڑے ہوئے تین نے مل کر یکہ کیا الائچی دار پان نبو اڑی سے بنوائے اور گلوری کلے میں دبا یکہ میں بیٹھ چلتے ہوئے +

رستے کی باتیں، الٰہی تیری پناہ، کوئی علم ان سے نہ چھوٹا کوئی تاریخ ان سے نہ بچی،

شہنشاہ معظم کی تشریف آوری کے موقعہ پر دلی نے ایک تحفہ شاہی میلہ کے نام سے بھی بارگاہ خسروی میں نذر گذارا اور لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے دلی والوں نے دل کھول کر اس میلے کے مزے لوٹے +

راج گھاٹ کے پاس جہاں جمنا بہہ رہی ہے بیلہ میں یہ میلہ سجایا گیا ایک طرف مینا بازار لگا۔ دور دور کے دوکانداروں نے اپنے مال لگائے اور مشہور صنّاعوں نے اپنی صنعت کے نمونے پیش کئے دوسری طرف مرغ بازی۔ پتنگ بازی غرض بہت سی بازیوں کے اکھاڑے تھے دنگل ایسا بندھا کہ اب شاید ایسا کبھی نہ بندھے۔ ہندوستان بھر کے نامی گرامی چوٹی کے پہلوان جو رستم وسہراب ہونے کے مدعی تھے نبرد آزما ہوئے کئی کئی ہزار روپیہ کے انعام پر کشتیاں ہوئیں مست ہاتھیوں کی لڑائیاں جن کے چرچے سنتے تھے۔ بادشاہ کے طفیل میں ہم نے بھی آنکھ سے دیکھ لیں حضور شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ نے بھی اس میلہ کا ملاحظہ جھروکوں سے فرمایا اور صرف یہ ہی عزت اس میلہ کے واسطے اتنی کافی ہے کہ شاہی میلہ اوراق تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ دن کے وقت چھوٹنے والی آتشبازی جس کا نام بھی کبھی نہ سنا تھا اس مزے سے چھوٹی کہ دل خوش ہو گئے ختنگلے کا ایک آوازہ زمین پر دوسرا آسمان پر آوازہ ہوتے ہی جو پھٹا تو رنگ برنگ کے جانور ہوا میں اڑ رہے ہیں اور طرح طرح کے پھول ادھر ادھر تیرتے پھرتے ہیں۔ پہاڑیوں کا ناچ بھی عجب لطف کی چیز تھی بیچ میں باجا چاروں طرف ناچنے والے گتو پر اس مزے سے تھرک رہے تھے کہ دیکھنے والے پھڑک گئے راجگھاٹ کے مندر اور شاہ بڑے کی درگاہ پر ہندو مسلمانوں کے نکھیے چڑھے منتخب نفیری والوں نے اپنی دلکش تانوں سے دل مسخر کر لئے۔ باوجود روک ٹوک کے خلقت ٹوٹی پڑتی تھی اور گو کئی میل رقبہ میں

میلہ لگا گیا مگر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی دلّی کے بے فکرے تو اس تاک میں تھے ہی میلہ کا نام سنتے ہی اُمنڈ پڑے۔ کچھ مرنکل گیا تو ملا سے ٹکرا ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ پردیسیوں کا تانتا مزید براں۔ میلہ کے ضمن میں بحث دو زردوزوں کی گفتگو سے ہے جن کی حالت آنکھوں سے دیکھی اور جن کی باتیں کانوں سے سنیں۔ ان کی میلی کچیلی کام سے لپی ہوئی ٹوپیاں۔ کتنے نکلی ہوئی سپاٹ اور سلمہ ستارہ کی جوتیاں کمونر کے اٹو سیئے ہوئے پرانے کوٹ ان کے افلاس کی پوری شہادت دے رہے تھے۔ کام موجود تھا۔ کارخاندار پھیرے کرتے کرتے تھک گیا مگر یہ اپنے فاقوں میں مگن تھے اور آٹھ دن تک کام پر جانا حرام سمجھتے تھے۔

(ا) کٹورنی شیدو! آج تو مزا آگیا!

شیدو۔ مزا؟ میں کہتا ہوں اعمر بھر یہ بات نصیب نہیں ہونیکی! کر خدا کو دیکھو اتنی عقل نہیں کہ بے کام تو روز ہی ہے! مگر بادشاہ روز روز کا۔

(ا) تو نے بھی یار کس ستی کا نام لیا صبوں سے تو ردّی نصیب ہوئی نہیں تو نے اس وقت کی بھی کہوائی۔ ابے بھائی یہ دیکھ بادشاہ ہو تو اتنا تو ہو کہی کے طریوں روپیہ بہا ہے مگر چہرہ پہ بل تک کا نہیں۔

شیدو۔ سلامت یار ہے تو بھی بونگا ہی! روپیہ کو پیٹ رہا ہے! ابے بادشاہ کو روپیہ کی کیا کمی، یہ دیکھ کہ دلی بادشاہ کا گھر بن گئی چھ مہینہ وہاں چھ مہینہ یہاں۔

سلامت یشت! کیا اوندھی کھوپری کا آدمی ہے ابے دلی تو کر دی لاٹھ کے نام۔ اور کلکتہ دیا چھوٹے لاٹھ کو۔

شیدو۔ واہ بے خبطے! کیا سمجھا ہے استاد سلو سے تو پوچھ وہ تو چیدا آیا

والے کے بر تر بہی میں تھے جب حکم پڑھے گئے ہیں! اگر میاں شروع ہوئی نہیں اور بادشاہ یہاں آیا نہیں (از سیلانی)

قصیدہ در تہنیت خیر مقدم شہنشاہ

ہے طلوعِ شفقِ صبح سے ظلمت کافور — ید قدرت نے رخِ شب پہ ملا غازۂ نور
آمدِ خسروِ خاور کی جو ہے گرم خبر — تہنیت گا نیکو گلزار میں ہیں جمع طیور
پرتوِ نور سے ہے آئینہ خانہ عالم — در و دیوار میں ہے جلوۂ قدرت کا ظہور
صبحِ نوروز سے کھلنے لگیں دل کی کلیاں — گلِ امید سے ہے دامنِ عالم بھرپور
بامِ مشرق سے گری برقِ جمالِ خورشید — ذرہ ذرہ ہوا روشن صفتِ شعلۂ طور
فرحت افزا ہیں نسیمِ سحری کے جھونکے — دل زمانہ کا ہے ٹھنڈا تو طبیعت مسرور
عابدوں کی طرح سجدہ میں جھکے جاتے ہیں — ہیں نہالانِ چمن رحمتِ حق کے مشکور
ٹھنڈے چھینٹے دیئے شبنم کے فلک نے شب بھر — تھا دمِ صبح جو سبزہ کو جگانا منظور
تارے گن گن کے بسر کی ہے جو راتیں آنکھوں میں — نظر آتا ہے ابھی دیدۂ نرگس مخمور
کیوں نہ کلیوں کو حجاب آئے حسینوں کی طرح — کہ اٹھاتی ہے صبا پردۂ حسنِ مستور
چار دیواری میں ہیں جمع حسینانِ چمن — قاف کی پریوں کو قدرت نے کیا ہے محصور
گلِ نازک نے اڑائی ہے پری کی رنگت — شاخِ سنبل نے نکالا ہے خمِ کاکلِ حور
صحنِ گلزار سراسر ہے نوبت خانہ — پھول کھلتے ہیں تو آتی ہے صدائے طنبور
اب عاشق سے ہی معشوق ستمگر محجوب — اب معشوق سے ہی ہے عاشقِ مضطر مہجور
اس طرف اپنے ترنم پہ ہے بلبل نازاں — اس طرف اپنے تبسم پہ ہے غنچہ مغرور
چار سو گونجتے ہیں نغمے انانیت کے — سروِ گلشن ہے اگر دار تو قمری منصور
نگہِ شوق سے بلبل نے جو دیکھا گل کو — چشمِ نرگس نے کہا دور ہے چشمِ بد دور
بادۂ چشمۂ کوثر نہ ہو کیوں آبِ رواں — پڑ رہا ہے لبِ جو پرتوِ شاخِ انگور

دور جام مے عشرت میں گرے تو یہ شکن ہو گیا شیشۂ اندوہ و الم چکنا چور
آج کس واسطے ہے مجمع ارباب نشاط کس لیے بزم ہوئی عیش و طرب سے معمور
اس طرح کیوں ہے خوشی کوئی یقینی ہے سبب اس قدر کیوں ہے مسرت کوئی باعث ہے ضرور
آج اس شاہ معظم کے مقدم کی خوشی ہر اقلیم میں جسکی نہیں ہوتا مستور
وہ جہاندار اولوالعزم معلے القاب آسماں سامنے جس کے ہے کم از بیضۂ مور
جارج پنجم شرف افزاے سریر لندن شاہ جم مرتبہ و زینت تاج مغفور
واہ کیا نام مقدس ہے جو لب تک آ جائے شادمانی کا ہو باعث پئے قلب رنجور

وصف شہ میں رقم ایک اور بھی مطلع ہو حمید
رہے باقی نہ دقیقہ کوئی حتے المقدور

ہفت اقلیم میں شاہا تری پابند امور دست بستہ ہیں سلاطین جہاں تیرے حضور
قیصر ہند ہے تو جانتے ہیں اہل جہاں ہے سخاوت تری معروف عدالت مشہور
چشمۂ فیض سے ہی ابر گہر بار آب اب پانی پانی ترے امواج کرم سے ہیں بحور
تیرے قدموں میں جو رہتے ہیں وہ ہیں چرخ نشیں آستاں بوس جو ہوتے ہیں وہ ہیں صدر صدور
سایہ افگن ہو اگر دامن اعزاز ترا ذرۂ ریگ بنے چشمۂ مہر پر نور
شہریاری کا سکھایا ہے طریقہ تو نے تھا سلاطین جہاں کو نہ سلیقہ نہ شعور
طاعت حکم رعیت کا ہے تیری شیوہ عدل و انصاف حکومت کا ہے تیری دستور
ہیں رعیت میں تری جملہ مذاہب آزاد نہیں کرتا ترا قانون عدالت مجبور
تو اگر گرم غضب ہو تو قیامت آ جائے ہو صدا میں تری پیدا اثر نفخ صور
تیرے دم خم سے کچھ ایسے ہوئے سیدھے سرکش نہ وہ بل ہے نہ تکبر نہ شرارت نہ غرور
قہر کی تیرے یہ کوشش ہے کہ دشمن نہ بچے مہر کی تیرے سفارش ہے کہ ہو عفو قصور
سر میدان جو تیری تیغ مجلے کھچ جائے ہو گئے ملک عدم خوف سے دشمن مفرور

گر کبھی معرکۂ جنگ میں ہو تیرا گذر
پاؤں کو چوم کے نصرت کہے آداب حضور

دیکھنے کو ترے اے شاہ جہاں مست ہیں سب
نظریں بیتاب تھیں اور دیکھنے والے رنجور

اس طرف شہر جلوہ گہ ناز ترا لندن تھا
اس طرف ہند میں تھی تیری رعیت مہجور

اے خوشا بخت کہ دیدار ہوا تیرا نصیب
خوش ہے قلب کو حاصل ہے اور آنکھوں کو سرور

آج وہ سامنے ہے ڈھونڈھتے تھے کل جس کو
آج وہ پاس ہے رہتا تھا جو کل کوسوں دور

کوئی حسرت نہ رہی بس یہ دعا اب ہے حمید
سامنے اپنے یہ صورت رہے تا یوم نشور

عبد الحمید حمید ۔ میرٹھی

ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کے محل میں رتجگا ۔ آج بیوی سے لیکر باندی تک سب نے بناؤ سنگار کئے ۔ بنارسی زری بوٹی منقیشی تاروں کی کریب لاہی پھلکاری ۔ گلشن باریت آب رواں شبنم کے دوپٹے ۔ زربفت کمخواب ۔ گلبدن ۔ مشروع ۔ اطلس گورنٹ اور ادھانگری کے لباس سے آراستہ ہو چھم چھم کرتی ملکہ دوران کے پاس حاضر ہوئیں ۔ مجرا کیا اپنے اپنے قرینہ سے بیٹھ گئیں ملکہ دوران نک سے سکھ بناؤ سنگار سے سولے میں پیلی موتیوں میں سفید اپنی مسند پر بیٹھی ہیں آگے شک لگی ہوئی ہے خواجہ سرائیں نوکریں چاکریں لونڈیاں باندیاں ہاتھ باندھے کھڑی ہوئی ہیں توشہ خانے والیاں جوڑے کی کشتی لیکر حاضر ہوئیں دیکھو ملکہ دوران ایک ایک کو اپنے ہاتھ سے جوڑے دیتی ہیں سب سرو قد ہو ہو کر جوڑے لیتی ہیں اداب بجاتی ہیں نذریں دیتی ہیں لو ملکہ دوران دولہا بیگم نے جلیس مبارک باد کی نوبت نقارچیں بجانے لگیں آگے آگے روشن چوکی والیاں تاشے باجے والیاں ۔ ملکۂ دوراں نے اپنے ہاتھ سے سات لپیں بھر کر ڈالیں کڑھائیاں چڑھیں گلگلے شروع ہوئے ✦ بزم آخر

اگلے جشن

ہر ملک میں ہر رسم جشن شاہی تمام دنیا میں منتے ہیں کہیں کسی طرح کہیں کیسی طرح مگر جشن ہو یا دربار رعیت ہو یا سرکار۔ حکومت کا مزا جب ہی ہے کہ رعیت بادشاہ کی فرمانبردار اور بادشاہ رعیت کا عاشق زار شہنشاہ معظم جارج پنجم کی تشریف آوری نے یہ دکھا دیا کہ جس طرح بادشاہ کو رعیت عزیز تھی اسی طرح شہنشاہ رعیت کا محبوب تھا۔

اس موقعہ پر ہندوستان رعیت شاد دل آباد کی پوری تفسیر تھی دلی کی سرزمین نے بہت دربار دیکھے اور دیکھنے والوں کو شرقی تزک و احتشام کے نمونے دکھائے مگر یہ گنگا جمنی دربار جو مشرق و مغرب کے معاشرت کا عطر تھا تاریخ میں بےنظیر ہے +

ہندوستان میں تاجپوشی مختلف طریقوں سے ہوا کی اہل ہنود کے دور میں راجہ کے واسطے ضرور تھا کہ جہاں وہ گرہست اشرم کے جھمیلے میں پھنسا تو سب سے پہلے بن برستھ کی رسم ادا کرے اور راجہ رامچندر جی کی طرح بن باس کرے اسوقت بڑا مشکل کام ولیعہد کا انتخاب ہوتا تھا جس میں راجہ کو مطلق دخل نہ تھا رعیت اپنا راجہ آپ انتخاب کرتی اور اگر راجہ کی اولاد نالائق ہوتی اور انتخاب کے وقت رعیت کی چھاتی نہ ٹھکتی تو صاف انکار کر دیتی رامائن نے اس مسئلہ کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

بادشاہ رعیت کا نگہبان ہے اگر وہ دیکھے کہ اسکی اولاد رعیت کو نقصان دیگی تو اس شخص کو جو مفید ثابت ہو خواہ کوئی ہو ولیعہد بنا دے یہی وہ تھی

کہ راجہ دسرتھ نے علی الاعلان کہدیا تھا کہ اگر رعیت پسند کرے تو ولیعہد کو راجہ بنائے "اسی انتخاب کے سلسلے میں اجودھیا کا دربار ملاحظہ ہو۔

جشن کا روز ہے اور آفتاب نکلنے سے پہلے وہ سورما جو راج کے ساتھ جانیں لڑائے ہوئے ہیں مدبر دوراندیش جو الجھی ہوئی گتھیوں کو چٹکیوں میں سلجھاتے رہے دربار میں پہونچ گئے ہیں۔ خلقت کا یہ عالم ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں منڈل پر سونے چاندی کے کلس جگمگا رہے ہیں چوبدار روپہلی سنہری وردیاں پہنے دست بستہ کھڑے ہیں برہمن اور پروہت چندن کے تلک لگائے بیٹھے ہیں ولیعہد کا انتخاب ہوا رعیت نے پسند کیا ڈنکے پر چوٹ پڑی تیل پر منتر پڑھے گئے۔ اور ولیعہد کے جسم پر تیل ملا گیا ادھر گنگا جل سے غسل ہوا ادھر ہون شروع کیا گیا غسل سے فراغت ہوئی منہ پر سمندر کی خاک کا بھبوت لگایا۔ گنگا جمنا کے سنگم کی مٹی سینہ پر پاؤں میں رتھ کے پہیے کی خاک لگائی اور گھی دودھ۔ دہی۔ شہد اور شکر پانچ امرت سے پھر غسل دیا۔ چاندی کی چوکی سونے کا ہزارہ (کیلاش) گنگا جمنا کے پانی سے بھرا ہوا موجود برہمن منتر پڑھ رہے ہیں راجہ غسل کر رہا ہے اور رعیت درازی عمر کے نعرے لگا رہی ہے +

غسل ہو چکا۔ لباس پہنا پروہت نے آگے بڑھ کر سونے کی راکھی (کنگنا) باندھا ترہی نے (سنکھ) بسار کیا دکے شادیانے بجائے ولیعہد خلعت فاخرہ زیب تن کئے باہر برآمد ہوئے۔ رعیت کا جی دیکھکر باغ باغ ہو گیا۔ روپیہ لٹائے اشرفیاں نچھاور کیں۔ دریادل راجہ نے خزانے کا منہ کھول دیا ہاتھیوں پر جلوس چلا رستے بھر خیرات ہوئی

شام کو کچے پکے کھانے تقسیم ہوئے ولیعہد کا انتخاب ختم ہوا۔

اس دور کے بعد مسلمانوں کا وقت آیا ان کے جشن کی تصویر مرحوم آزاد نے ایسی کھینچی ہے کہ جان ڈالنے کی کسر ہے۔ اکبر کے حال میں فرماتے ہیں جب دربار آراستہ ہوتا تھا بادشاہ باقبال اورنگ سلطنت پر جلوہ گر ہوتا تھا اورنگ ہشت پہلو موزوں اور خوشنما تخت تھا گنگا جمنی یعنے سونے چاندی کے عنصروں سے ڈھلا ہوا دریا نے دل پہاڑ نے جگر نکال کر پیشکش کیا لوگ سمجھے کہ الماس لعل یاقوت موتیوں سے مرصع ہے سر پر چتر زرکار و جواہر نگار۔ جھالروں میں مروارید و جواہرات جھلل جھلل کرتے۔

دیوان عام و خاص کے گرد ۱۲۰ ایوان عالیشان تھے جن کی عمارت کو خوشنما اور بیش بہا پتھروں نے رنگین و سنگین کیا تھا ایک ایک ایوان ایک ایک امیر نامور کو عنایت ہوا کہ ہر عالی حوصلہ اسے آراستہ کر کے اپنی قابلیت اور ہمت کا نمونہ دکھائے سیمانمنڈل کہ جلوہ گاہ خاص تھا سجایا گیا اور تمام مکانات کے در و دیوار کو پرتگالی بانات رومی و کاشانی مخمل۔ بنارسی زربفت و کمخواب۔ سیلے ڈوپٹے۔ تاش تمامی گوٹے ٹھپے۔ بیک مقیش کے خلعت پہنائے کشمیر کی شالیں اور زربفت ایران و ترکستان کی قالین پا انداز میں بچھائے شامیانے تانے آسمانی خیمے بلند کئے۔ مکانوں کے صحن میں بہار نے آکر گلکاری کی +

روز جشن سے ایک دن پہلے مبارک ساعت سبھ لگن میں ایک سہاگن بی بی نے اپنے ہاتھ سے دال دلی گنگا جل میں بھگوئی بیٹھی پیسکر رکھی جشن کی ساعت قریب آئی۔ بادشاہ اشنان کو گئے جامہ پہنا کڑکی دار پگڑی

راجپوتی انداز سے باندھی مکٹ سر پر رکھا جشن کی ساعت آئی برہمن نے
ماتھے پر ٹیکا لگایا۔ جواہر نگار کنگن ہاتھ میں باندھا۔ کوئے دہک رہے ہیں
خوشبوئیاں تیار ہیں ادھر ہون ہونے لگا چوکے میں کڑھائیاں چڑھی
ہیں ادھر اسمیں بڑا پڑا ادھر بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا۔

ان ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل وشعور کے بازار تھے جشن
کے بعد زنانہ ہو جاتا اور محل کی بیگمات آتیں کہ ذرا ان کی آنکھیں کھلیں
اور سلیقہ کی آنکھوں میں سگھڑاپے کا سرمہ لگائیں۔ نیک نیت بادشاہ
آپ بھی آتا تھا اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھکر ایسا ہی خوش
ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہوں گے"۔

جن آنکھوں نے یہ سماں دیکھا موت کی نیند میں ہمیشہ کے لئے بند
ہوگئیں اور آج شاہی جشن فقط کتابوں کے فسانے تھے۔ گو لارڈ لٹن
اور لارڈ کرزن کے درباروں نے، دربار کی بہاریں ہمکو بھی دکھادیں
مگر ملکۂ مرحوم اور شہنشاہ مرحوم کے موجود نہ ہونے سے اصلی خوشی میسر
نہ ہوئی۔ شہنشاہ معظم کی تشریف لانے نے اس دربار کو واقعی دربار
بنادیا اور آنکھوں نے اس صورت کو دیکھ لیا دل جس کا شیدا تھا۔

جس طرح دلی کی سرزمین اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری پر
اور تاریخ اس جشن شاہی پر ہمیشہ فخر کرے گی اسی طرح عمر کے یہ چند
روز زندگی کی ہر ساعت ولمحہ پر اپنی عزت کا اظہار کریں گے۔

خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے

حامد

مکٹ دھنباد

شری شکیتمان مہاراج دہراج دیش سوامی جارج پنجم مہارانی دہرانی دیش دیوی بھارت ماتا۔مہارانی میری

سن سن پون چلت چوبائی ۔۔۔ کو شومت راج نوید ن لائی
گھورت گرجت تنہہ گھن برست ۔۔۔ روپا برست کنچن برست
کال گیو اب برست اولے ۔۔۔ سگری پرجا موتی رولے
بادل جھومت بجری کرکت ۔۔۔ دُشٹ اَنت کی چھتیں وہرت
مول کند بھوم رکیت ایسے ۔۔۔ ودیا کارن سجن سب جیسے
برست بادل کارے کارے ۔۔۔ ندی تلاؤ وا انٹ ہیں بہارے
رہس رہس تنہہ دامنی دمکت ۔۔۔ آس پاس جل جگنوں چمکت
ڈالی ڈالی مورلا گاوت ۔۔۔ وید منتر جس بیر سناوت
دیکھت جھکت ہیں تمن ڈورے ۔۔۔ جل بچ جلچ ہیں مدکے کٹورے
پھیلت چمپا اچیت بیلی ۔۔۔ گجرے پہنت سگری سہیلی
داور جھینگر گھن گن گاوت ۔۔۔ مدہوکر بن مدھ من للچاوت
کرت پپیہا پی تو پی تو۔ ۔۔۔ کویل کوکت کو کو کو کو
مور وا نرت کرت بن ماہیں ۔۔۔ کوسوں ڈھونڈت کاگا ناہیں
جنگل جنگل پھول کھلت ہیں ۔۔۔ کند اسنبھ سے مول ملت ہیں
سین پریت ہیں بھیے من بھولا ۔۔۔ نرناری مل جھولت جھولا
دین رشی سکھی دیکھت بھورا ۔۔۔ چندر سے جیس آنند چکورا
گھن جل اتھاہ سمندر میں کیسے ۔۔۔ گرہبت گیانی ہری میں جیسے
دین مان تنہہ جھمکٹ بادل ۔۔۔ چندر لور سورج کو گھٹ بادل

لنڈن وشا مہا تما دھا رن سندر شوبھا راج کے کارن
وہن مہاراجا جارج پنجم راج کرو مہا پرلے تک تم
دہلی نگت پرُ دم دم دھارو نت نت دھار وجم تم دھارو
جیوسے تن میں برلبے تم ہو راجوں کے مہار لبے تم ہو
ہمرے نین اوچرن تمھارے بے بے دہن وہن بھاگ ہمارے
سکھ سین راج استھان براجت شوبھا راج تمہیں کو ساجت
ایشور شکتی کاج میں تمرے سورج چھپت نہیں راج میں تمرے
وہن دیوی میری مہارانی تمرے بیری کی جگ میں ہانی
بھارت ماتا کی ماتا تم ہو دیش بدیش کی داتا تم ہو
دیش کی گوتہون کے سگری بچے تمرے سیوا کے ہیں سچے
تمری بر وہیں سگرے مگن ہیں راج سے تمرے لگائے لگن ہیں
تمرے نیچے ودیا پاوت راج استھان سکھ چت ہیں لگاوت
ودیا کا دیا بالا تم نے کر دیا دیش اوجالا تم نے
اُدتر دکھن پورب پچھم برٹش راج استھان گرت تھم
سین تمرے مکٹ ہے ایسے مکٹ آکاش کا سورج ہی جیسے
بھاری بھرکم تمرا کھانڈا دشٹ کا جس سے ہو بھانڈا
دیش ہے تمری کرپا سیتی جل کی شہرن بھلت جس کھیتی
تمرے کو نیوت شامی رومی تمری دیا میں جگت کی بھومی
مول تمتا را بیاج تمھارا چکرورت ہو راج تمھارا
پرلے تک تم دیش میں دھارو دیش کی نیا پار اُتارو
دیش کا سدھ ہو کاج تمہیں سے اسکو ملے سوراج تمیں سے

دلی کے دربار اور شہنشاہ معظم

تاریخ کا قول فیصل جشن کے متعلق یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک اور ملک کے ہر حصہ میں ہر قوم اور ہر مذہب نے اپنے اپنے طرز معاشرت کے بموجب جشن منائے گو اسلام کا ابتدائی زمانہ جشنوں سے بہت کچھ بچا ہوا ہے اور اسکی بڑی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ شاہی جشن ان کے ہاں اس لئے کوئی چیز نہ تھا کہ بادشاہ اور فقیر دونوں یکساں تھے ان کے ہاں کا جشن اور اعلان صرف خطبہ تھا مسلمانوں میں یہ رسم شاہان مغلیہ کے عہد سے شروع ہوئی،

جشن کچھ جشن شاہی پر ہی مقرر نہیں ہے اکثر جگہ تہواروں کے موقعہ پر بھی جشن منائے جاتے تھے۔ یہ ایک قسم کی خوشی کا اظہار تھا خواہ تہوار ہو یا کوئی اور خوشی سب ملکر ایک جگہ جمع ہوئے اور جشن ہو گیا بلکہ اس مشہور مثل کو پیش نظر رکھکر کہ "مرگ انبوہ جشنے دارد" یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ جشن کے معنے مجمع کے ہیں جہاں احباب جمع ہوگئے وہی جشن ہے"

مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے اپنی محبوبہ شاہا یا رُس کی لڑکی روبیس کو جو بالاخر اس کی ملکہ ہوئی ہے سب سے پہلے جسوقت دیکھا تو وہ تہوار منا رہی تھی، اور یونانی رسوم کے بموجب سانپوں کی پرستش کر رہی تھی۔

ہندوستان کے راجاؤں نے بھی جشن کا لطف خوب اٹھایا ہے، خاک پاک دہلی نے سب سے پہلا جشن راجہ بدھشٹر کا دیکھا اس کے بعد انقلاب زمانہ نے شاہان مغلیہ کے وہ وہ جشن دکھائے کہ آج کے دن تک تاریخ ان کے مزے لے رہی ہے، خطبہ جو ان کے مذہب کا سچا اصول تھا،

لاں میں بڑا بتقاریر رہا جشن شاہی کے موقعہ پر ادھر خطبہ میں بادشاہ کا نام لیا گیا ادھر ڈنکے پر چوٹ پڑی اور رعیت کو معلوم ہو گیا کہ آج ہمارا ولیعہد تخت نشین ہوا۔

مسلمان بادشاہوں میں اورنگ زیب کا درجہ کتنا ہی ارفع و اعلیٰ کیوں نہو مگر رعیت کی دلداری میں صاحبقران ثانی شاہجہاں کا نام ہی کچھ سے کم نہیں ہے جس کا پہلا حکم جلوس کے بعد یہ تہا کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کے سوا دوسرے کو سجدہ حرام ہے، میری رعیت اس حکم پر کاربند رہے اور مجھکو اپنے ہی جیسا انسان سمجھے، جلوس کے روز ۱۲۔ لاکھ روپیہ علماء وفضلا کو انعام دیا گیا اور اسقدر خیرات کیگئی کہ لوگوں نے اپنی جھولیاں بھر لیں۔

دلّی میں تاج برطانیہ کا یہ چوتہا دربار ہے جو اسوقت منعقد ہوا۔ اور جس میں شہنشاہ معظم خود تشریف فرما ہوئے اس سے پہلے سب سے پہلا دربار ۱۸۵۸ء میں نائب السلطنت لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں منعقد فرمایا اور یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ معظمہ مرحومہ کا اعلان رعیت کے سامنے پڑھا۔ غدر کے ہولناک واقعہ کو چونکہ بہت تہوڑا وقت گذرا تہا اور رعیت ابہی تاج برطانیہ کے انعام واکرام سے پوری طرح آشنا نہ ہوئی تہی اس لیے اس دربار میں ہندوستانی شرکا کی تعداد بہت کم تہی۔

سلطنت برطانیہ کا دوسرا اور اس لحاظ سے کہ لارڈ کیننگ کا دربار دربار نہ تہا پہلا دربار یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن نے دہلی میں منعقد کیا جو ملکہ معظمہ کے خطاب قیصرۂ ہند اختیار کرنے کی خوشی میں تہا یہ دربار چودہ روز رہا اور تقریباً ستر والیان ریاست کی شرکت نے اس جشن کی رونق کو دوبالا کیا۔ اس دربار کی یادگار میں بعض رؤسا کو خطاب مشیران قیصرۂ ہند

عطا ہوا اور علاوہ بعض مراعات کے سولہ ہزار قیدی ہندوستان کے جیلخانوں سے رہا کیئے گئے۔

اس دربار سے پہلے جواب منعقد ہو رہا ہے ایک اور دربار جو دلی میں تاج برطانیہ کا تیسرا دربار تھا ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن نے منعقد کیا جسمیں شہنشاہ ایڈورڈ کی تخت نشینی کا اعلان ہوا اس دربار کی سب سے بڑی یادگار وہ جلوس ہے جو ہاتھیوں پر نکلا، مرکٹ ہاؤس بھی اس دربار کی بے نظیر یادگار رہے جو لارڈ کرزن کے واسطے نہایت تزک و اہتمام سے تیار کیا گیا تہا،

گو دوسرے دربار میں لارڈ لٹن بھی ہاتھی پر نکلے مگر اس دربار میں تو ہاتھیوں کا ایسا جلوس نکلا ہے کہ اب شاید کبھی دیکھنے میں نہ آئے آگے آگے وائسرائے اور ان کے پیچھے تمام والیان ریاست، سب ہاتھیوں پر ان کی عماریاں اور جھولیں جگمگ جگمگ کر رہی تہیں، دو سو کے قریب ہاتھی اس جلوس کی قطار میں تھے اور ہر ہاتھی اور عماری سونے چاندی میں منڈھا ہوا تہا،

اب یہہ چوتہا دربار شہنشاہ معظم جارج پنجم کا ہے یہ تشریف آوری ہندوستان میں حضور کی دوسری مرتبہ ہے پہلے بہ حیثیت شہزادہ ویلز اور اب بہ حیثیت شہنشاہ۔ ہندوستان کی زمین سے شہنشاہ معظم کو ہمیشہ انس رہا اور ہندوستانیوں سے آپ نے اس وقت بھی ہمدردی ظاہر فرمائی۔ جب آپ پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں واپسی پر جب گلڈ ہال میں آپ کو مدعو کیا گیا تو آپ نے فرمایا،

اگر ہندوستان کے طرز حکومت میں ہمدردی کی بو اور پیدا ہو جائے

تو وہاں کی حکومت نہایت سہل ہوسکتی ہے،،

تاج برطانیہ نے ان الفاظ کی اسقدر زیادہ وقعت کی کہ ہندوستان
کی انتظامی کونسل میں ایک ہندوستانی ممبر مقرر ہوگیا،

جو صفتیں ایک بادشاہ میں ہونی چاہئیں وہ سب حضور میں موجود
ہیں، رعایا کے ساتھ آپ کو اسقدر ہمدردی ہے کہ اس دربار کے
متعلق جب پہلی تاریخیں تجویز ہوئیں اور حضور کو علم ہوا کہ عشرہ محرم کا
روز ہے تو فوراً آپ نے تاریخیں تبدیل کرنے کا حکم دیا،

ایک دفعہ شہنشاہ معظم کسی گانوں میں تشریف لے جارہے تھے ایک
بڑھیا عورت شوق دیدار میں آگے بڑھی اس عورت کی عمر نوے سال
سے اوپر تھی جوں ہی حضور کی نگاہ اس پر پڑی فوراً حکم دیا کہ گاڑی روک
کر اس کے پاس تشریف لے گئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے،

آپ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے سیاحت کا اسقدر شوق تھا کہ کسی بادشاہ نے
سیاحت نہ کی ہوگی جسقدر آپ نے کی، جہازرانی میں آپ کو خاص ملکہ ہے اور
نشانہ صحیح لگاتے ہیں کہ شاید ہی تمام انگلستان میں کوئی آپ کا نظیر ہو۔
۱۸۹۳ء میں حضور کی شادی ہوئی اور ۲۳ - جون کو پہلے صاحبزادے
پیدا ہوئے ۵۔ نومبر ۱۹۰۱ء کو آپ کو پرنس اوف ویلز کا خطاب ملا۔

رعایا نوازی حضور کی سب سے بڑی صفت ہے اور چونکہ طبیعت میں رحم کوٹ کوٹ کر
بھر دیا ہے اس لئے آپ کسی کی تکلیف کو گوارا نہیں فرماسکتے۔ عربی پاشا
جلاوطن کر دیا گیا ہے تو دوران سیاحت میں آپ سے اس نے رحم کی
التجا کی آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ اسے وطن واپس آنے کی اجازت ملی
آپ کی زباندانی کا تمام ملک میں شہرہ ہے۔

ملکہ معظمہ سے آپ بکمال عنایت پیش آتی ہیں فن انتظام خانگی کو نہایت مستعدی سے انجام دیتی ہیں حضور کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی ہیں اور شہنشاہ معظم و ملکہ معظمہ کو اپنے بچوں سے بے حد محبت ہے،

ہماری دلی دعا ہے کہ خداوند کریم ہمارے شہنشاہ اور شہنشاہ بیگم کو معہ خاندان ہمیشہ خوش و خرم رکھے،

شیخ محمد اکرام

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تاخیر اشاعت ایک ایسا بدنما دھبہ ہے جو پرچہ کی تمام خوبیوں کو زائل کر دیتا ہے، باوجود اس علم کے نومبر اور دسمبر کے پرچے وقت پر شائع نہ ہو سکے، جس کی وجہ سے ناظرین تمدن کو انتظار کی سخت تکلیف ہوئی،

ہم اپنے ناظرین کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم انکی اس تکلیف سے دم بھر کو بھی غافل نہیں اور جس قدر جلد ممکن ہوگا اس شکایت کو رفع کر دیں گے،

موجودہ حالات پر نظر ڈالتے ہوئے جنوری کے پرچہ کی بھی ہمیں اُمید نہیں کہ وہ وقت پر شائع ہو لیکن فروری کا پرچہ انشاء اللہ اپنے وقت پر شائع ہوگا اور فروری کی آخر تاریخوں میں ناظرین کی خدمت میں پہنچ جائے گا اُمید ہے کہ نومبر اور دسمبر اور جنوری کے پرچوں کی تاخیر مجبوری کی وجہ سے ناظرین تمدن معاف فرمائیں گے +

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)

قصیدہ در تہنیت تاجپوشی

پلا ساقیا بادۂ خوشگوار ہے مجھکو گام فرسائے ذی وقار
تھے مدت سے جسدن کے مشتاق ہم ہوا فضل خالق سے وہ دن بہم
یہ وہ وقت آیا کہ ہر خاص و عام حضوری میں حاضر ہوں بہر سلام
بڑے شان و شوکت سے آئے حضور معہ ملکہ تشریف لائے حضور
سوار اور کوتل کی اک سو قطار ہیں پیادے بھی اکثر صفا در کبار
شتر اور ہیلو نکا کیا ہو شمار کہ وہ بھی ہیں حاضر قطار و قطار
ہے بگھی و ٹمٹم کا اک سو جماؤ فٹن کی کسی جا ہے چل چلاؤ
وہ فوجوں کی ہلچل وہ باجونکا غل کہیں بین بجتی کہیں ہے ڈہل
جدھر دیکھو ہیں شامیانے کھنچے فروش اور شیشوں سے سب ہیں سجے
ہے منقش کے ڈوریونکی طناب فدا جسپہ ہے جان سے آفتاب
وہ بجلی کی قندیلیں ساری چڑھی جسے دیکھ شرمندہ ہے مشتری
چراغاں کی ہر سمت اک ہوم ہے صبح کا سماں گویا مفہوم ہے
گلی کوچے آراستہ ہیں تمام ہے تاریکی شب کا مفقود نام
غریبوں کو خیرات بٹتی ہے آج خوشی سے فلک پر ہے اونکا مزاج
ہیں اطفال اسکول بھی شاد کام ہے شیرینی کا بٹنا اونکو طعام
نہ پوچھو کہ کیا اندنوں عید ہے یہ رنگ و سماں قابل دید ہے
ہوا جب سے آباد چرخ کہن یہ دہلی نہ تھی ایسی رشک چمن
نئے سر سے دہلی میں آئی بہار نئے طرز سے اس نے پایا سنگار

کبھی اسکو حاصل نہ تھا ایسا اوج — کہ لوگ آئے ہوں اسطرح فوج فوج
یہ خوشیاں شہنشہ کی آمد کی ہیں — شہ جارج پنجم کی آمد کی ہیں
وہ مقبول عالم شہ کامراں — کہ ہیں جارج پنجم شہ خسرواں
ہیں والی لندن شہنشاہ ہند — کہ اکثر شہاں خوشہ چیں ہیں وے ہند
مکاں واں کے آراستہ ہیں تمام — جہاں ہوں فروکش شہ نیکنام
نشاط و خوشی کا ہے دن اندنوں — ہے معدوم رنج و محن اندنوں
شہنشاہ مع ملکۂ تاجدار — ہوئے رونق افروز با صد وقار
دسمبر کی بارہ و گیارہ کا دن — مبارک تو کر شہ کو اے ذوالمنن
فقط دہلی میں ہی نہیں یہ سماں — کہ معمور ہے اس سے ہندوستاں
یہ خوشیاں شہنشہ کے مقدم کی ہیں — یہ فیاضیاں جارج پنجم کی ہیں
کہ ہر قریہ و دیہہ رشک چمن — خوشی کرتے ہیں ہر جگہ مرد و زن

کہاں تک لکھوں تاجپوشی کا حال
کلیم اک غزل پڑھ بشوق کمال

مبارک تاجپوشی جارج پنجم — بعون خالق عالم و آدم
عدو برباد اور احباب خرم — رہیں زیر فلک جبتک ہے عالم
مبارک ہو تجھے یہ شان و شوکت — بجے نوبت شہا تیری دمادم
تجھے اس ہند کی شاہی مبارک — جہاں میں تو ہے شاہ معظم
قیامت تک رہے یہ بول بالا — سدا سر پر ہمارے رہ تو قائم
رعایا پر سدا الطاف رکھنا — دعائے خیر لینا اُنسے ہر دم
رعایا جڑ ہے شہ مثل شجر ہے — اسی جڑ سے شجر رہتا ہے قائم
زمین و آسماں جبتک ہے شاہا — اڑے فضل خدا سے تیرا پرچم

مہ جبین اندرا

آج سے کئی ہزار برس پہلے، جب یہ سنسار، موجودہ تمدن و تہذیب سے کوسوں دور تھا، گو آجکل کی بہت سی نعمتوں اور مصیبتوں کا اس وقت ظہور نہ ہوا، مگر، نظام عالم کی صورت یہ ہی تھی جو آج صدیاں بیتنے اور جگ گذر جانے پر دکھائی دے رہی ہے، انسانی صورتیں ایسی ہی تھیں، پہلو میں دل اسی طرح کے تھے، مگر دل میں جو جب تھا وہ اب نہیں، اور جو اب ہے وہ جب نہ تھا، پریم اُن دلوں کا مسکن اور سچی محبت اُن لوگوں کی زندگی تھی، نیلا سفید آسمان جو آج سر پر چھایا ہوا ہے، جب بھی تھا، اور یہ ہی پیلی کچیلی دھرتی جو آج پاؤں لگ رہی ہے، اُس میں بھی تھی، ان ہی دنوں کی ایک رات کا ذکر ہے آسمان پر سکون مطلق طاری تھا، چھوٹے چھوٹے تارے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور پورنماشی کا چاند جمنا کی لہروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

دریا کے کنارے ایک جوگی کی منڈھیا تھی جس کے چاروں طرف ریت کے ذرے چمک رہے تھے اندر ایک سادہ سا آسن جمائے اور پہلو میں ایک حسن کی دیوی خاموش بیٹھی تھی۔ اسکی سوہنی صورت سنگھار کی محتاج نہ تھی قدرت نے اسکو اپنے ہاتھ سے گھڑا تھا ایک ہلکی سی ملگجی ساڑی اس کے نازک جسم کو چھپاتے ہوئے تھی جسپر سیاہ اور لمبے بال ناگنی کی طرح لہرا رہے تھے۔ سفید براق پیشانی پر ہلکے سے تلک نے موہنی صورت کو

چار چاند لگا دیے تھے۔ چاند کی روشنی منڈھیا میں سے چھن چھن کر اس مہ جبین پر پڑ رہی تھی اور چاند اس کے حسن خداداد پر عش عش کر رہا تھا ہرن۔ بارہ سنگھے۔ چکارے۔ اس کے آس پاس کلیلیں کر رہے تھے۔ اور گو آرائش ظاہری کا اس کے حسن میں پتہ تک نہ تھا۔ مگر محبت کا سرمہ آنکھ میں جھلک رہا تھا۔

دریا، دریا کی لہریں، سو گئیں۔ منڈھیا کی پشت کے باغ پر اوس پڑنے لگی، کھلے ہوئے پھول تیوری پر سر رکھ کر لیٹ گئے، بلبل خاموش، بھونرے بیخبر، ہرن چوکڑیاں بھولے، اور منڈھیا کی اگنی جلتے جلتے راکھ ہو گئی، ایک عالم سنسان تھا کہ یہ نازنین انداز دلربایانہ سے اٹھی منڈھیا سے باہر آئی سہکتے ہوئے چاند پر نظر ڈالی اور ایک ٹھنڈا سانس بھرتی ہوئی گلاب کے تختہ پر پہونچی۔ ہوا اپنی نازک انگلیوں سے زلف عنبرین کے لچھے بنا رہی تھی۔ اور چاند کا سایہ لب نازک پر پروانہ وار گر رہا تھا، گلاب کے کٹورا سے پھول چاروں طرف کھلے ہوئے تھے اور پچھلی رات کی ہوا خوشبو میں بسی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، نازنین ایک ایسی جگہ ٹھٹکی، جہاں ہوا کی بدولت چشمہ کا شفاف پانی ایک سدا بہار گلاب کے پھول کے بوسے لے رہا تھا، ٹھٹکی اور ٹھٹک کر تھی ما تھمی اور تھمکر بیٹھی بیٹھی اور بیٹھکر اٹھی، اٹھی اور اٹھکر منڈھیا میں آئی، اور حسرت سے ایک کونہ میں بیٹھ گئی، نرگسی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ڈھلک ڈھلک کر نرم اور نازک رخسار و سینہ پر بہہ رہے تھے، اور پیشانی کا بل قلب مضطرب کی دھڑکن ظاہر کر رہا تھا، ابھی یہ آنسو خشک نہ ہوئے تھے کہ جوگی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا "اندرا"

اندرا۔ ہاں مہاراج!

جوگی۔ من کی چنتا دور ہوئی؟

اندرا۔ ہے مہاراج میری منتی پر دھیان کیجئے اور اس دشواش کو من سے دور کیجئے۔ راجوں کے راج سری مہاراج میں آپ کی چیری ہوں، دیا کیجئے، اور میری لاج رکھ لیجئے، ہے مہاراج! وہ مالش نہیں تھا راجپندر جی کا اوتار تھا، سپنے میں درشن دیئے اور من موہ لیا

جوگی۔ اندرا! ہٹ جا! پرے ہو جا! تیرے جیو میں پریم نہیں! تو استری ہے، چاتر ہے، تو نے اے اندرا دھوکا دیا! میرے راج پاٹ کو دیکھ! یہ تمام سنسار ایک دم میں جھلس دوں، جلا دوں، راکھ کر دوں! تو! اے اندرا تو، اور! تیرا سپنا، سب بھسم ہو جائیں، جا! جا! جا! اندرا دور ہو جا!

(۲)

برسات کی اندھیری رات ہے، دل امنڈ امنڈ کر آ رہے ہیں! اور گھٹا جھوم جھوم کر برس رہی ہے، جمنا کے اس کنارے پر جہاں مندھیاٹھی ایک عالیشان محل بنا ہوا ہے۔ جوگی مہاراج کا جوگ ختم ہوا، آج وہ اس سرزمین کا راجہ ہے، بڑے بڑے رشی اور منی، گیانی اور دیانی، ڈنڈوت کر رہے ہیں، گنگا جی کا اشنان، مہاراج کی سالگرہ، اندرا کی سواری دیوی کے مندر پر دیا بالنے جاتی ہے،

مہارانی اندرا کے حسن کا سکہ روئے زمین پر بیٹھا ہوا تھا، اس کی آن بان اس کی سج دھج یوں ہی ہزاروں دل پامال کر چکی تھی اسپر اس کا بناؤ سنگار ایک قیامت تھی کہ چاروں طرف لوٹ رہی تھی

کوہ نور کو شرمانے والے جواہر نگار بندے کانوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے اور سات لڑی کا نزے موتیوں کا گلو بند سینہ پر جھلبل جھلبل کر رہا تھا پکھراج اور نیلم کی چوڑیاں ست حنائی کے آگے سر بسجود تھیں گورا رنگ اور رنگ میں ملاحت زرین لباس گلابی رنگت کتابی چہرہ قاتل صورت آفت کی رفتار۔ قیامت کی گفتار محبت کی کہری قاف کی پری، نشہ عشق میں چور اندرا جنت کی حور راجہ کے روبرو پہنچی چرن سیئے ڈنڈوت کی اور یہ اشیرباد دی مہراج کا راج پاٹ رہتے سنسار تک،

راجہ یوں ہی اندرا کے نام کا دیوانہ تھا صورت دیکھتے ہی دل ہاتھ سے نکل گیا، پچھلی باتیں بھول بسر گئیں، بے اختیار ہو کر اٹھا اور دیوانہ وار پیشانی کو بوسہ دیا،

راجہ۔ اندرا! پیاری اندرا! اس موہنی مورت میں یہ من، اور اس من میں یہ کھوٹ،

اندرا۔ سری مہاراج! میرے من میں ماس کی چنتا نہیں وہ راجہ جی کا ادھار اس کے برہ کی ماری ہوں اور اس کی چنتا دور نہیں ہوتی۔

راجہ۔ ہٹ، ہٹ جا! اندرا، چلی جا دور ہو جا،

(۲)

پرستش کے قابل ہے شاہجہاں آباد کی وہ مقدس سرزمین جس پر اندرا جیسی حسن کی دیویاں جو ایک عالم سے اپنی وفاداری کی داد لے گئیں پیدا ہوئیں! دنیائے تاریخ، ان متبرک ناموں کو آنکھوں پر رکھ کر ان کے کارناموں پر قربان ہو گی، اور جب تک فانی دنیا میں شاہجہاں آباد کا وجود ہے عشق اس سرزمین کا طواف اور محبت جھک جھک کر

سجدے کرے گی عقلِ رسا آج تک حیران ہے، قیاس کام نہیں کرتا اور ذہن مجبور ہے کیسے امید تھی کہ رانیوں کی رانی خلوص کی راج دھانی جگ کی دلاری اندرا پیاری حسن کی کان، والی ملک کی جان، صرف اسی صورت پر جو خواب میں دیکھی عمر عزیز قربان کردے گی!

شاہجہاں آباد والے اس کا احسان نہ مانیں، اور ہندوستان اس کے نام سے لاعلمی ظاہر کرے مگر یورپ اس کی ہر ادا پر شیدا رہا اور آج بھی کہ سینکڑوں ہزاروں برس گذر گئے یورپ کے عجائب خانے اس کی تصویر پر ناز کر رہے ہیں +

دلی اس سے انکار نہیں کرسکتی کہ محبت کا پہلا فانوس اندرا کے ہاتھوں اس کے کھنڈروں میں روشن ہوا، ثابت قدمی نے اس کے حوصلے بڑھائے عشق نے تاج شاہانہ سر پر رکھا، اسی کا صدقہ ہے کہ آج اس وقت تک سینکڑوں خاندان اس کے نام سے پل رہے ہیں، راجوں کے راجا اور بادشاہوں کے بادشاہ جن کی آج ہڈیاں بھی گل کر خاک ہوگئیں اس کا کلمہ پڑھتے رہے کس کا منہ ہے کہ اندرا جیسی مہ جبین پر بیوفائی کا الزام لگادے۔ رانی نہیں چیری اور چیری نہیں کمیری بھی۔ مگر پہلو میں وہ دل رکھتی تھی جس پر آج کے دم تک حسن کی مجسم دیویاں شکریہ کے پھول چڑھا رہی ہیں۔

اللہ بس باقی ہوس! اندرا محبت کی لاج رکھ گئی! اور ایک عالم کو دکھا گیا کہ خاک ہندوستان سے ایسی وفادار روح پیدا ہوئی جس کا جواب دنیا کے باقی حصوں سے آج تک نہ ملا +

ایک سا نہیں تو اب اور کل تک تھیں تو آج اسی ہندوستان والے

سینکڑوں ہزاروں اس مہ جبین پر جو محبت کی رسیا آنکھوں کو حسن کا جلوہ دکھا گئی جس کی ہر ادا بجلی کی طرح دلوں پر گری جس کا ہر انداز تیر کی مانند کلیجو نمیں گھسا۔ بیوفائی کا الزام لگائیں گے مگر ان ہی سنگدلوں میں دو چار نہیں لاکھوں کروڑوں ایسے بھی نکلیں گے جو مہارانی اندرا کے اس استقلال کی داد دیں۔ سٹ گئی اجڑ گئی برباد ہو گئی سینہ پر خون کی ندیاں بہیں بڑے بڑے جان نثار آنکھوں کے سامنے زمین میں لوٹ گئے مگر محبت کی دھن میں فرق نہ آیا نت نئے داغ کلیجہ پر لگے اور انوکھی مصیبتیں سر پر ٹوٹیں لیکن جس صورت پر دل نثار کیا اس کی یاد ہاتھ سے نہ دی۔

ہمیں اس لکھنے میں مطلق تامل نہیں کہ راجہ اندر کی اس دعا میں کہ اندرا ایک روز اپنے محبوب کے گلے لگے گی۔ سب سے بڑی سفارش اس کی سندر صورت تھی اور گو زمانہ کی رائے ہمارے موافق نہ ہو مگر ہم علی الاعلان کہیں گے کہ راجہ جو کچھ بھی تھا انسان تھا اندرا حسن کی وہ پوٹ تھی کہ بارہا فرشتوں نے اسپر درود پڑھی +

ہم اب کہتے ہیں کہ اندرا گری پڑی عورت نہ تھی اندرا وہ نازنین تھی کہ کوہ نور جیسے ہیرے اس کے ادنیٰ خادم اور تخت طاؤس اس کا معمولی غلام +

زمانہ کتنا ہی بد تہذیب ہو جائے اور انصاف کی آنکھوں پر کیسے ہی باریک پردے پڑ جائیں، لیکن شاہجہان آباد اور اس کی چونسر دہرتی مہارانی اندرا کا نام تا دم واپسیں کلیجہ سے لگا رکھے گی۔

(۴)

ہم وہ نہیں مگر وہی جمنا کا کنارہ اور عالیشان محل، سہ پہر کا وقت ہے، راجہ ایک طلائی مسہری میں لیٹا ہے پہلو میں رانی اندرا ہے، اور رگوں کا جگر حرارت عشق سے تڑپ رہا ہے مگر نازک ہاتھ راجہ کے سر پر مورچھل کر رہے ہیں۔ گرمی قیامت خیز ہے، لو کے تند و تیز جھونکے کائنات کی ہر شے کو جھلسا رہے ہیں، لیکن اندرا کی سندر صورت نے راجہ کو سب تکلیفیں بھلا دیں۔ تاج شاہانہ اندرا کی گود میں ہے اور محبت بھری نظریں اس کے رخ نازک پر!

راج دلاری نہیں فرشتوں پیاری اندرا اسوقت سبز لباس میں تھی موسم بہار اس کے قدموں پر نثار ہو رہا تھا اور نسرین و یاسمین اس کی گود میں لوٹ رہے تھے راجہ اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتا تھا۔ اندرا جیسی نازنین پہلو میں تھی تاب رائی ضبط نہ رہا تو اُٹھا اور کہنے لگا!

مہارانی! یہ سیس تیرے چرن پر ہے، دیا کر،

اندرا۔ ہے مہاراج! اندرا، باندی ہے، اس کی لاج تمھارے ہاتھ۔

اتنا کہکر اندرا نے اپنے دست سیمیں راجہ کے گلے میں ڈال دئیے۔

در اور دیوار۔ آسمان اور زمین المختصر کائنات اور کائنات کا ذرہ راجہ کی تقدیر پر حسرت سے نظر ڈال رہا تھا، دونوں کی آنکھ سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ سبز اوڑھنی کا سر اندرا کے سر سے ڈھلک کر کاندھے پر آپڑا تھا، حسن کی دیوی اس وقت محبت کی پوری تصویر تھی، ہاتھ راجہ کے گلے میں تھے اور دل یاد دلدار میں،

(۵)

اِن خیالوں کو مدتیں ہوئیں وہ باتیں کہانیاں اور وہ راز و نیاز فسانے ہو گئے، آج جمنا کی لہریں راجہ کی موت کا نوحہ پڑھ رہی ہیں، شہر پر ایک سناٹا چھایا ہوا ہے عالیشان محلوں کے سر بفلک کنگرے اپنے مکین کے فراق ابدی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں۔! سدا بہار اور رنگ برنگ کے پھول جن کی خوشبو آسمان تک اُڑتی تھی پامال ہو گئے اور وہ بار آور سر سبز ڈالیاں جن پر طائران خوش الحان نغمہ سنجی کرتے تھے اندرا کی بیوگی کا ماتم کر رہی ہیں، آدھی رات کا وقت ہے اور اندرا صرف ایک قمقمہ کی روشنی میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے، راجہ کا صدمہ اسکے دل سے زائل ہو چکا، مگر خواب کی صورت وہ مستقل لگن ہے جو کسی طرح فراموش نہیں ہو سکتی۔ کلیجہ میں ہوک اُٹھتی دل میں نشتر چبھتے حلق پر چھریاں چلتیں مگر رات کسی طرح ختم نہیں ہوتی، دل بہت زیادہ تڑپتا تو اٹھ بیٹھتی، ٹہلتی پھرتی ادھر جاتی اُدھر جاتی دیوانہ وار ایک طرف جھانکتی، اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتی آسمان تاروں کا تھال لیے اندرا کے سر پر کھڑا تھا کچھ دیر اس میں محو رہی اور دفعتہً چلا اُٹھی:-

جھمکو، جھمکو، آسمانی تارو، اندرا کے سر پر جھمکو، اُڑو، اُڑو، ہوا کے جھونکو فضائے عالم میں اُڑو، اُڑو اور اندرا کی ہستی اُڑا دو، بھیگ، بھیگ، شب سیاہ اچھی طرح بھیگ، اور اندرا بدنصیب کو، تھوڑی نا اُمیدی میں بھگو، آ! آ! صبح قیامت آ! رات کا دامن اور اندرا کا سینہ چاک کر، آ اٹھا! اٹھا، ظالم آسمان، اپنی کشش سے اندرا کو

اُٹھالے، جذب کرلے، غارت کردے،

(۶)

اثر محبت کی قائل ایک دنیا اور کشش قلب کا معترف ایک عالم سہی، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اندرا جیسی رانی جس نے دعوئے عشق میں راجہ جیسے عاشق زار کو قربان کیا کامیاب نہ ہوتی۔ اندرا عشق زلیخا کی سچی مثال تھی جس طرح قسمت نے زلیخا کو یوسف کے گلے لگادیا یقیناً اندرا اس محبوب کی محبوب ہوتی۔ جسکو خواب میں دل دے بیٹھی مگر اس کا کیا علاج کہ وہ خود گو صورت کی آشنا تھی مگر نام ونشان سے مطلق بے خبر۔

ایک زمانہ اسی طرح گذرا، ہوا کے جھکڑ چل چل کر رکے باد صبا سر اُٹھا کر بند ہوئی، مینہ کی جھڑیاں بس بس کر تھمیں، اور خطرناک طوفان آآ کر ٹلے مگر نہ تھما آنکھہ کا آنسو تو اندرا کا جس کو دنیا اندھیر اور شاہی محل مٹی کے ڈھیر تھے، رات کے سنسان وقت میں سر پر بجلی اور طوفان، آنکھہ کے سامنے جنگل اور بیابان، اندھیر اگھپ، درودیوار چپ، پتے بیہوش، چڑیاں خاموش، اور اندرا بد نصیب، یاد حبیب میں سرشار مضطرب و بیقرار، پھر رہی ہے، ایک رات تن تنہا، کنہیا کے خطرناک جنگل میں تھی کہ نیند نے غلبہ کیا، زمین نے میزبانی میں فرش خاکی بچھایا، دریا کے پانی نے ترانے سنائے، ہوا نے لوری دی، اور کنہیا کی مہمان، اسی خارستان میں سر رکھکر لیٹ گئی، لیٹنا تھا کہ آنکھہ لگی، اور آنکھہ کا لگنا تھا کہ ایک اور ہی سماں آنکھہ کے سامنے تھا،

ملک نیا، لوگ انوکھے، صورتیں عجیب، پوشاک نرالی، وقت رات کا ہے مگر اندرا آج چودھویں کے چاند کو مات کر رہی ہے، سر پر کارچوبی

دوشالہ گلے میں جواہر نگار رومال۔ گلاب کا پھول ہاتھ میں، سات سہیلیاں ساتھ میں ایک عالم کے دلوں کو پامال کرتی چلی جارہی ہے۔ چلتے چلتے ایک مقام پر پہونچی جہاں کی رات پر دن صدقہ ہورہا تھا، جشن شاہی کی تیاریاں تھیں، اور ہزارہا بندگان خدا مسلح کھڑے تھے، اندرا کا پہونچنا تھا کہ خلقت جشن و جلوس سب بھول گئی، ایک چشم زدن میں کئی لاکھہ نگاہوں نے اس کی سلامی ادا کی ہاں سینکڑوں دل پامال کرتی ہوئی، اندرا قصر شاہی میں پہونچی، دیکھتی کیا ہے کہ ولیعہد سلطنت کے دائیں ہاتھ پر وہ چاند چمک رہا ہے جس کی عاشقِ زار تھی، دل بے اختیار ہوگیا، صبر کی دھجیاں اڑنے لگیں قریب تھا کہ دوڑ کر لپٹ جائے شرم وحیا نے پاؤں پکڑے کھڑی ہوگئی مگر ششدر، نگاہ اس چہرہ پر تھی جس کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی، اور جام محبت سے لبریز دل چھلکنے والا تھا کہ بادشاہ اور ولیعہد مہمان اور میزبان ایک ایک کر کے رخصت ہوئے،

اب اس عالیشان محل میں اندرا اور مقصود کے سوا کوئی نہ تھا، محبت بھری نظریں ایک دوسرے کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں، دلوں کی کشش نے روز کیا اور اندرا کی آہ رسا تاثیر لائی چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ مقصود فرط محبت میں لپکا گو ولیعہد کا لڑکا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اندرا ہی مہمانی ہے مگر رعب حسن تھا یا داب شاہی محبت کی زنجیر پاؤں میں آپڑی بڑھا اور ہاتھہ پکڑ لیا،

اندرا۔ اس مہماں نوازی کا شکریہ قبول فرمایئے۔

مقصود۔ پیاری اندرا، میرا منہ نہیں کہ آپ کی تکلیف کا شکریہ ادا کرسکوں، آیئے آیئے اس تخت پر آرام فرمایئے،

اندرا- میں خاک کی رہنے والی تخت شاہی کی قدر کیا جانوں، یہ خدا آپ کو نصیب کرے +

مقصود- خدارا مجھ پر ظلم نہ کیجئے، میرے پاس نہیں تو دوری سہی، لیکن انصاف اجازت دے تو قلب مضطرب پر ہاتھ رکھ کر اتنا دیکھ لیجئے، کہ یہ حسن خداداد مجھ پر کیا اثر کر گیا،

خوشا نصیب، اس مجھ ہی جیسے انسان کے جو اس صورت کا پرستار اور اس نازک دل کا مختار ہو۔

اندرا کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ بلبل نے کہیا کہ جنگل میں صبح کا پیام پہونچا دیا آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا،

(۷)

چاند؟ نہیں! پری؟ نہیں نہیں! حور؟ ہرگز نہیں! اندرا ایک پھول تھی پھول؟ جس نے تمام دنیا کو مہکا دیا! جس کی خوشبو پورب سے پچھم اور ...سے دکن تک پہونچی، جس کی خوبصورتی کا شہرہ، جس کے حسن کی دھاک عالم میں پھیلی،

آفتاب کو نکلے مشکل سے دو گھڑیاں ہوئی ہونگی، کہ قبیلہ لنگوہی کا مشہور سردار، صبح شام ایک کرتا ہوا شاہجہاں آباد پہونچا، اور جمنا کے کنارے ...رسے ڈال دیے کیسی کیسی مشاطائیں جو آسمان میں تھگلی لگائیں، ...و جواہر لٹا کر مہیا کیں، کہا جو کچھ کہہ سکتا تھا اور کر ڈالا جو کچھ کر سکتا تھا ...عشق کا وہ طوق جو اندرا کے گلے میں خواب نے ڈالا اتر نہ سکا، کوئی خوشامد ...ت کوئی ظلم، کوئی سختی، ایسی نہ تھی جس سے کام نہ لیا ہو، ظالم ...میں نفس کا بندہ نکلا اور لنگوہی خاندان کی عزت پر

ایسا دھبہ لگایا کہ تاریخ اسکو فراموش نہیں کرسکتی، اندرا کے حمایتی چن چن کر پکڑے اور وہ قدیم نمک حلال جو اس کی عزت کے ساتھ جانیں لڑائے ہوئے تھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے دکھا دکھا کر مارا اور ستا ستا کر پیٹا مگر واہ ری بہادر اندرا، استقلال کے پاؤں اپنی جگہ سے نہ ٹلے،

(۸)

زر، زمین، زن، کہتے ہیں، کہ یہ تین چیزیں جھگڑے کی اصل فساد کی جڑ ہیں، سچ، جھوٹ، خدا جانے، مگر اس میں کلام نہیں کہ اندرا کو اس کا حسن مصیبت ہوگیا، ایک صورت اور سینکڑوں عاشق زار، ایک انار اور صد بیمار، کس کس کو آغوش میں لے، اور کہاں کہاں دلداری کرے خدا خدا کر کے راجہ کے قبضہ سے نکلی سمجھی تھی کہ اب باقی عمر اطمینان سے بسر ہو جائے گی۔ وصل نہ ہوگا تو فراق کی سختیاں تو ہونگی دکھ بھرونگی مصیبتیں جھیلوں گی رقیبوں کا کھٹکا اور ان آسمانی بلاؤں کا خوف تو نہ ہوگا، موت آئے گی مرجاؤں گی اور یہ کہتی ہوئی اٹھوں گی سے

حاصل عمر فدائے سر یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

مگر افسوس اس ظالم نے وہ ستم توڑے کہ کلیجہ منہ کو آگیا،

دوپہر ڈھل چکی تھی کہ قصائی چاروں طرف قتل عام کرتا ہوا اندرا کے محل میں گھسا، بدنصیب رانی کا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا، سوچتی تھی کہ اب عصمت کا خدا ہی حافظ ہے مردوں کے سورما اور وفادار جو موتی تھے اور دشارے پر جان نثار کرنے کو موجود تھے جانیں قربان کر گئے۔ کوئی بادشاہ نہیں کوئی حاکم نہیں کہ فریاد کروں اور جان بچاؤں چپہ سارہی جیسے

برس کا دیو رہے موذی نے اسے کیا چھوڑا ہوگا بسبب فساد تو میں ہی ہوں یا میری وجہ سے نہیں تو میرے سبب سے یہ ہزارہا لاشیں خون میں تڑپ رہی ہیں، اتنا کچھ دیکھ چکی اور کیا کیا دیکھوں گی، بس اس دنیا کو خیرباد کہوں، محل کے نیچے جمنا کس آن بان سے بہہ رہی ہے اس کی لہریں گود پھیلا کر مجھے لیں گی اور یہی اڑتا مچلتا پانی اس پیاری صورت تک یہ پیغام پہونچا دیگا کہ اندرا بدنصیب تجھ پر قربان ہوگئی، مگر اتنی دور کیوں جاؤں، کانوں کے آویزے چھنگلیا کی انگوٹھی سر کا سیس یہ تینوں ہیرے جو اب تک حسن کو ترقی دیتے رہے آج زائل کر دینے کو کافی ہیں،

ابھی اس خیال کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ قزاق قصر شاہی میں گھس آئے اور قتل عام کر دیا سنگ کی سہیلیاں اور ساتھ کی کھیلیاں آنکھوں کے سامنے لٹیں اور بھروسے کے نمک حلال دیکھتے دیکھتے خون میں نہا گئے، بیرحم جلاد نے اب خاص کمرے کا رخ کیا۔ قدم دھرنا تھا کہ اس صورت سے چار آنکھیں ہوئیں جس کا شہرہ ہزاروں کوس کی منزل سے کھینچکر لایا تھا،

مہ جبین اندرا اس وقت میلی کچیلی کرتی ملگجی سی اوڑھنی اوڑھے تصویر کیطرح کھڑی تھی، مگر یہ موہنی صورت اس حالت میں بھی غضب ڈھا رہی تھی، عزیزوں کے خون کے قطروں نے افشاں بنکر پیشانی کو جبین عروس کر رکھا تھا سنگدل سردار نے ایک آہ سرد بھری اور "ہائے اندرا" کا نعرہ لگا کر بڑھا،

قیامت خیز وقت تھا کہ اندرا جیسی نازنین کو بچاؤ کی صورت نظر نہ آتی تھی مگر واہ رے حسن اور مرحبا رعب حسن اس موقعہ پر بھی وہ کام کیا

کہ تیر و تفنگ سب رکھے کے رکھے رہ گئے، اندرا کا اتنا کہنا ایک بجلی تھی کہ ظالم دل پر اس طرح گری کہ جلا کر خاک کر دیا،

"آیئے آیئے، اور اس سنسان محل کو رونق دیجئے"

اندرا جیسی دلربا کے لب لعلین سے یہ الفاظ ایک جادو تھا کہ سردار کے اوپر پورا کارگر ہوا - اس کی صورت اور اپنی قسمت کا مقابلہ کرتا تھا، دل خوشی کے مارے ہاتھوں اوچھل رہا تھا اتنا کہکر پاؤں میں گر پڑا،

بیگم بہت روز تک مصیبت بھگتی، اب کچھ دن جوانی کے لطف دیکھو!

اندرا - (پاؤں سے سر اوٹھا کر) آپ ایک قبیلہ کے سردار اور ایک ملک کے حاکم ہیں سینکڑوں ہزاروں لاکھوں رعیت آپ کے پاؤں پر سر رکھتی ہے سر اُٹھایئے اور میری عزت افزائی کیجئے،

سردار - بیگم! کامل تین سال سے اس صورت کی شہرت نے دل تڑپا رکھا تھا آج دیکھنی نصیب ہوئی، کیا میری تقدیر اس قابل ہے کہ آپ میرے ہمراہ میرے قیام گاہ پر تشریف لے چلیں،

اندرا - یہ گھر بھی آپ کا اور وہ گھر بھی! مجھے لے چلئے یا خود تشریف لایئے، بہتر ہوگا کہ مہمان نوازی کی عزت میں حاصل کروں اور اجازت دیجئے کہ شام تک اس جھونپڑی کو آپ کے قابل بنانے کی کوشش کروں -

سردار - بیگم میں محل اور عزت کا طلب گار نہیں صرف اس صورت کا بھوکا ہوں جس نے مجھکو دیوانہ کر دیا، تعمیل میں عذر نہیں، جاتا ہوں شام کو حاضر ہونگا -

خدا کی شان جس سرزمین پر تمام دن خون کے دریا بہتے رہے

بجے رہے وہ رات کو خود جنت بن گئی، اندرا کہنے کو تو عورت تھی مگر مردوں سے زیادہ کام کر گئی اور اس حال میں کہ نوکر چاکر عزیز اقارب سب لقمۂ اجل ہو چکے تھے، اس افراتفری اور غدر کے موقع پر چٹکی بجاتے میں محل دو محلے سب سجالیئے، آرام گاہ امر واقعی یہ ہے کہ جنت کو مات کر رہی تھی طلائی مسہری گنگا جمنی پردے، سنہری ڈوریاں، روپہلی اتکئے، موتیا کے گجرے چنبیلی کے کنٹھے، المختصر سردار لنگوہی کی آنکھیں بھی رانی اندرا کا ٹھاٹھ دیکھکر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس سامان پر طرہ اندرا کا اپنا دلہنی لباس تھا

سمجھو کہ شب چاندنے آن کے   نکلا ہے منہ کیسے سے وہاں کے

سردار صورت دیکھتے ہی بیقرار ہو گیا سامان نے نایاب موجود تھا اندرا کے نازک ہاتھوں نے مہمان نوازی کی،

رات آدھی کے قریب گذر چکی تھی کہ ظالم سردار کے دست شوق آگے بڑھے اور مہ جبین اندرا کو پہلو میں کھینچا،

تعجب ہوتا تھا کہ کس طرح قول کی پکی بات کی پوری دھن کی پکی اور دل کی اچھی اندرا مہ جبین اس ظالم کی مہمان نوازی کر رہی ہے، دفعۃً خنجر آبدار نازک ہاتھوں سے باہر نکلا اور چشم زدن میں سفاک سردار کی انتڑیاں باہر نکالکر پھینکدیں اتنی آواز تو سنائی دی،

”اے ظالم دغاباز اس صورت پر یہ دہوکہ!“

(۹)

حسن کا ڈنکا تو چار دانگ عالم میں بج ہی چکا تھا اس سے ایک دنیا اندرا کی شجاعت کا لوہا مان گئی،

اب مجروح دلوں کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اظہار محبت بے سوچے سمجھے کر بیٹھتے

انداز دلربائی وہی اور موسم شباب بہار پر تھا چشم کافر جدھر پڑتی تھی دل کے ٹکڑے اڑا کر رہتی تھی۔ ہزاروں شیدا پیدا ہوئے مگر دل کا ارمان دل میں رہا ایک روز شام کے وقت گرمی کے موسم میں نہا دھو کر محل کی تیسری منزل پر کھڑی ہوئی بال سکھا رہی تھی زلف شبگوں سے رنگ برنگ کے موتی ٹپک رہے تھے کہ ایک زابلستانی مصور ادھر سے نکلا اندرا کو علم تک نہ ہوا اور مصور تصویر لے سیستان روانہ ہو گیا،

یہ تصویر صحیفۂ قدرت کا ایک ورق تھا جس میں صناع حقیقی نے اپنے ہاتھ سے گلکاری کی تھی زلف شبگوں افعی کی طرح لہراتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی تھی اور دست سیمیں کی تین انگلیاں اس سانپ کو کھلا رہی تھیں ایک سیستان و زابلستان کیا تمام فارس لٹو ہو گیا مگر لنگوہی سے داتر کا انجام سنکر کس کی ہمت تھی کہ ادھر کا رخ کرتا ہاں وزیر جنگ کا لڑکا نادرالدولہ جان پر کھیل گیا اور دن رات ایک کرتا ہوا دلی پہنچا، اور کامل تین روز وہ قتل عام کیا کہ آسمان اور زمیں دونوں چلا اٹھے۔ تنگوہی مظالم از سر نو زندہ کر دیئے۔

ہم اتنا ماننے کو تیار ہیں کہ جس وقت زابلستانی شجاع اس مہ جبین کو بارگاہ شاہی میں لاتے ہیں اور نادرالدولہ اس کے آغوش میں سر رکھے لیٹا ہے تو چشم سیاہ سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے مگر یقیناً ہم زابلستانیوں کے اس دعوے کو صحیح نہیں مانتے کہ اندرا ان کے وزیرزادے کو دل دے بیٹھی مانا کہ ہزار دو ہزار میں ایک دیکھنے دکھانے کے لائق حسین و شکیل فرعدار و صفدار سب کچھ تھا، مگر اندرا کے دل کو کچھ اور ہی لو لگی ہوئی تھی یہ آنسو محبت کے نہیں رنج اور صدمے کے تھے جو مقصود کے فراق میں

اندرا کی آنکھ سے نکلے اور وزیرزادے کے رخسار پر گرے،

واقعات آنکھ کے سامنے ہیں، معاملات کی شہادت پر ناظرین انگلستانی ہوں یا ہندوستانی صاحب الرائے خود ہی فیصلہ کرلیں،

نادرالدولہ جب ہر کوشش میں ناکام رہا اور یہ یقین کرلیا کہ مواصلت کی امید مطلق غبط ہے اندرا خودکشی پر آمادہ ہے تو اسی شخص نے جو عشق کا مدعی تھا اس کے تاراج کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا، یہ اندرا کی خوش نصیبی ہے کہ وزیرزادہ عصمت سے ناامید ہوکر زروجواہر کے پیچھے پڑا اور اندرا ... کو لوٹ کھسوٹ کر کھک کر کے چلتا ہوا۔

(۱۰)

لیلی کا شیدائی مجنوں، شیریں کا فدائی فرہاد، مگر اندرا کے گھائل ... دل اور لاکھوں ہندو مسلمان عیسائی، ہر قوم میں اس کے عاشق اور ہر ... میں اس کے طلب گار پیدا ہوئے اور اپنی اپنی جگہ اپنی کرنی میں ... نے کسر نہ کی ان دو ظالموں سے چھٹکارا ہوا تو مرہٹوں نے ڈورے ... لے، ایک شفقی القلب تو دن دہاڑے گھر میں گھس آیا اور ایسے ڈیرے ... لے کہ نکلنے کا نام ہی نہ لیا نت نئے سوانگ بناتا اور طرح طرح کی چالیں چلتا، کامیابی کی کوئی کوشش ہاتھ سے نہ دی ظلم سہے تو وہ حد کے مکاری کی تو وہ پوری، لیکن، سچی محبت کا گھائل، وہ اچھا دل جو اندرا پہلو میں رکھتی تھی ... طرح نہ پسیجا، اور جو جس رستہ آیا اسی راستہ چلتا ہوا،

... ھنے والوں! فراق کی سختیاں ختم ہوئیں، داستان مصیبت سن لی، ... وصل کے مزے بھی لوٹ لو، ۷۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کی صبح ہے اور آج ... انک سے سکھ بنا دولہن اوڑھ انتظار یار میں گھڑیاں گن رہی ہے

زیور سے لدی پھولوں میں بسی، عطر میں ڈوبی، وہ حسن کی پوٹ جس نے ہزاروں کے دل لوٹ پوٹ کیئے جھروکوں میں بیٹھی دریا کے اس پار دیکھ رہی ہے، آسمان اس کے استقلال و صداقت پر، لطافت کے پھول نچھاور کر رہا ہے، قلعہ معلی کے در و دیوار اِس کے انتظار میں شریک ہیں اور جمنا اسکی کامیابی پر مبارکباد کے نعرے لگا رہی ہے، مشرقی میدانوں سے آفتاب عالمتاب کے بلند ہوتے ہی ثابت قدمی کے مبارک فرشتے آسمان محبت سے نیچے آئے خلوص کی کشتی عصمت کے خلعت فاخرہ سے جھلمل جھلمل کرتی ہاتھ میں تھی، اور وفاداری کے گہرے ارمانوں کی ہوا میں مہک رہے تھے،

خوشا نصیب! سرزمین شاہجہاں آباد! ایک اندر کی بدولت ماتیری شان و شوکت، کاڈنکا روئے زمین پر بجگیا، کفران نعمت گناہ کبیرہ ہے اسی کا طفیل ہے کہ جمنا کا وہ کنارہ جو ببول کے کانٹوں سے پٹا پڑا تھا آج گلاب کے پھول گود میں لیے کھڑا ہے، بیلے جیسے خارستان، اور کوٹلے جیسے بیابان، اسی کے صدقہ میں چمنستان ہو گئے، شاہجہاں آباد! اگر تیرے کھنڈران خزانوں سے مالا مال تھے جن کا اب دنیا نے ادب میں کال پڑگیا، تو تیرے باغیچے آج ان رنگ کے پھولوں سے شاداب ہیں جن کی مہکار آسمان تک پہونچ رہی ہے، شاہجہاں آباد انصاف کی آنکھیں کھول، تعصب کی عینک دور کر، اور تامل کی نظر سے دیکھ، اسی سہانی صبح کو، نورانی فرشتے، تیرے اجڑے ہوئے گلشن میں نازل ہو رہے ہیں، دیکھ، دیکھ، شاہجہاں آباد دیکھ، تیری نازوں کی پلی سرجبین اندرا کی بارگاہ آج محبت کے فرشتوں کی سجدہ گاہ ہے دونو فرشتے جھک گئے ہے

آگے بڑھے، اور اپنے ہاتھ سے اندرا کو دلہن بنایا،

(۱۱)

۷۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ٹھیک گیارہ بجے جس وقت شہنشاہ معظم نے سلیم گڑھ سٹیشن سے اتر کر قلعہ معلی میں قدم رکھا ہے دلی کی سرزمین خوشی کے مارے اچھل پڑی اور یہ آواز سنائی دی

"میں اندرا نہیں" "اندر پرستھ" "اندر پرستھ نہیں" "شاہجہاں آباد" "شاہجہاں آباد" نہیں دلی ہوں۔ وہ جوگی راجہ بدھسٹر لنگوٹی کا سردار۔ تیمور وزیرزادہ نادر اور مرہٹہ سیوا جی تھا، جنھوں نے مجھے لوٹ مار کر برباد کیا، اور آج یہ مبارک قدم میرے محبوب کے ہیں جس کو خواب میں دیکھا،

آج میرا مطلوب ایک عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ ہے اس کے قدم میرے سر اور آنکھوں پر ہیں، میں اندرا نہیں اندر پرستھ ہوں۔ "خدا میرے شہنشاہ کی عمر دراز کرے"

راشد الخیری

شہنشاہ بیگم ملکہ معظمہ میری ۲۶ مئی ۱۸۶۷ء کو پیدا ہوئیں کنگسٹن محل میں تربیت ہوئی اور والدین نے اخلاق کی درستی اور ہمدردی کا ایسا بیج طبیعت میں بو دیا کہ آپ اسوقت تمام انگلستان میں خلیق و رحیم مشہور ہیں شہنشاہ بیگم کو اپنے بچوں کے ساتھ بیحد محبت ہے اور کتب بینی کا شوق اسقدر زیادہ ہے کہ فرصت کے وقت میں ضرور کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ فرماتی رہتی ہیں نقاشی اور سوزن کاری میں قیصرہ معظمہ کو غیر معمولی درجہ حاصل ہے۔

ہر سال معصوم اور اپاہج بچوں کے لیے خیرات کی ایک رقم عطا فرماتی ہیں، ایک دفعہ ایک بچہ کو جو دق میں گرفتار تھا پیار کیا اور اس کی حالت دیکھکر دیر تک روتی رہیں۔ خدا ایسی مہربان قیصرہ کو ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے ✦

قصیدہ تہنیت جشن تاجپوشی اعلیٰ حضرت جارج پنجم شاہ قیصر کہ بدار الخلافہ دہلی انعقاد یافتہ

از تصنیف مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رئیس شہر میرٹھ

صبحِ صادق کا کھلا ایوانِ بار　　مثلِ ایوانِ سلاطینِ کبار
بتکدوں میں جابجا بجنے لگے　　نوبت و ناقوس و طنبور و سنار
گونج اٹھا بامِ کلیسا کا جرس　　خوابِ نوشیں کا ہوا زائل خمار
صحنِ مسجد سے لگا ہونے بلند　　نعرۂ "اللہ اکبر" بار بار
تھا وہ منشورِ نویدِ عافیت　　پڑ گئی اطرافِ عالم میں پکار
نور و سایہ کی بڑھی ہمسایگی　　گویا ہمرنگ ہیں لیل و نہار
امتزاجِ کیمیائی ہو گیا۔　　تھی دورنگی روز و شب کی ناگوار
چاہتی تھی دیدۂ بالغ نظر　　یہ نمائش گاہِ صنعِ کردگار
تھا خضوع دل سے مشغولِ دعا　　صومعہ میں زاہدِ شب زندہ دار
چشمِ معنی یاب سے اس نے بغور　　دیکھ کر یہ قدرتی نقش و نگار
دفعتاً کی جانبِ مشرق نظر　　ہو چلا سب رازِ پنہاں آشکار
آمد آمد شاہِ خاور کی ہوئی　　کوکبِ قدسی لگے ہونے نثار
نہضتِ رایاتِ شمسی کی خبر　　پے بہ پے دینے لگے کرنوں کے تار
نیّرِ اعظم ہوا با تاجِ زر　　جلوہ گر بالائے مینائی حصار

جگمگائے شہر کے دیوار و در — گنبد و بام و منار و کوہسار
دور سے سب کو نظر آنے لگی — بارگاہِ قیصرِ والا تبار
ہو رہی ہیں جشن کی تیاریاں — کارفرما شوق سے مصروف کار
خیلِ سرہنگانِ شاہی چاق و چست — برق سے چالاک تر موٹر سوار
اپنے منصب پر کمربستہ نقیب — اپنے عہدہ پر نگہباں چوبدار
ہیں پیادوں کی صفیں دیوارِ چین — سدِّ اسکندر سواروں کی قطار
ہر سپاہی طغرل و الپ ارسلاں — ہر پیادہ رستم و اسفندیار
توپ خانہ اژدرِ آتش فشاں — سامنے جس کے ٹھہر رونیں غبار
راس و چپ اعیانِ دولت کا ہجوم — گردِ شمسِ قیصری سیّارہ وار
ملکۂ دوران و خاقانِ زماں — مہرِ عالمتاب و ماہِ نور بار
جلوہ فرمائے سریرِ سلطنت — با شکوہ و شانِ اجلال و وقار
صفۂ قوسی میں شہ کے روبرو — داورانِ ذی حشم ذی اقتدار
خیل خیلِ خان و رایان و ملوک — جوق جوقِ سرفرازانِ دیار
نامبردارانِ طبقاتِ انام — عامۂ مخلوق بھی چندیں ہزار
ہند کے خطوں کا یکبستہ جوال — حاضرِ خدمت قطار اندر قطار
سب نے اعلانِ شہنشاہی سنا — گوشِ رغبت کا بنایا گوشوار
ہو مبارک تجھکو اے ہندوستاں — جارج پنجم کا یہ عہدِ زرنگار
دولت افروزیِ شاہنشاہ نے — تجھکو بخشا ہے وہ عزّ و اعتبار
لعلِ دیہیم شہنشاہی بنا۔ — تا فلک پہونچی کلاہِ افتخار
مدتوں سے سرزمینِ ہند تھی — تشنۂ دیدِ جلوسِ شہریار
الحمدللہ آج دیکھا خلق نے — شاہ کو گلگونِ دولت پر سوار

شاہ کی آمد ہے شادۂ انبساط — ہر خوشی ہے اس خوشی کی مستعار
چاندنی چوک آج آئیں بستہ ہے — سال بھر سے تھا سراپا انتظار
آج درشن کا جھروکہ کھل گیا — خلق نے دیکھی شکوہِ تاجدار
آج بیلہ میں جما میلہ کا رنگ — ایک نظارہ کے سب اُمیدوار
اُرک سلطانی بنا بزمِ سرور — جس میں خاص الخاص کا ہے دربار
ہند کی خوش قسمتی کا آفتاب — آج پہونچا تا خطِ نصف النہار
خاکِ پاکِ حضرتِ دہلی بنی — قدر و قیمت میں زرِ کامل عیار
یونین جیک آج ہے سایہ فگن — کل قلمرو پر بفضلِ کردگار
ہند کا مامن ہے اب ایک آستاں — جسکی عظمت نے مٹایا انتشار
قلعۂ چترال سے سیلون تک — حدِ چین سے تا بحدِ قندہار
مطمئن ہیں جملہ اقوام و ملل — متحد ہیں جملہ امصار و دیار
تھے بزرگ اِس قیصرِ ذی جاہ کے — گلشنِ ہندوستاں کے آبیار
آں جہانی رحم دل وکٹوریا — بعد ازاں اڈورڈ ھفتم صلح کار
خالقِ عالم نے سونپی تھی اُنہیں — خلقِ عالم کی زمامِ اختیار
مادرِ مشفق تھی اُن کی تربیت — اور ملکِ ہند طفلِ شیر خوار
اِس طرح کی پاسبانی خلق کی — جس طرح کرتی ہے ماں بچوں کو پیار
علم و دانش کے کیئے دریا رواں — ریگ زاروں کو بنایا لالہ زار
عدل کے دستِ قوی سے ہوگئیں — امن و راحت کی بنائیں استوار
عرض و طول و ملک میں پھیلا دیئے — مثلِ شریان و عصب ریل اور تار
کیا زراعت کیا تجارت کیا ہنر — سب پھلے پھولے نکالے برگ و بار
بسکہ آئینِ جہاں بانی کا ہے — رہبری عقل و حکمت پر مدار

ہند کا ہر گوشہ سچ مچ بن گیا — اس مبارک دور میں باغ و بہار
شاعرانہ مدح سنجی یہ نہیں — واقعہ ہے بر سبیل اختصار
جارج پنجم کا بھی یہ دورِ جدید — ہے انہیں ادوار کا آئینہ دار
ہے رفاہ و نظام کو نشو و نما — حال و مستقبل بہ از پار و پرار
شاہ کے مقدم میں اے ہندوستاں — کر وفا و مہر کے گوہر نثار
کر برابر پلۂ میزان میں — شاہ کی تمکین اپنا انکسار
کر اطاعت میں سرِ تسلیم خم — تو ہے احسانِ شہی کا زیر بار
کر سپاسِ نعمتِ منعم ادا — حق شناسی ہے اگر تیرا شعار
اس شعار خاص میں اے خاکِ ہند — کم نہیں ہے تو کسی سے زینہار
تیری خاطر عزمِ شاہنشاہ نے — طے کئے ہیں بحر و بر دو دو بار
بادشاہا! مہربانا! قیصرا! — آپ کا آنا رہے گا یادگار
کردیئے تیری نگاہِ لطف سے — دل امیروں اور غریبوں کے شکار
ہے غریبوں کی دعاؤں کا ہجوم — فوج سے بہتر بوقتِ کارزار
ہند کا نغمہ ہے اب با صدقِ دل — "قیصرِ ما زندہ باد و کامگار"
"مہرباں قیصر کے ہاتھوں میں رہے — ناقۂ اقبال و دولت کی مہار"
جشن کی تاریخ بھی سن لیجئے — بیسویں ہے یہ صدی بر روئے کار

گیارہواں سال اور مہینہ بارہواں
بارہویں تاریخ از روئے شمار

ہمیں یہ سنکر سخت رنج و صدمہ ہوا کہ ہمارے محترم منشی نوبت رائے صاحب نظر کا فرزند ارجمند گوری سہائے جسکی عمر نو برس کی تھی رحلت کرگیا، مرحوم ہونہار بچہ تھا۔ اس کی مفارقت ابدی نے حضرت نظر کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہم اس موقعہ پر خلوص سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں خدا پسماندگان کو صبر دے۔

طرابلس سے ایک صدا

بے حمیتی تو شاید مگر بے ایمانی یقیناً ہوگی اگر تمدن اس موقع پر اس کیفیت کا اظہار نہ کرے جو واقعات طرابلس وتبریز سے دل پر گذری اور گذر رہی ہے جس بے یادلی سے یورپ نے طرابلس میں اپنی بے ایمانی دغابازی اور مکاری کا ثبوت دیا ہے اسکی داد تو دنیا ستم ہے۔

ہمارے مقدس نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بدنام کرنے والے اطالیہ والوں نے جو درحقیقت یزید کے پیرو نکلے ہمکو اور نہ صرف ہمکو بلکہ تمام دنیا کو یقین دلا دیا ہے کہ باستثنار تاج برطانیہ یورپ میں آج بھی وحشی لوگ بس رہے ہیں جو آج سے ہزاروں برس پہلے آباد تھے اور جو صفحہ تاریخ پر جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ جنگ طرابلس نے اچھی طرح ثابت کردیا کہ یہ تہذیب وتمدن کے مدعی انسانی دنیا کے واسطے صرف اتنے سودمند ہیں کہ اپنی محترم خواتین کو سرراہ دوکانوں میں بٹھاکر چند عاشق مزاج لونکی تسکین کریں، ورنہ ہمدردی نبی نوع انسان جو انسانیت کا سچا زیور اور اسلام کا پہلا اصول تھا ان میں نام کو نہیں،

عیسائی سلطنتیں کلمہ توحید کی شجاعت کا تجربہ بارہا کر چکی ہیں اور واقعات باواز بلند پکار رہے ہیں کہ اس گئے گذرے وقت میں بھی مسلمان وہ اتول جوہر یگانگت سینے لگائے ہوئے ہیں جو وقت پڑے پر تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو ایک کردے گا۔ ان کی رگوں میں وہ ہاشمی خون دوڑ رہا ہے کہ جب تک ان کے بدن میں جان ہے یہ اپنی آن کو نہ جانے

نہ دیں گے۔ مگر تعجب ہے یورپ پر کہ باوجود متواتر ٹکڑیوں کے اِس کو بار و سے کٹے کی طرح رہ رہ کر ہڑک اٹھتی ہے اور کوئی نہ کوئی طاقت اپنے دل کا بخار نکالنے کو ابھرتی ہے اگر ہندوستان خوش قسمتی سے تاج برطانیہ کے سایہ عاطفت میں نہ آجاتا تو یقیناً ایشیائی مسلمانوں کا بھی اس شقی القلب یورپ کے ہاتھوں وہی حشر ہوتا جو یورپ میں ہو رہا ہے۔

اطالیہ نے یورپ میں اپنی ہی عزت پر پانی نہیں پھیرا بلکہ اپنے ساتھ بہت سی برادری کی ناک کٹوا دی اور تاریخ کو دکھا دیا کہ اسی دنیا میں جہاں ہمارے مرحوم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم جیسی صلح جو طبیعتیں پیدا ہوئی ہیں اور شہنشاہ معظم جارج پنجم جیسا ہمدرد بادشاہ موجود ہے وہاں وہ بدبخت لوگ بھی زندہ ہیں جو کسی اعتبار سے انسان کہلائے جانے کے مستحق نہیں اطالیہ طرابلس میں ننھے ننھے بچوں کے کلیجے سنگینوں سے چھید رہی ہے ان کے آہ و نالے سننے والوں کے دل ہلا دیتے ہیں مگر ٹروسی ان بچوں کی گریہ و زاری پر ہنستے ہیں، عورتیں برہنہ کیجا رہی ہیں بڈھے اور اندھے نشانہ بندوق بن رہے ہیں مگر مہذب لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں چلتی،

مدعیان تہذیب و تمدن کی قلعی تو طرابلس نے کھولدی اب ذرا ان مقدس روحوں کے حالات بھی دیکھ لو جو وحشی اور بدو کے لقب سے یاد کیئے جاتے ہیں لشکر اسلامیہ کا مشہور سپہ سالار خالد ابن ولید جسکی شجاعت پر آجتک یورپ مٹا ہوا ہے جو میدان جنگ کے قواعد ایسے ایجاد کر گیا کہ ایک دنیا نے اس سے سبق لیے ابیلا جسکی حفاظت کے لیے عیسائیوں کا ٹڈی لشکر ٹوٹ پڑا تھا فتح کر چکا ہے جنگی قلعہ پر

مسلمانوں کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور خاک ایلا کا ہر ذرہ خالد کی شجاعت
کے گیت گا رہا ہے شام کا وقت ہے آفتاب غروب ہونے کے قریب
پہونچ گیا نماز عصر سے فراغت پا کر خالد تن تنہا ایک طرف کو نکل کھڑا
ہوا۔ تھوڑی دور جا کر گرجا کا دروازہ نظر آیا اندر جا کر دیکھا کہ ایک بڈھا
راہب خاموش بیٹھا ہے خالد ابن ولید کا گرجا میں داخل ہونا تھا کہ
راہب کے شعلے بھڑک اٹھے زندگی سے بیزار تھا ہزاروں مغلظات
سنانی شروع کیں گالیاں اور کوسنے برا اور بھلا طعن اور تشنیع نفرت
اور حقارت اعتراض اور حملے کوئی چیز ایسی نہ تھی جو بڈھے نے چھوڑ دی ہو

قیاس یہ کہتا ہے کہ جس خالد کی تلوار سے خون ٹپکتا تھا اس کی
ایک پھونک سے بڈھا پچاس لڑھکنیاں کھاتا ہوا گرجا سے نیچے جا پڑتا
مگر تاریخ یہ کہتی ہے کہ سپہ سالار اعظم خالد ابن ولید رحمۃ اللہ یہ کہتا ہوا
آگے بڑھ گیا:۔

"اگر حضور اکرم صلعم کا یہ ارشاد میرے کان میں نہ پڑا ہوا ہوتا کہ
بچوں کے ساتھ شفقت اور عورتوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا۔
بڈھوں پر ہاتھ نہ اٹھانا تو تیری اس زبان درازی کا جواب خالد کی
تلوار دے دیتی"

یہ سلوک مسلمانوں کا ان لوگوں کے ساتھ تھا جو ان کی جان کے
دشمن اور خون کے پیاسے تھے اور اسوقت تھا جبکہ دشمن ان پر لعن طعن
کر رہے تھے۔ لیکن اطالیہ جو تہذیب پھیلانے کی مدعی ہے بیگناہ لوگوں کو
اس لیے ذبح کرتی ہے کہ وہ مسلمان ماں باپ کے بچے ہیں روسیاہ
جنرل کینیوا اسکو روا رکھتا ہے اور کسوقت جبوقت وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ

"مہذب ظالموں ہمکو ہمارے وطن میں رہنے دو"

یہ تو اسلام کی مقدس تعلیم کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا جو خالد نے دکھایا اب
ب خود بانی اسلام صلعم کا طرز عمل دیکھو ایک مرتبہ قبیلہ طے کے کچھ قیدی
حضور اقدس کے روبرو پیش کئے گئے انہیں ایک لڑکی بھی تھی جو قبیلہ
طے کے سردار حاتم طائی کی بیٹی تھی آپ نے اپنی چادر اسکو اڑھائی
نامحرموں کی نگاہ سے بچایا اس کے جواب میں مہذب دنیا کا سلوک
طرابلس کی عورتوں کے ساتھ یہ ہے کہ نو سو سے زیادہ عورتیں
ننگی اور برہنہ کی گئیں اور بندوقوں کی باڑ نے ان کی پردہ پوشی کی۔
اور اسکی حمایتوں کو ڈوب مرنا چاہیئے کہ مٹھی بھر خانماں برباد
اور ... نے انکا دلیہ بنادیا۔

... طرابلس بظاہر مرچکے ان کی پاک روحیں جسم سے جدا
ہوگئیں مگر نہیں ان کے نام زندہ ہیں مسلمان ان کے ناموں کو آنکھوں پر
اور ان کے کارناموں کو سر پر رکھیں گے۔

کلمہ توحید کا اقرار کرنے والے مسلما نو اگر دنیا کے عیش اجازت
اور زندگی کے کاروبار فرصت دیں تو ضرا راس مصیبت بھری اور دکھ بھری
دکھائی داستان سن لو،

بقرعید کے دن علی الصباح ایک بدنصیب ...
... پہاڑی پر کھڑی ہوئی ہے ملوبت ...
... کا موسم برف کے تودے چاروں ...
... پاس صرف ایک پھٹا ہوا پیرہن ...
... سکڑی کھڑی ہے اور اس طرح صدا دے ...

ہندوستانی مسلمانو! اس لیے او رصرف اِس لیئے کہ
میں بھی تمھارے کلمہ کی شریک ہوں اگر تمہارے لحاف
اور توشکیں اجازت دیں تو میری حالت زار دیکھ لو بھائیو!
برس کا برس دن ہے! ایک دور افتادہ بہن کی مبارکباد
قبول کرو، وہ بہن جس کی ایک چھاتی سے خون اور دوسری
سے دودھ کا دریا بہہ رہا ہے، یہ دودھ ان بچوں کی یادگار
ہے جو مہینوں اور برسوں میرے سینے پر لیٹے اور چھاتی پر
لوٹے اور جو میدان طرابلس میں میرے حکم سے کلمہ طیبہ کی
حفاظت میں میری آنکھوں کے سامنے شہید ہوگئے،،
اپنے بچوں کو کلیجے سے لگانے والی ماؤ! اور شفقت پدری کے
جوش میں اپنے بچوں کو کلیجہ سے لپٹانے والے باپو، میرے
کلیجہ کے ناسوروں پر بھی نظر ڈالو، چار بچے خون میں نہلا کر
تمھارے سامنے آئی ہوں، زخمی چھاتی اُن ہی کلیجہ کے ٹکڑوں پر
دودھ بہا رہی ہے جن کے دم سے زندگی کی بہت سی امیدیں
وابستہ تھیں اولاد والے بہن بھائیو! تمھارے بچے زندہ
اور تمھاری مامتا ٹھنڈی رہے، میرے پھول بھی تمہاری طرح
نو نو مہینے میرے پیٹ میں رہے ہیں میں نے بھی خون جگر
پلا کر بڑا کیا تھا، عمر بھر کی کمائی یہ ہی چار لال تھے جن کی لاشیں
بے کفن پڑی ہوئی ہیں، ظالموں نے مرتی دفعہ مجھے کھلائے
ہوئے چہرہ بھی دیکھنے نہ دیئے،
مسلمانو! تمھارے عیش میں خلل نہ پڑے تو ایک نظر

سرزمین طرابلس پر ڈال لو-جہاں چار چار پانچ پانچ برس کے پھلواسے لال جانوروں کی طرح ذبح ہوکر خون میں لوٹ رہے ہیں-جہاں سروں کے وارث اطالیہ کی سنگینوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے یہ تازہ قبر جس پر کہڑی ہوئی ہتیں اپنے داغ دکھا رہی ہوں اُس مظلوم کی ہڈیاں ہیں جس نے عمر بہر کے واسطے پیمان وفا باندھا تھا، جو چند مہینوں کا بیمار اور کئی امراض میں گرفتار تہا، ہندوستانی بھائیو! جو مریض کراہنے کے قابل بہی نہ تہا میری آنکھوں کے سامنے رسی سے باندھ کر مقتل پر پہنچا دیا گیا، ظالم ہمارے سر پر کہڑے تہے اور حسرت بہری نظریں ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہی تہیں، دل مجروح اس بیمار کے پیچھے پیچھے لے گیا جو وطن کی خاک میں گہٹا ہوا جا رہا تہا، بہنو! جو سماں میں دیکھ چکی ہوں خدا نہ کرے کہ تم دیکھو، میرے تاج وتخت کا وارث، میری عصمت وآبرو کا نگہبان، میرے دل اور میری جان کا مالک، آسمان کیطرف دیکھ کر مجہے خدا کی سپرد کر رہا تہا، جو ہاتہ اس کی خدمت کا وعدہ کر چکے تہے دم آخر اسکو پانی بھی نہ پلا سکے، ہائے کس طرح ادا کروں دل کے ارمان دل میں رہے اور کلیجہ داغوں سے چھلنی ہو گیا، بیمار نظریں میری صورت پر تہیں کہ ایک سنگین نے ہمیشہ کے لیے بند کر دیں دل پر ہاتہ رکہہ کر دیکھنا کامل سات گہنٹے درخت کی آڑ سے اس لاش کی حفاظت کی ہے

اور جب میدان دشمنوں سے صاف ہو گیا ہے تو اٹھا کر لائی اور سر کی چادر میں جو اس مرحوم کی کمائی تھی لپیٹ کر اس گڑھے میں دبا دیا، میں اس سردی میں اکڑتی ہوئی اپنی زندگی پر فخر کر رہی ہوں کہ میری چادر میرے بدلے اس زمین کے نیچے اپنے وارث کی خدمت کر رہی ہے، بہنو! میرا دل دیکھو، اپنے سچے مذہب کی حمایت میں چار لال قربان کر چکی، لٹ گئی تاراج و برباد ہو گئی مگر مجھ خانماں برباد کو موت نہیں آئی کہ اپنے پیاروں سے جا ملوں، معصوموں کو چمٹاؤں گلے لگاؤں بلائیں لوں اور ان نازک رخساروں پر نثار ہو جاؤں جن سے پھول جھڑتے تھے،

ہوا کے جھکڑو! مجھے نہ کپکپاؤ، میرا یہ پیغام سمندر پار میرے ہندوستانی بہن بھائیوں تک پہنچا دو میری تصویر انکو دکھا دو میرا پتہ انکو بتا دو اور میری یہ بپتا انہیں سنا دو کہ جو کلیجہ کے ٹکڑے کل تک اپنے نازک ہاتھ گلے میں ڈالے سینہ سے چمٹے ہوئے تھے آج کہیں نظر نہیں آتے بہنو میرے بچوں کو ڈھونڈھ دو، بھائیو میرے لال مجھ سے ملا دو، وہ اٹھتی کونپلیں لوٹ گئیں، کھلتے ہوئے پھول مرجھا گئے، اے سنگدل اطالیہ چاروں چھٹوا دیئے، اے، ای، اے موت مجھکو بھی لے، ظالمو! مجھکو بھی، اسی سنگین سے جو میرے پیاروں کے خون میں بھیگی ہوئی ہے میرا کام تمام کر دو اور مجھے اس خون کے بوسے لینے دو جو میرے

معصوم کے جسم سے نکلا، میری آنکھیں اُن شکلوں کو ڈھونڈھ رہی ہیں جو کل تک میرے پاس تہیں، میرے ساتہ تھیں، بچو! اے پیارے بچو! ماقران، تم میرے دکہ درد کے شریک میری بیماری کے رفیق تھے آؤ میرا ہاتہ پکڑو، مجھے سہارا دو، کلیجے سے لگ جاؤ کہ یہ دودہ بند ہو اور یہ خون تھم جائے۔

سننے والو! مصیبت بہری داستان ناگوار ہو تو معاف کردینا اس بدنصیب کہاں اور تم کہاں، تمہارے بچے تمکو مبارک اور تمہاری دنیا تمکو نصیب، تہوڑی دیر کا ساتہ ہے، سمجھو تو تمہاری کمائی میں حقدار، اور مانو، تو تمہاری بہن، تمہارے کلمہ کی شریک اور اس رسول کی امت ہوں جو خاک عرب سے پیدا ہوا، اُمّی لقب ہاشمی نسب اکیا رسول؟ کونسا پیغمبر؟ مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

کیا تمہاری آنکھیں مجہہ سے زیادہ بدنصیب عورت دیکھیں گی اور کیا تمہارے کان مجہہ سے زیادہ درد بہری داستان سنیں گے، تمہارے پاس شال دوشالے ہیں اور میرے پاس جانور کی کہال بہی نہیں۔ دیکھو میرے برہنہ جسم کو دیکھو اور اس قیامت خیز سردی کا خیال کرو، اولاد والو، بیٹا بیٹی والو، خدارا میرے داغوں پر نظر کرو، اور سوچو میری رات کیونکر اور میرا دن کس طرح بسر ہوتا ہوگا طرابلس تمہارے خلیفہ کا مفتوحہ شہر ہے اور میں طرابلس کی بیٹی نہیں بہونہیں

گھر لٹنے کی لاج رکھو اور آج جبکہ میرے سر سے میرا وارث اٹھ گیا میرا گھر لٹ گیا میرے بچے چھٹ گئے، میرا ہاتھ پکڑو اور میرا ساتھ دو، ان ہاتھوں کو غور سے دیکھو کیسے ہیں اور کس کے ہاتھ ہیں وہ ہاتھ ہیں جو گیارہ، دس، آٹھ، اور پانچ برس کے چاند کے ٹکڑوں کو کبھی گود میں سلا کر تمہارے آگے پھیلے ہیں اور یہ اس رانڈ دکھیاری کے ہاتھ ہیں جو صرف گیارہ برس سہاگن رہ کر رانڈ ہو چکی۔ رانڈیں تمہارے ہاں بھی ہونگی بچوں کو تم پالنے والیاں تم میں بھی ہوں گی مگر میں نے اپنے لال اپنا رفیق و شفیق شوہر اپنے مذہب پر فدا کیا ہے میں نے اپنے دین برحق کو ظالموں سے بچانے کے لیے پانچ قربانیاں چڑھائی ہیں۔ جانتی ہو؟ کیسی قربانیاں؟ وہ چار جن کو دیکھ کر جان میں جان آتی تھی جو برسوں سینہ پر لوٹتے رہے، جو ہمک ہمک کر کلیجے سے چمٹتے تھے، جن کو دم بھر تنہا نہ چھوڑتی تھی اور جو آج اس جنگل بیابان میں اکیلے سو رہے ہیں، وہ ایک جس پر زندگی کا تمام دارومدار تھا جس نے عزیز و اقارب سے تڑا کر اپنے پلے باندھا تھا جو لمحہ بھر بھی آنکھ سے اوجھل نہ کرتا تھا، اس ڈھیر میں منہ لپیٹے پڑا ہے،

مسلمان بہن بھائیو! میری ہنسی نہ اڑاؤ، یہ میری حالت کا یہ ایک رخ تھا، اسی دل میں جو ماتا سے تڑپ رہا ہے. وہ خون بھی جوش کھا رہا ہے جو چار کیا ہزار بچے ہوتے

تو وطن پر قربان اور مذہب پر نثار کر دیتا، میری محنت ٹھکانے لگی میرے ارمان پورے ہوئے، میں خوش نصیب ہوں کہ میری کمائی میرے پاک مذہب اور میرے وطن کے کام آئی قریب آگیا ہے وہ وقت کہ میں بھی ان ہی بچوں کے پہلو اور اس سرتاج کے پائنتی جا سوؤں مگر میری موت وہ موت ہوگی کہ تمہاری ہزار زندگیاں اس پر قربان، مسلمان میرے نام پر جان دینگے اور میرے کام پر فخر کریں گے آنیوالی نسلیں اور پیدا ہونے والے لوگ میری سالگرہ منائیں گے اور تاریخ اسلام، میری اس قربانی کو سونے کے حرفوں سے لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرے گی، میں تمھارے ہاں کی بہو ہوں عار نہ اٹھاؤں گی مگر تمھاری بہت سی بچیاں دو دو دانوں کو محتاج ہیں، کواریاں یتیم اور بیاہیاں رانڈیں ہوگئیں، حمیت اسلام اور خوف خدا دل میں ہے تو سوچو کہ یہ جاڑے کی پہاڑسی راتیں ان کی کیونکر کٹتی ہوں گی، جن کے سر پر بابت کا بھی نہیں ہے، اپنی کمائی میں سے کچھ ان کو بھی دو پہلو گے پھلوگے اور ان بدنصیبوں کی دعا جب یہ پیٹ بھر کر اور تن ڈھانک کر سچے دل سے دیں گی تو یقین کرو کہ ہمارا اور تمہارا وہ خدا جو وحدہٗ لاشریک ہے انکی التجائیں قبول کریگا۔

ایڈیٹر

شہدائے اطرابلس کا چندہ۔ دفتر اخبار وکیل امرتسر، وطن لاہور، زمیندار۔ لاہور، کی معرفت روانہ ہوسکتا ہے۔ (منیجر)

روس و ایران

قوت جو گھٹ گئی ہے معدود ہو گئی ہیں — تاب مقاومت سے مجبور ہو گئے ہیں
چاروں طرف سے مسلم محصور ہو گئے ہیں — سب زخم رفتہ رفتہ ناسور ہو گئے ہیں

رہ رہ کے دے رہا ہے ایراں کو روس چرکے
پُرزے اُڑا رہا ہے برطانوی اثر کے

مقتل طرابلس کا پیش نظر ہے اب تک — دل غرق خوں ہے اب تک ٹکڑے جگر ہے اب تک
دل ہے شرارہ افشاں اور چشم تر ہے اب تک — اور چشم تر اگلتی لعل و گہر ہے اب تک

اٹلی کے وہ مظالم بھولے نہ تھے ابھی ہم
اس گردش فلک نے اک اور دے دیا غم

ایران جس کی دولت دنیا میں تھی گہر ریز — توسن سپہر کا جس کے آگے ہوا نہ مہمیز
کرتا ہے اس پہ حملے اب روس فتنہ انگیز — کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز

باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را
ہم بیکسوں پہ اس کو کر مہرباں خدا را

اے سرزمین ایران اے یادگار دنیا — تاج و نگیں سے تیرے تھا اعتبار دنیا
باقی ہے تیرے دم سے نقش و نگار دنیا — ہے کوہ طور تیرا شمع مزار دنیا

ہیں نقش لوح دل پر سارے ترے فسانے
آنکھوں میں پھر رہے ہیں اب تک ترے خزانے

ایران جس کے آگے دنیا کی خم تھی گردن — پیدا کیے تھے جس نے جمشید اور تہمتن
جو فلسفہ کا گھر تھا اور شاعری کا گلشن — جس کے قصیدہ خواں ہیں اب تک برن و کرزن

افسوس کہ زمانہ اب اس سے پھر گیا ہے
وحشت کی ہو چڑھائی نرغہ میں گھر گیا ہے

عزیز لکھنوی

صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر
منزل ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفل قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغام حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرام حیات
مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر گرم تقاضا تو بھی ہو
دورۂ عالم میں رہ پیما ہو مثل آفتاب
دامن گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز
پھر سکھا تاریکئی باطل کو آداب گریز
تو سراپا نور ہے زیبا ہے عریانی تجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے
ہاں نمایاں ہو کے برق دیدۂ خفاش ہو
اے دل کون و مکاں کے راز مضمر فاش ہو

"اقبال"

دعا

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

آتش نفسی جس کی کانٹوں کو جلا دیوے
اس بادیہ پیما کو وہ آبلہ پا دے

پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلیٰ دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر
خودداریِ ساحل دے آزادیِ دریا دے

بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورتِ مینا دے

احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

"اقبال"

ہم اپنے کرم فرما اور تمدن کے محسن میر مہدی علی صاحب شہید کے اس صدمہ کو نہایت رنج و افسوس کے ساتھ درج کرتے ہیں کہ ان کے عزیز دوست میر صلابت علی صاحب سعید مرحوم نے ۱۲، ذی الحجہ کو اس دنیا ناپائدار سے رحلت فرمائی خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

سید صاحب اپنے مرحوم دوست کی یادگار میں پانچ پرچے قسم دوم کے ان طلبہ کے نام جاری کرانا چاہتے ہیں جو چندہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس قسم کی درخواستیں ہمارے پاس بہت سی آچکی ہیں۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۱۲ء سے ہم پانچ پرچے جاری کرتے ہیں۔ سید صاحب کا مضمون آئندہ پرچہ میں درج ہوگا +

بہ تقریب تاج پوشی قیصر ہند۔ ہر دو حصہ بجائے (عہ) کے ایک روپیہ کو ملیں گے

وصل حبیب

ناول ہیں عجب اداؤں کی ہے تصویر رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی حکیم احمد صاحب ارشد تھانوی از بھوپال۔ امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیرجی شبیر علی صاحب از بجنور۔ الحمد للہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول حسب مراد زیور طبع سے آراستہ ہوکر نور افزائے چشم شائقین ہوا دوسرے کی ضرورت نہیں۔ کہ آپ میں قابلیت خداداد ہے حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے اوس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر فدا حسین صاحب سوداگر از ملتان۔ آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) قاضی عبدالشکور صاحب از ڈبائی ضلع بلند شہر۔ وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی حقیقت آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

(۵) مولوی فصیح الدین صاحب از سنبھل مراد آباد۔ وصل حبیب دیکھا۔ ماشاء اللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کر کے دماغ سے خوب کام لیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو سرکشن داش صاحب سندرہ۔ از دہلی۔ آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا۔ بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو خیس کمہال صاحب کندن از حیدر آباد دکن۔ آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر حصہ کو واقعی نہایت عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شہاب صاحب مترجم مشرکو کوبیا از آرہ۔ کتاب (وصل حبیب) کو نیکہ امید سے زیادہ لطف اوٹھایا عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے چھوٹے چھوٹے مگر چست و پر معنے جملے مصنف کو پوری قابلیت کی شہادت دے رہے ہیں عبارت کا زور اشعار کی ترتیب۔ جملوں کی ترکیب الفاظ کی بندش صاف بتلا رہی ہے کہ مصنف کو مشرقی علوم پر کمال عبور ہے مذکورہ بالا صفات نے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ہر ناول کو ایکبار دیکھکر انسان آسودہ ہوجاتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار میں کیا دس بار میں بھی سیری نہیں ہوسکتی۔ یہ تو مونس تنہائی بن جاتا ہے۔ انتہے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد مئی ۱۹۱۱ء ناظرین واقف ہیں کہ ہم مخرب اخلاق ناولوں کے کس درجہ مخالف ہیں وصل حبیب کو ہم نے نکتہ چین نگاہوں سے بغور دیکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ موجودہ لغو فسانوں کی طرح یہ بھی ہوگا۔ مگر کس قدر خوشی ہوئی کہ مصنف نے بالکل ہمارے خیال کا چربہ اپنی تصنیف میں اُتار دیا ہے زبان کی سلاست کے متعلق یہی قابل قدر اضافہ کیا ہے غرض ناول ہذا جو بہت اچھا اور قابل قدر ہے اور ایسے ہی کتابوں کی اشاعت کے ہم مؤید ہیں

(۱۰) جناب سید احمد صاحب شیر مست۔ مالک ریاست کشمیر از سری نگر۔ وصل حبیب نے ہم کو مشتاق صفحہ کا عاشق بنایا کہ اوس کو بھی بھیجدیجے

مہتمم کتب خانہ حبیبیہ ڈاکخانہ گوہر گنج ریاست بھوپال

[illegible]

جلد ۲ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء نمبر ۱

تمدّن

معاشرتی۔ تمدنی ادبی۔ فلسفی اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر۔ شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

-: فہرست مضامین :-

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

قیمت سالانہ قسم اول (ے) قسم دوم (ہے) تمدن پریس دہلی ۱۳۳۱ میں چھپکر شائع ہوا قیمت فی پرچہ (۱۰) کتب احترابو ظفر جامد میرزا دہلو

عصمت

(دہلی)

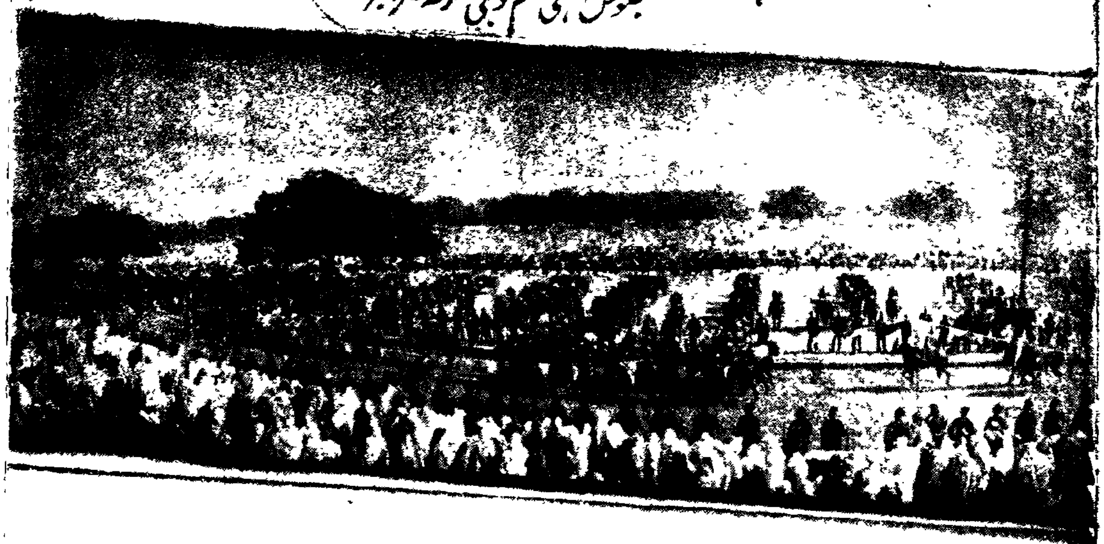
جہاں یہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی صلاح و بہبودی ملحوظ ہے کنواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق بہن عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت ان کو بتلائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں ان کو پیش آئیں گی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پر لطف با اطمینان بسر کرانے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عصمت ہے عصمت ان کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے عمل و بے فکر خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کئے ہیں ان کی ذمہ داریاں ان پر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور پھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے۔ عصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا +

ٹائٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا۔ خدمت میں کہانیاں سنانے والا۔ مذہب کی وقعت بتانے والا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر بے بہا ہے ہر ماہ ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں قیمت سالانہ (۳ روپے)

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)

جلوس شاہی بمقام دہلی مورخہ ۷ دسمبر سنہ ۱۱ء



تمدن

علم ادب کی بے ثباتی

طبع انسانی کی یہ بھی ایک عجیب حالت ہے کہ بعض اوقات ذہن میں خیالات کا کچھ ایسا تار بندھ جاتا ہے کہ اسکو حالت خواب کا مزا آجاتا ہے اور وہ قدرتی طور پر شور و شغب سے بچکر کسی سنسان اور تاریک مقام کی تلاش کرتی ہے۔ جہاں کہ وہ اپنی کیفیت استغراق کا لطف اٹھا سکے اور خاموشی کے ساتھہ ہوا پر محل تیار کرے۔ ایک دن مجھ پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور میں طرح طرح کے خیالات میں قبرستان ویسٹ منسٹر میں ادھر اُدھر سیر کرتا پھر رہا تھا کہ دفعتہً بچوں کے شور نے جو وہیں کہیں فٹ بال کھیلتے ہوئے آنکلے تھے۔ میری محویت اور اوس جگہ کی خاموشی میں خلل ڈالدیا اور اُن کے قہقہے قبروں سے ٹکرانے لگے۔ میں اس شور سے پریشان ہو کر قبرستان کے اندرونی حصوں میں گھس گیا اور لائبریری کے قریب جا پہونچا۔ یہاں آکر میں نے لائبریرین سے لائبریری کے اندر جانے کی

اجازت چاہی تو اُس نے جواب میں اپنی جیب سے کنجیاں نکالیں اور لائبریری کا دروازہ کسیقدر دقّت سے کہولا معلوم ہوتا تہا کہ وہ بہت ہی کم کام میں آتی تھی۔

لائبریرین مجہ کو لیکر اندر گہسا میں نے دیکھا کہ میں ایک بلند ہال میں کہڑا ہوا ہوں جس کی چہت بڑی موٹے موٹے شہتیر و ںپر پہیلی ہوئی ہے۔ چہت سے چند فٹ نیچے اور فرش سے بہت بلندی پر متعدد روشندان بنے تہے اور آتشدان کی دیوار پر کسی پادری کی ایک پُرانی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی گیلری میں اور ہال کے اندر چاروں طرف نفیس نفیس الماریوں میں کتابیں چنی ہوئی تہیں جو بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کے جسم پر سہارا لیے ہوے تھیں۔ کتابوں کا اکثر حصّہ پُرانے زمانہ کا تھا اور جن کی حالت سے یہ ظاہر ہوتا تہا کہ اُن کے ہاتہوں نے تو اتنا نہیں زمانہ کے ہاتھوں نے اُن کے رنگ و روغن کو بالکل اڑا دیا ہے۔ کمرے کے مرکز میں ایک خاموش میز تھی جس پر دو تین کتابیں۔ ایک بن سیاہی کی دوات اور ایک قلم جسکی نب استعمال میں نہ آنے سے زنگ آلود ہوگئی تہی۔ رکھی ہوئی تھیں یہہ کمرہ خاموشی کے ساتہہ مطالعہ اور گہرے غور و فکر کے لیے نہایت موزوں تھا چونکہ اُس کی قہقہہ دیواروں نے دنیا کی آواز چہل پہل کو باہر کے باہر روک رکھا تھا۔

الماریوں سے ایک چھوٹی مگر موٹی کتاب جس پر چمڑے کی جلد تہی اور کی پیتل کی پتروں سے جڑی ہوئی تہی۔ میں نے نکالی اور میز کے قریب ایک شاندار کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر گرد و پیش کی خموشی نے دل میں کچہ ایسی کیفیت پیدا کی کہ میں بجائے پڑہنے کے کچہ سوچنے لگا جسوقت میں نے چاروں طرف نگاہ اوٹھا کر اوس پرانی کتابوں کو دیکھا جنکو بظاہر کسی نے مدت سے ہاتہ نہ لگایا تہا۔

تو میرے دل میں خیال گذرا کہ کتب خانہ بھی ایک قسم کا علمی گورستان ہے جہاں مصنفین اپنی اپنی کتابوں کی شکل میں۔ اُن مردوں کی مانند جن کی نعشیں مصالح لگا کر مدت دراز تک گلنے اور سڑنے سے محفوظ رکھی جاتی ہیں الماریوں میں مدفون ہیں۔

میں نے خیال کیا کہ ان میں سے ایک ایک کتاب پر کس درجہ دماغ سوزی کی گئی ہوگی۔ کتنے دل اُکتا دینے والے دن۔ کتنی آنکھوں میں کٹنے والی راتیں صرف ہوئی ہونگی اور کیسے اُس کے مصنف نے۔ دنیا اور اہل دنیا کے مبارک اور خوشنما چہروں سے اپنی آنکھیں بند کر کے سنسان اور تاریک تہ خانوں میں بیٹھ کر محنت جانفشانی و جانکاہی اور غور عمیق سے اسکو تصنیف کیا ہوگا۔ مگر یہ جانفشانی اور دماغ سوزی کس لئے تھی؟ کیا کسی خاک آلودہ الماریوں کی صرف ایک انچ جگہ کے لیے؟ کیا اس لیے کہ زمانۂ مستقبل میں اُس جگہ میرا جیسا کوئی بھٹک کر آ نکلنے والا نیم خفتہ و نیم بیدار شخص۔ اُس کے سرورق کو ٹھکرا دہر اُدہر دیکھنے لگے؟ کیا اس لیے کہ چند صدیوں کے بعد اُس کا نام و نشان تک صفحہ ہستی پر نہ رہے؟ تصنیف و تالیف جسکو مخلوق بقائے نام کا ذریعہ کہتی ہے اور جس پر بڑا فخر کرتی ہے کیا اُس کا یہی انجام ہے؟ بقائے نام کی اُمید ایک خوفناک دھوکا ہے! ایک مہمل آواز ہے جو کسی گھنٹے کی آواز کی طرح تھوڑی دیر تک اپنے جسم سے آپ ٹکراتی ہے۔ کچھ دقیقے تک سننے والے کے کان میں گونجتی ہے اور پھر خلائے نسیان میں ڈوب کر خود اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتی ہے۔

میں بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا اور چپکے چپکے الفاظ شکایت میرے ہونٹوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ تڑپ رہے تھے۔ میرے ایک ہاتھ نے

میرے سر کو سہارا دیے رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ کتاب سے کھیلنے میں مصروف تھا کہ میں نے اُس کتاب کو کھولا تو اُس نے اس طرح دو تین ہلکی ہلکی چھینکیں ماریں جیسے کوئی شخص گہری نیند کے بعد مع خراش آوازیں نکالتا ہوا اُٹھتا ہے اور پھر وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ اوّل اوّل تو اُسکی آواز بڑی موٹی اور جھنجھنی تھی چونکہ اوسکے کناروں پر کسی محنتی مکڑی نے جابجا جالے تن رکھے تھے اور اُس کے صفحے کمرے کی نمی اور سردی سے کہیں سے چپکے ہوئے اور کہیں سے اُبھرے ہوئے تھے مگر کچھ دیر کے بعد اُسکی آواز صاف اور اُس کا لہجہ سمع فریب ہو گیا لیکن اُس کی زبان عجیب اور متروک تھی۔ ادائے الفاظ میں لب ولہجہ ہمارے زمانہ کے لیے گنوار و تھا۔ بہرکیف جہاں تک ممکن ہو گا میں اُس گفتگو میں اپنا تصرف کر کے اپنے ناظرین کو اُس کی زبان سمجھنے کی تکلیف سے سبکدوش کرونگا اُس نے اپنی گفتگو شکایت سے شروع کی اور جھنجھلا کر بولی کہ دنیا سخت غفلت شعار ہے اور اُس کے نزدیک قابل قدر شے کی کوئی قدر نہیں آج دو صدیاں گذریں کہ مجھ کو کسی نے چھوا تک نہیں جب کبھی لارڈ پادری ادہر آ نکلتا ہے تو اپنے فرض کو پورا کرنے کے بطور کھڑے کھڑے ایک نظر ہم کو بھی دیکھ جاتا ہے۔ آخر اس کے معنے کیا ہیں کہ ہم چند ہزار کتابوں کو یہاں بند کر کے رکھ چھوڑا ہے اور ہماری نگرانی کے لیے چند لائبریرین مقرر کر دیے ہیں جو باری باری سے صرف اس بات کی نگاہ رکھتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی غائب تو نہیں ہو گئی۔ کتابوں کا کام یہ تہا کہ لوگ آ کر اونہیں پڑھتے۔ اون سے حظ حاصل کرتے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ایک قانون پاس کرتی کہ متعدد لوگ ہمارے مطالعہ کے لیے مقرر کیے جائیں۔ اگر پھر بھی ہماری شکایت رفع نہ ہوتی تو میں حکم دیتی کہ ایک خاص

مدت میں ایک بار ویسٹ منسٹر اسکول کے طلبا، کو صرف اس لئے چھٹی دیجاے کہ وہ ہم میں آگھسیں تاکہ کم از کم ہم کو تازی ہوا تو میسر ہو جایا کرے۔ ہماری حالت تو عثمانی حرم کی پردہ نشین بیگموں اور ہندوستان کی خانہ نشین بی بیوں سے بھی گئی گذری ہے" میں نے کہا "میری عالی دماغ دوست۔ اس قدر طیش میں نہ آؤ۔ تم اپنی ہمعصر کتابوں سے جو دنیا کے ہاتھوں میں گئیں اور جن کی زندگی تم سے مختلف رہی۔ کہیں زیادہ خوش نصیب ہو۔ اس قدیم ہال میں آجانے سے تمھاری وہی وقعت اور وہی قیمت ہوگئی جو ان برابر کی قبر والوں کی ہے۔ جن میں اولوالعزم تاجدار جنگجو شہسوار پڑے ہیں۔ جن میں متمول صاحب وقار اور خود تمھارے مصنفان نامدار لیٹے ہوے ہیں اور جن کی خاک جواہرات کا دفینہ سمجھی جاتی ہے بر خلاف اس کے تمھاری ساتھی وہ کتابیں جو اس جگہ کے شرف سے محروم رہیں۔ خاک وغبار بنکر مدت ہوئی کہ عدم کے پہلو میں سو چلی ہیں ہوا سے اس کتاب کی نمی خشک ہونے لگی اور میرے ہاتھوں کی گرمی سے اس کے صفحہ کے گڑھے ابھار دب اور ادبہر کر ذرا سیدھے ہوے اور اب وہ قد و قامت میں کسی قدر پھیل گئی اور یوں گویا ہوئی۔ "ہم اس لیے تصنیف ہوئی تھے کہ دست بدست پھریں۔ سابق علم کی آنکھ کو اپنے خیالات میں متوجہ کرکے۔ دنیا کے مکروہ مناظر سے بچائیں اس کے دل و دماغ کو عقل و شعور کے نور سے روشن کریں اور نہ اس لیے کہ بنیل کی میخیں ہم کو جکڑلیں۔ الماری کی تاریکی ہم پر اپنی دھندلی چادر پھیلادے اور بلبہ خور کیڑوں کا پیٹ ہمارا قبرستان بنے تم دیکھو اور ذرا انصاف کرو کہ ہماری حالت کیا ہو گئی ہے۔ بے رحم کیڑے

ہماری جلد میں ایک طرف سے منہ ڈالکر۔ ہمارے سینے کو چھیدتے ہوئے
دوسری طرف نکل گئے ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ تم اتفاق سے آ گئے
اور کامل ہلاکت سے پہلے مجھ کو دو دو باتیں کرنے کا تم سے موقع ملگیا"
میں نے جواب دیا" میری قابلہ۔ دست بدست پہرنے کی حسرت جو تم نے
بیان کی اگر اُس کے پورا ہونے کی صورت معرض وجود میں آتی تھی غالباً
اب تک تمھارا وجود تو درکنار نام و نشان بھی باقی نہ رہتا۔ تمھاری صورت
سے تمھاری عمر کا پتہ لگتا ہے اور جیسا کہ تم نے ابتدا میں کہا۔ تمھاری
عمر واقعی دُو سو سال کی جچتی ہے۔ میری دانست میں زیست کا اتنا زمانہ
ایک معقول زمانہ ہے۔ لیکن یہ دُو سو سال کی عمر تم نے صرف اس قدیم
کتب خانہ کی اور دست انسان سے محفوظ رہنے کی بدولت پائی
ہے ورنہ تم کو معلوم ہے کہ تمھارے وقت کی کتابوں کا کیا حشر ہوا۔
گرڈمیسٹ (Grosteste) نے اپنے نام کو صفحۂ عالم پر قائم رکھنے
کے لیے اسقدر سخت محنت کی۔ اسقدر خون پسینہ ایک کیا کہ کوئی دوسرا
مصنف اِس اعتبار سے بمشکل اوسکا مقابلہ کرسکتا ہے۔ سنتا ہے کہ اس نے
دُو سو کتابیں تصنیف کیں۔ گویا کتابوں کا ایک مینار چُن دیا۔ مگر
افسوس امتداد زمانہ نے اُس مینار کو ڈھا دیا اور اُس کا ایک ایک پتھر
پِسکر خاک کا ڈھیر بن گیا۔ وہ چار کتابیں جو کسی پُرانے کتب خانہ میں
پائی بھی جاتی ہیں اُن کو بھی آثار قدیمہ کا دلدادہ گاہ گاہ آکرستا جاتا
ہے۔ تم نے کم برین سس (Combrensis) کا جو فلسفہ
الٰہیات اور فن تاریخ وغیرہ میں بڑا بلند پایہ کتابہا نام سنا ہے اس شخص
نے دو بار ایک جلیل القدر عہدہ سے انکار کردیا۔ اور زندگی کی تمام

دلفریبیوں کو حقیر سمجھا محض اس لیے کہ وہ اپنے آپکو کسی خاموش مقام پر بند کر کے آنے والی نسلوں کی مسرت اور دلچسپی کے واسطے کچھ سامان مہیا کر جاوے۔ مگر آنے والی نسلوں نے اُس کا نام تک نہ پوچھا اور اسکی تن دہی کی کچھ بھی داد نہ دی ہنری (Henry Hal) جس نے ایک فاضلانہ تاریخ انگلستان کے علاوہ دنیا کے ہیچ اور کمتر از ہیچ ہونے پر ایک رسالہ لکھا۔ دنیا نے اُس سے پورا پورا انتقام لیا اور سہواً بھی کوئی اُسکو اور اُس کی تصانیف کو یاد نہیں کرتا۔ اسی طرح جوزف ولیس۔ ولیم۔ سائی من ....

"معاف کیجیے" میرے کلام کو کاٹ کر کتاب نے کہا "تم میری عمر کیا سمجھتے ہو۔ تم اُن مصنفوں کے ذکر میں چلے گئے جنکا زمانہ میرے زمانہ سے بہت قبل گذرا ہے اور جن کی تصانیف یا تو لاطینی یا فرانسیسی زبان میں تھی اور غیر زبان غیر ملک میں جس بخت کی مستحق ہے وہی سلوک اِن کتابوں کے ساتھ کیا گیا وہ مستحق تہیں کہ انگلستان اُن پر گمنامی کا پردہ ڈالدے وہ مستحق تہیں کہ تباہ و برباد ہو جاویں مگر جناب میں۔ میں تو ایک مشہور آفاق مطبع میں چھپی اور اس ملک کی مادری زبان میں لکھی گئی اور ٹھیک اُسوقت جب کہ انگریزی زبان زمانہ شیر خواری سے نکل کر لڑکپن اور لڑکپن سے شباب اور شباب سے کاروبار دنیا کے لیے اچھی طرح قابل ہو گئی تہی اور میری زبان نہایت شستہ و پاکیزہ سمجھی جاتی تہی"

(یہہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب نے اِس موقعہ پر ایسے کہنہ اور متروکہ محاورات استعمال کیے جنکو صورت بالا میں لانے میں مجھہ کو کمال دشواری کا سامنا کرنا پڑا)

میں نے کہا۔" اچھا تو تم اپنی ہی زمانے کی تصنیفات کو لو اُن کے وجود کا خاتمہ بھی کنار گمنامی میں ہو چکا ہے۔ زبان کی شستگی اس کی وسعت اسکا پورے طور پر رواج پا جانا جن کی بنا پر تم بقائے دوام کا دعویٰ کرتی ہو مصنفوں یا مؤلفوں کے طبع زاد مگر کمزور تصور ہیں۔ ہر زمانے کے مصنفین یہی خیال کرتے چلے آئے ہیں کہ جس زمانہ میں ہم تصنیف و تالیف کر رہے ہیں اوس میں حسن و روانی آچکی ہے۔ اُس میں ہر قطع کے جذبات ہر طرح کی کیفیات کو ہر علم کے مطالب و مصطلحات کو بآسانی ادا کرنے کی قوت پیدا ہو چکی ہے۔ اُس میں استحکام اور کامل رواج کی شان قایم ہو گئی ہے۔ اس لیے اس زبان کا مردہ یا ہماری تصنیف و تالیف کا ضائع ہونا ایک ایسا امر ہے جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ حالانکہ کوئی وجہ نہیں کہ زبان میں تجدید و توسیع (تمام زبانوں میں الفاظ کے معنی گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں) کے ذریعہ سے الفاظ۔ محاورات اور طرز بیان میں تبدیلی واقع نہو اور زبان نیچر کے قانون تغیر کے۔ جس کے تسلط میں عالم موجودات کی ہر ایک شے ہے۔ تحت میں نہ آئے میری دانست میں ہر لائق و ہر دل عزیز مصنف کو جسے اپنے علمی کارنامہ پر بڑا ناز ہے اور جو اپنی روشن دماغی کو دائمی شہرت کا سبب سمجھتا ہے ضرور اس قانون کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اُسکو لازم ہے کہ وہ امتداد زمانہ سے زبان کی رفتہ رفتہ تبدیلی اور مذاق طبائع کے تغیر و تبدل کو مدنظر رکھے۔ اُسکو نظر اُٹھا کر اپنے ملک کے قدیم مصنفوں کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے زمانہ میں بڑے عالم اور بڑے فاضل سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ اُن کے لیے ادب کی پلکیں بچھاتے اور تحسین کے ہونٹ

ہلانے میں سرگرم تھے مگر جب اونکا زمانہ گذر گیا دوسرا دور آیا۔ نئی ہی طبیعتیں اور نئے نئے مذاق پیدا ہوئے تو خود ان کی تصانیف نے اپنی کہنگی اور فرسودگی کے سبب انکو شہرت و فضیلت کی سند سے اوتار کر ان کی جگہ نئے مصنفوں کو سند آسا کیا۔ وہ خود پردہ گمنامی کے سپرد ہوئیں اور اس کے بعد کیڑوں کی غذا جنکر جس مادہ سے ان کا گوشت و پوست تیار ہوا تھا اس ہی میں جا ملیں مصنف کو یقین رکھنا چاہیئے کہ اسکی اپنی زبان کو بھی جو اپنے وقت میں نعرہ آفریں بلند کروا رہی ہے جو شستگی کا نمونہ سمجھی جا رہی ہے ایک زمانہ میں پرانی پڑتی اور ترک ہوتی جائے گی اور آخر کار خود اپنے ہی وطن میں ایسی اجنبی اور غیر مانوس ہو جائے گی جیسے کہ مصر میں احرام مصری یا جیسے ملک تاتار میں قدیم کتبے جو اب تک جا بجا پائے جاتے ہیں میں اس وقت جوش سے کسی قدر گرمایا گیا تھا۔ میں نے کہا جب کبھی میرا گذر کسی جید لائبریری میں ہوتا ہے اور وہاں میں چمکدار کن رد اور نہایت آب و تاب کی مجلد کتابیں دیکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر وہاں بیٹھکر آنسو بہاؤں اور مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو زرکسیں شاہ ایران کے دل میں پیدا ہوئی تھی جبکہ وہ اپنی ٹڈی دل فوج کا زرق برق صدیوں اور چمکتے ہوئے ہتھیاروں میں سجی کھڑی تھی۔ معائنہ کر رہا تھا اور اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ ایک صدی کے اندر اندر ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گا "

مگر میں زبان کے تغیر کو عموماً تمام عالم کے واسطے اور خصوصاً اہل تصانیف کے لیے خدا کی ایک ایسی رحمت سمجھتا ہوں جو کمال دانائی پر مبنی ہے اس کا ثبوت میرے پاس موجود ہے جسکو میں ایک مثال کے پیرایہ میں

بیان کروں گا۔ ہم روز مرہ دیکھتے ہیں کہ انواع و اقسام کے اشجار زمین
سے نکلتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں اور کچھ مدت تک میدان اور کھیتوں کو
اپنے برگ و بار سے پُرفضا بنا کر مرجھا جاتے ہیں اور آخرش مٹی میں مل کر
مٹی ہو جاتے ہیں تاکہ ان کے بعد کے آنے والے درختوں کے لئے جگہ
خالی ہو جائے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی اور کوئی بھی درخت قدرتاً نیست و نابود
نہ ہوا کرتا تو زمین کی سرسبزی و زرخیزی بجائے رحمت کے ایک زحمت
ہو جاتی۔ کثرت اشجار و تشابک آثار کے بوجھ سے زمین چیخ اٹھتی۔ اور
روئے زمین ایک ایسی سطح بنجاتی جس پر آپس میں پھنسے ہوئے۔ شاخوں
میں شاخیں اڑائے ہوئے درختوں کا جال چھا جاتا۔ انسان کو قدم اٹھانا
اور زمین پر رہنا مشکل ہو جاتا۔ اسیطرح علم و فطانت۔ غور و فکر کے نتائج
کو زوال ہوتا ہے تاکہ جانشین مصنفوں کی جولانی طبع کو کھلا میدان ملے
اور اسیطرح زبان آہستہ آہستہ جگہ چھوڑتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ
ساتھ کتابیں ایک وقت خاص تک اپنی شہرت کا پھریرا اڑا کر رخصت
ہوتی جاتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو پچھلے اور موجودہ خیالات کا ہجوم دماغوں
میں سخت پریشان کرنے والا تلاطم پیدا کر دیتا۔ زمانہ گذشتہ میں خیالات
کا دائرہ محدود کرنے کے لیے چند قدرتی سامان موجود تھے۔ اول تو کتابیں
قلم سے نقل ہو کر پھیلتی تھیں اور ظاہر ہے کہ یہ مشکل وقت اور دیر طلب تھی
دُوم جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ یا تو چمڑے پر اور چمڑا ایک قیمتی شے تھی اس لئے
نئی منشارت قلمبند کرنے کے لیے اسباب کی ضرورت محسوس ہوتی
تھی کہ پہلے نوشتہ کو مٹایا جائے یا خیالات پپے پائی رین
(Papyrus) مصری پودے کے پتوں پہ لکھے جاتے تھے جو خستہ اور

اور جلد خراب ہو جانے والے تھے۔ سوم تصنیف و تالیف کا کام نہایت محدود اور کم بار آور تھا۔ صرف وہ لوگ اس شغل میں حصہ لیتے تھے جو خانقاہوں میں سجادہ پر بیٹھ کر اور آرام سے زندگی گذارتے تھے۔ ان حضرات کا ہم کو ممنون ہونا چاہئے کیونکہ یہی تھے جنھوں نے قدیم زمانے کے خیالات کے سیلاب کو دیوار بنکر روکا ورنہ موجودہ ذہانت اُسمیں تھپیڑے کھاتے کھاتے غرق ہو جاتی۔

لیکن اب علم کی ترقی اور کاغذ و پریس کی ایجاد نے مذکورہ بالا رکاوٹوں کو بالکل صاف کر دیا۔ پریس نے ہر ایک شخص کو مصنف بنا دیا اور ہر ایک دماغ کو اس قابل کر دیا کہ اپنے نتیجہ فکر تمام علمی دنیا میں پھیلا دے۔ مگر اسکا انجام بڑا اندیشہ ناک ہوگا۔ علم ادب جو پہلے ایک چشمہ تھا دریا بنا اور دریا سے اب ایک بحر زخار ہو گیا۔ چند صدیاں پہلے ہزار پانسو مجلدات ایک بڑا کتب خانہ شمار ہوتی تھیں مگر آجکل کے کتب خانوں کا جن میں لاکھوں جلدیں فراہم ہیں کیا نام رکھنا ہوگا۔ طرفہ تریہ کہ پریس کو اس پر بھی قرار نہیں وہ تعداد مذکور کو دن دونی اور رات چوگنی کرنے میں بڑی سرعت کے ساتھ مصروف ہے۔ یہ دیکھکر مستقبل پر مجھ کو بڑا ترس آتا ہے وہ خیالات کا کہاں تک مطالعہ کرے گا۔ اور کہاں تک اُن کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھ سکے گا۔ مجھ کو خوف ہے کہ زبان کا آہستہ تغیر و تبدل پریس کی تیزی رفتار کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ بھی خیال کیا تھا کہ نکتہ چینوں کا گروہ خیالات کی کثرت کو روکے گا جو کہ وہ مشتاقان تصنیف کو میدان تصنیف کے اندر قدم رکھنے سے روکتا ہے اور اس کا دائرہ بھی شبانہ روز وسیع ہو جاتا ہے مگر میرا خیال

تجربہ نے غلط ثابت کردیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ چھاپنے والے سرگرمی سے چھاپ رہے ہیں اور لکھنے والے جوش سے لکھ رہے ہیں اور وہ دن قریب ہے جبکہ دنیا کی سطح سے سیکڑوں کاغذی ہمالیہ اوٹھتے نظر آئیں گے اور صرف کتابوں کے نام پڑہنے کے لیے پورا زمانہ عمر درکار ہوگا۔ اِس کے آثار ابھی سے نظر آتے ہیں۔ چونکہ آجکل بھی اکثر لوگوں کو کمی وقت اور کثرت کتب کے باعث صرف مطالعہ ریویو پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور چند صدیوں بعد تو فاضل تبحر وہ شخص کہلائیگا جس کا دوسرا نام زندہ فہرست کتب ہوگا

کتاب نے کہا حضرت تمھارا قطع کلام ہوتا ہے جس کی میں معافی چاہتی ہوں اور میں گمان کرتی ہوں کہ تم کو فقط نثر سے شوق ہے۔ یقیں اُس شخص کا بھی کچھہ حال معلوم ہے جس نے میرے آوازہ شہرت کے دبتے ہی زمین پر شور مچانا شروع کردیا تھا۔ اور عام طور پر اُسکی شہرت چندروزہ سمجھی جاتی تھی اور فضلا اس سے نفرت کرتے تھے۔ چونکہ وہ ایک نادار اور نیم تعلیم یافتہ شخص تھا۔ نہ وہ لاطینی جانتا تھا۔ اور نہ یونانی سمجھہ سکتا تھا اور ایک زمانہ میں اُس کو ہرن پکڑ لانے کا چسکا تھا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو غالباً اُس کا نام شکسپیر تھا۔ شاید اب تک تو وہ گمنام ہوچکا ہوگا۔

میں نے جلدی سے جواب دیا۔ نہیں نہیں۔ بالکل اس کے برعکس بلکہ محض اُس کے طفیل میں اُس کے زمانہ کے علم ادب نے غیر معمولی استحکام پا شکسپیر تو اُن لوگوں میں سے تھا جو صدیوں میں ایک آدہ بار خاص دماغ لے کر دنیا میں آتے ہیں اور علم ادب کی قدرتی بے ثباتی کا کامیابی کے ساتھہ مقابلہ کرتے ہیں۔ فطرت انسانی کو وہ اپنے خیالات کا مرکز بناتے ہیں۔ وہ اُن عظیم الشان درختوں کے مانند ہوتے ہیں جو ہم کو کبھی کبھی

دریا کے کنارے پر دکھائی دیتے ہیں اور جو اپنی موٹی موٹی جڑیں زمین کے اندر گہری پہونچا دیتے ہیں اور گرد و پیش کی مٹی بلکہ چھوٹے چھوٹے پودوں اور ردی گھانس کو سیلاب دریا سے بچا لیتے ہیں۔ یہی حال شکسپیر کا ہے۔ وہ زمانہ کی دست برد سے بسینہ سپر ہوا۔ اوس نے اپنے زمانے کے محاورات اور زبان کو قایم رکھا اور متعدد ادنیٰ رتبے کے مصنفوں کو صرف اس وجہ سے کہ وہ اُس کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ نسیاً منسیاً ہونے سے بچا یا۔ مگر ہاں اب اوس کا بھی خدا حافظ ہے۔ چونکہ بے شمار حواشی اور بے تعداد معانی اُس کی تصانیف پر اُس بیل کی طرح جو کسی درخت پر لپٹ کر اُس درخت کو نظروں سے بالکل پوشیدہ کر دیتی ہے چھا گئے ہیں۔"

یہ سنکر اُس کتاب نے بڑے زور سے قہقہہ مارا۔ اور کہا "تو کیا تم مجھے یہ یقین دلانا چاہتے ہو کہ کسی زمانہ کا ادب ایک آوارہ۔ ہرن جو جاہل تک بند کے ہاتھوں سے پائدار ہو سکتا ہے"۔ اور پھر ہنسنے لگی۔

مجھ کو اُس کا قہقہہ کسی قدر ناگوار گذرا مگر میں نے اُس کی اِس حرکت کو نادانی پر محمول کیا اور جواب دیا۔ "بے شک ایک شاعر کو اپنے اشعار کی بدولت بقائے نام کا بہت عمدہ موقع ہے۔ شاعر دماغ سے لکھتے ہیں اور ایک شاعر دل سے لکھتا ہے اور اپنے مفہوم کو دل ہی میں اوتارتا ہے وہ نظر فریب نیچر کا ایک وفادار نقاش ہوتا ہے۔ اُس کا کلام مؤثر اور شگفتہ ہوتا ہے۔ وہ پاکیزہ جذبات کو زبان کا پاکیزہ لباس پہناتا ہے وہ انسانی زندگی کی مختلف شکلوں کو جو اُس کی نظر کے روبرو گذرتی ہیں مختلف تصویروں میں پیش کرتا ہے۔ اُس کا کلام اُس کے زمانے کی

تہذیب و شائستگی کی صحیح تاریخ ہوتا ہے اور زبان کے قیمتی موتیوں کو چن چن کر محفوظ کر لیتا ہے۔"

میں موجودہ شعرا کی توصیف میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ دفعتہً لائبریری کا دروازہ کھلا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو لائبریرین نے کہا کہ لائبریری بند کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اوٹھ کھڑا ہوا۔ اور میں نے اُس کتاب سے باقاعدہ رخصت چاہی مگر وہ کچھ نہ بولی اور میں وہاں سے چلدیا۔

سید سجاد (دہلوی)

راحت زمانی مولوی سید احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونیکے ایک نہایت سود مند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ بیگماتی زبان قلعہ معلی کے محاورے قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنیکو جی نہیں چاہتا قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم یہ وہ کتاب ہے کہ جو ڈہونڈے سے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸

لڑکیوں کی انشا حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبد الرشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلی۔ لطف زبان کیواسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا موثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے قیمت عہ ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸ر)

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

ہماری فریاد

یا ہمی تذکرۂ دردِ نہاں کرتے ہیں — آپ پر حالِ زبوں اپنا عیاں کرتے ہیں
آج دل تھام کے حسرت سے فغاں کرتے ہیں — صرف سن لیجئے شاہا جو بیاں کرتے ہیں

عرضِ حالت نہ سہی، بخت کا شکوا ہی سہی
شکوۂ حق نہ سہی، شکوۂ بیجا ہی سہی

دیکھئے اپنی اس امت کو، جو تھی خیرِ امم — آج ہر بات میں ہر قوم سے وہ ہو گئی کم
اب نہ دل ہے نہ شجاعت نہ خلوص باہم — نہ وہ پہلا سا جلال اور نہ وہ پہلا سا حشم

نہ بزرگوں کو ہے خوردوں کے مناصب کا لحاظ
اور نہ خوردوں کو بزرگوں کے مراتب کا لحاظ

طالبِ سیم و زر و درہم و دینار ہے یہ — طمعِ مال کے پھندے میں گرفتار ہے یہ
دین کو بیچ کے دنیا کی خریدار ہے یہ — نفعِ دو روزہ کے لالچ میں زیاں کار ہے یہ

الغرض گرم ہے بازار گنہ گاری کا
اس کے دل پر ہے جما سکّہ سیہ کاری کا

فرقے اتنے ہوتے پیدا کہ عیاذاً باللہ — نفرت ان سے ہے انہیں ان سے انہیں استکراہ
ٹیڑھے رستوں کی یہ کثرت ہے کہ انا للہ — رہروؤں کو کہیں ملتی نہیں اب سیدھی راہ

بھیس میں رہنماؤں کے ہیں رہزن لاکھوں
پُر ہنر ایک نہیں، اور ہیں پُرفن لاکھوں

نا۔ قہ عینِ تدیّن ہے، تدیّن الحاد — علما ہو گئے تحریفِ کَلِم میں استاد
صفرِ ناسخ پہ بنائے گئے، منسوخ پہ صاد — متواتر ہوئے موضوع، تو مشہور آحاد

آیتیں جتنی تھیں محکم متشابہ ٹھیریں۔
نہ مؤول تو مؤول کے مشابہ ٹھیریں

جو مقلد ہیں وہ تقلید ہی میں کوسوں دور ۔۔۔ اپنی تقلید پہ ہیں غیر مقلد مجبور
بھائی شیعوں کو تبرّا نے کیا ہے مخمور ۔۔۔ شرک و بدعت میں ہیں ارباب تصوف محصور
ہیں تنے چند جو محفوظ ہیں ان باتوں سے
ورنہ لاکھوں میں ہیں جو محفوظ ہیں ان باتوں سے

خدمت مجتہدین کے ہیں یہ قدر شناس ۔۔۔ دلیں کہتے ہیں نہ کچھ محنت اسلاف کا پاس
اب قرآن و احادیث، نہ اجماع و قیاس ۔۔۔ رکن اسلام بس اک عقل ہی صرف اپنے پاس
فہم صحابہ تو نہ حجت ٹھیرے
ہاں مگر ان کے سمجھنے کو فضیلت ٹھیرے

یہ عجب طرح کی پہیلی ہے ہوا دنیا میں ۔۔۔ ہیں جو کچھ مدعی صدق و صفا دنیا میں
اُن کے نزدیک ہی جو غیر خدا دنیا میں ۔۔۔ وہ خدا ہی کہ ہوا جلوہ نما دنیا میں
یہ بد اندیش ہیں ممکن کو ہی واجب کہتے
شرم آتی نہیں موہوب کو واہب کہتے

پہلے دوزخ سے ڈراتے تھے جہنم کو علما ۔۔۔ دوزخی کہنے لگے اب علما کو جہلا
کیوں شریفوں کو نہ آوازے کسیں اب کمتا ۔۔۔ کہ کمینے ہیں کمینوں سے زیادہ شرفا
گرم بازاری حرص و طمع و زور ہے اب
منزل زہد و ورع ان سے بہت دور ہے اب

کہیں قرآن سے ثابت ہوئی ہے حرمت سود[1] ۔۔۔ ہے کہیں حلت مَے صرف بقدار سرور

[1] اکثر لوگ متعدی امراض کے شک پر جھوٹے کے استعمال کو مہلک یا مضر سمجھتے ہیں۔ اور لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کی رو سے اسکو حرام کہتے ہیں۔ فنعوذ باللہ من شرور انفسنا

نظمِ قرآن میں دکھاتا ہے کوئی نقص و قصور کوئی اقوالِ پیمبر میں بتاتا ہے فتور

کوئی کہتا ہے کہ منسوخ ہیں آیاتِ نماز

سود خواری کا نکالا گیا قرآں سے جواز

ہے خدا کی نہ پیمبر کی محبت دل میں جوشِ مذہب ہے نہ اسلام کی جرأت دل میں

نہ حدیثِ نبوی کی ہے وقعت دل میں نہ وہ قرآن کے احکام کی عظمت دل میں

حکم ناواجبِ تعمیل ہیں اب صوم و صلوٰۃ

امر ناقابلِ تسلیم ہیں اب حج و زکوٰۃ

چند لیڈر جو ہیں اس قوم کے جن پر ہے یقین کہ یہی ہیں مذہب و ملت کی ترقی کی مشین

واقفیت انہیں اتنی بھی نہیں بالتعیین کیا ہے ایمان کی تعریف، کسے کہتے ہیں دین

کس طرح منزلِ مقصد کو وہ رہرو پہنچے

رہنما جس کا ہو گمراہ زیادہ اس سے

ہم نے مانا کوئی جج کوئی کلکٹر ہو جائے یا کوئی محکمۂ فوج کا افسر ہو جائے

یا ترقی میں کوئی اس سے بھی بڑھ کر ہو جائے وقت کا اپنے یہاں تک کہ سکندر ہو جائے

یوں ترقی ہوئی شخصی تو بھلا عام کو کیا

نفعِ دنیا سے غرض مذہبِ اسلام کو کیا

ہے یہ لازم جو ہو دنیا کی ترقی کا خیال پہلے عقبیٰ کی ترقی میں کریں استکمال

ورنہ ہو جائیگی معکوس ترقی کی مثال کچھ نہ ہاتھ آئیگا آخر کو بجز رنج و ملال

کیوں سمجھتے نہیں اتنا ہے اگر عقل و وقوف

کہ ہے مومن کے لیے دین پہ دنیا موقوف

الغرض راہنما جتنے ہیں سب نام کے ہیں نہ کسی نفع کے ہیں اور نہ کسی کام کے ہیں

قوم کے یہ تو بہی خواہ نہ اسلام کے ہیں چاہنے والے فقط اپنے ہی آرام کے ہیں

خادم اپنے کو بناتے ہیں کہ مخدوم نہیں
ایسے موجود سے بہتر ہے کہ معدوم نہیں

یاں بنی اہو چکی کمزوری اخلاق بیاں
مذہبی رنگ جو تھا وہ بھی ہوا صاف عیاں

آپ سے حالتِ ملکی بھی نہیں گرچہ نہاں
کھولتے ہیں مگر اس میں بھی ہم اپنی زباں

مطلب اس عرض سے ہے یاد دہانی گویا
سامنے اپنے ہی سینے کہانی گویا

ہائے وہ قوم اک جرأت میں تھا شہرہ جس کا
جمگیا تھا دلِ اغیار پہ سکہ جس کا

ساری اقوام تھی جلتے ہوئے لوہا جس کا
کانپ جاتے تھے جگر رعب تھا ایسا جس کا

بادشاہوں سے لیا کرتی تھی جو باج، افسوس
سو ذلیلوں میں وہ ہے ایک ذلیل آج افسوس

گھٹ گئی سلطنتِ ملکِ عجم کی بنیاد
ہوگئی قرطبہ و مصر کی شوکت برباد

اپنے قبضے میں ہیں دریا، نہ بیابان، بلاد
خانہ ویران ہیں وہ جن سے ہوئی دنیا آباد

سلطنت اب نہیں دنیا میں مسلمانوں کی
دھوم ایران کی بھی اب خیر نہیں جانو کی

پھیلی ہے آجکل ایران میں وہ بدنظمی
کہ ہے یاں ہند میں سن سن کے ہمیں بے چینی

سلطنت چین سے ہے، اعدا رعایا کو خوشی
الغرض کچھ نظر آتی نہیں حالت اچھی

سب کو ہے فکر کہ ایران و بچائیں کیوں کر
اب مسلمانوں کو یاں سے بھی نکالیں کیوں کر

ہائے وہ گھر جو ہے مرکزِ اسلام اب تک
مذہبی جوش کا باقی ہے جہاں نام اب تک

جس جگہ باتوں میں کھنچ جاتی ہے صمصام اب تک
مارنا مرنا ہے لوگوں کا جہاں کام اب تک

وہ بھی آنکھوں میں کھٹکتا ہے جفاکاروں کی

ہے چشم رحم اب تو نظروں پہ ستمگاروں کی

آج اٹلی نے دبایا ہے جو اک ملک اس کا — دوسرے ملک پہ کل کوئی کریگا دھاوا
کان شیطان کے بہرے، جو یہی طور رہا — نام پھر سطوت اسلام کا مٹ جائیگا

دین اسلام کی شوکت نہ رہے گی باقی
یا نبیؐ آپ کی امت نہ رہے گی باقی

آخواب ہم یونہیں تڑپا کریں کبتک اٹھیے — آفتیں روز کی جھیلا کریں کبتک اٹھیے
یا نبیؐ! صدمے اٹھایا کریں کبتک کہئے — حشر کی راہ ہی دیکھا کریں کبتک، اٹھیے

ہوچکا خواب گراں آئیے اب بس اٹھیے
اٹھیے اے مونس امت بیکس اٹھیے

دیکھیے اب دوش مبارک پہ وہ پر نور عبا — باندھیے سر پہ عمامہ، کہ ہوں مشتاق فدا
نازنین ہاتھوں سے کسیئے گرہ بند قبا — لیجئے دست مبارک میں منور سا عصا

آیئے روضے سے باہر ہیں بہت یاں مشتاق
ایک مدت سے مدینے کی ہیں گلیاں مشتاق (تمنا)

تصویر جلوس شاہی جو آج کے پرچہ میں زیب ورق اول ہے اسوقت کا ایک نظارہ ہے جب جلوس شاہی قلعہ معلّٰی سے نکلکر جامع مسجد کیطرف آرہا ہے۔

شہنشاہ معظم کی تشریف آوری سے دلّی کو جو رونق نصیب ہوئی اس کا مختصر سا خاکہ یہہ تصویر ہے جس سے ناظرین تمدن کو معلوم ہوگا کہ یہہ جلوس کس شان اور کروفر سے روانہ ہوا۔ امید ہے کہ یہہ تصویر نہایت دلچسپی سے دیکھی جائے گی۔

مسئلہ ازدواج و طلاق

ایک دھریہ کی نظر میں

(۱) کیا تم کسی حالت میں طلاق کے اصول کو جائز و مناسب قرار دیتے ہو؟

بالعموم مُردے دنیا پر راج کر رہے ہیں اور زندہ لوگ مردہ لوگوں کے زیر ظلم ہیں۔ پرانے خیالات جو اپنی ضروریات کے وقت پیدا ہو کر معدوم ہو چکے ہیں۔ ابھی تک دلوں میں جاگزیں ہیں۔ بہت سے لوگ طبعاً قدامت پرستی کی طرف مائل ہیں اور پرانی ڈگر پر چلنا چاہتے ہیں۔ بغیر دریافت کئے کہ وہ راستہ انہیں کدھر لے جائیگا۔ اور بغیر جانے کہ وہ خود کس طرف جانا چاہتے ہیں +

طلاق کے متعلق خیالات ہمیں قرن اولین کے عیسائیوں سے ورثہ میں ملے ہیں اور ہم تک مذہبی رنگ میں پہنچائے گئے ہیں۔ ابتدائی زمانے کے عیسائیوں کا خیال تھا۔ کہ دنیا یا تو اب نیست و نابود ہونے والی ہے۔ یا بذریعہ آگ صاف و پوتر کی جائے گی۔ تمام شریر النفس غارت ہونے والے ہیں۔ اور نیک لوگ ہوا میں بلند ہو کر اپنے خداوند سے جا ملیں گے۔ تاکہ وہ وہاں اس وقت تک قیام پذیر رہیں۔ جب تک کہ زمین مبارک لوگوں کے رہنے کے قابل نہ ہو جائے اس خیال اور یقین کی موجودگی میں دنیا کی کوئی چیز مقابلۃً کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی ایسا شخص جو اناج جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے ذخیرہ خانے بنواتا۔ ایک بیوقوف زمیندار سمجھا جاتا تھا۔ جو اناج کی دھن میں اپنی روح کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانتا۔ وہ خوش حال اور کھاتے پیتے لوگوں کو دولت کے خدا کی

اولاد سمجھتے تھے۔ اور بدقسمت مصیبت زدہ اور بیمار لوگوں کو خدائے برحق کے پسندیدہ بندے۔ وہ تمام دنیا کے کاروبار کو حقارت کی آنکھ سے دیکھتے اور سوائے زکوٰۃ دینے کے اور سب کاموں کو بند کرنے کی کوشش کرتے۔ شادی کرنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ اور اسیطرح اپنے گھربار بنانے کا بھی کوئی وقت نہیں تہا۔ ان کے تمام خیالات سلے وسے کے آسمان کیطرف لگے ہوئے تہے جس کے وہ وراثت میں پانے کی امید موہوم لگا رہے تہے۔ تجارت۔ نسبت۔ اور تمام دنیاوی چیزیں فضول سمجھی جاتی تہیں +

نئے عہدنامہ میں حواریوں کے گھربار کی نسبت کچھ مرقوم نہیں ہے اور اسطرح ان کی گھربار کی زندگی۔ گھر کی خیروبرکت تعلیم وتعلم کی ضرورت اور دماغ کی نشوونما اور ترقی کی نسبت بھی کچھ ذکر نہیں ہے۔ یہ چیزیں دل و دماغ سے صرف اس بنا پر بھلا دی گئی ہتیں کہ پیش آنے والے واقعہ کے سامنے اِن کی کچھ ضرورت نہیں سمجھی گئی تہی۔ سوائے اسکے کہ لوگ مسیح کے آنے پر تیار رہیں۔ اسی خیال کی بنیاد پر خود مسیح انکو لوگوں کو انعام دیتے تھے۔ جو اپنے بیوی بچوں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہکر چھوڑ دیتے تہے انسانی محبت نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تہی [۵] مُردوں کو اپنے مردے گاڑنے دے۔ تو میرے پیچھے آ۔ مجھے اس سے کیا مطلب۔ لوگ نہ صرف اِن باتوں پر یقین رکھتے تہے بلکہ ان پر

[۵] مقدس متی کے آٹھویں باب ۱۸ ویں آیت سے لیکر ۲۲ ویں آیت کی طرف اشارہ ہے :-
جب یسوع نے بہت سی بھیڑ اپنے آس پاس دیکھی۔ اس نے حکم کیا کہ پار جاویں اور ایک فقیہ نے آکے اسسے کہا اے استاد۔ جہاں کہیں تو جائے میں تیرے پیچھے چلوں گا۔ اور یسوع نے

حامل بھی تھے۔جس کا نتیجہ یہ نکلا۔کہ زندگی کے تمام تعلقات کی مخالفت کی گئی اور ان کو توڑ دیا گیا۔اور ان کی پابندی ضروری نہ سمجھی گئی۔شادی کی مخالفت کی جاتی تھی۔اور اس کی نسبت یہ خیال تہا کہ نکاح ظاہرا اور بے لگام گناہ سے ایک درجہ بڑھکر ہے۔اور اس کا جواز انسانی کمزوری پر دال ہے۔نکاح نہ کرنا زیادہ اچھا سمجھا جاتا تہا۔عورت سے محبت کرنے کی نسبت خدا سے محبت کی لو لگانا زیادہ اعلیٰ اور ارفع تصوّر کیا جاتا تھا انتہا درجے کے اللہ والے اور عابد تجرّد کی زندگی کو روا رکھتے تہے اور عورت کو بنظر حقارت دیکھتے تھے۔لیکن ان تمام باہمی اختلافات اور متضاد باتوں کے ہوتے ہوئے جو پادریوں میں امتیازی حیثیت سے پائی جاتی ہیں۔نکاح ایک طرح کی قسم خیال کیا جاتا تہا۔قاضی (یعنی پادری) شادی کرنے والوں سے کہتا تہا کہ "یاد رکہو۔تم عمر بہر کے لیے گرفتار رکئے گئے ہو۔یہ دروازہ صرف ایک دفعہ کھلتا ہے[2] نکاح کی زندگی کو پیشتر تمام راستے ایک ہی منزل مقصود کا پتہ دیتے ہیں" اور یہ گویا نکاح کرنے کی ایک سزا تہی پادری محسوس کرتا تھا کہ نکاح کا عہد اگر خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہیں ہے۔تو کم سے کم اس کی نصیحت کے خلاف ہے جس کی پاداش میں از روئے انصاف شادی کرنے والے کو کسی نہ کسی طرح

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱) اس سے کہا کہ لومڑیوں کے لیے ماندیں اور ہوا کے پرندوں کے واسطے بسیرے ہیں۔پر ابن آدم (مسیح) کے لیے جگہ نہیں جہاں اپنا سر دھرے۔اس کے شاگردوں میں سے دوسرے نے اس سے کہا۔اے خداوند۔مجھے رخصت دے کہ پہلے جا کر اپنے باپ کو گاڑ دوں پر یسوع نے اس سے کہا۔کہ تو میرے پیچھے آ۔اور مردوں کو اپنے مردے گاڑنے دے۔" مترجم۔

[2] مطلب یہ ہے۔نکاح کرنے کے بعد کسی حالت میں دوبارہ نکاح نہیں کرسکتا۔مترجم۔

سزا ملنی چاہیئے اس دھمکی پر اس کا بھی اضافہ کیا جاتا تھا اور اچھی طرح سے کان کھول کر جتا دیا جاتا تھا کہ طلاق کسی حالت میں ممکن نہیں۔ اور اس غلطی کی اصلاح ناممکن ہے۔ ہر شادی و بیاہ کے موقعہ پر یہ پادری اپنی خشک انگلی کو دولہا اور دلہن کی طرف بڑھاتا تھا۔

تقریباً تمام عقلمند اصحاب نے اب اس خیال کی پیروی چھوڑ دی ہے کہ دنیا کا جہاز اب ساحل مستقام پر آن لگا ہے۔ اور عنقریب اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔ وہ اس کا بھی یقین نہیں کرتے۔ کہ خوشحالی بدی کی کوئی خاص علامت ہے یا مفلسی اور ناداری نیکی کے مسلم سرٹیفکیٹ ہیں انہیں اب اس بات کا بھی یقین نہیں آتا۔ کہ ڈائیوز[1] کو محض اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے دوزخ میں

[1] مقدس لوقا کی انجیل میں ایک دولتمند اور مفلس کے قصہ کیطرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے:-

ایک دولتمند تھا (جس کا نام ڈائیوز تھا) جو لال اور مہین کپڑے پہنتا اور روز روز شان و شوکت سے عیش کرتا تھا۔ اور لاذر نامی ایک غریب آدمی جو ناسور سے زخمی تھا لوگ اسکی ڈیوڑھی پر ڈال جاتے تھے اور وہ آرزو رکھتا تھا۔ کہ ان ٹکڑوں سے جو دولتمند کی میز سے گرتے تھے۔ اپنا پیٹ بھرے بلکہ کتّے آکے اس کے گھاؤ چاٹتے تھے اور ایسا ہوا کہ وہ غریب مر گیا۔ اور فرشتوں نے اسے لیجا کے ابراہیم (علیہ السلام) کی گود میں رکھا۔ اور وہ دولتمند بھی موا اور گاڑا گیا۔ اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ اور ابراہیم کو دور سے دیکھا۔ اور اسکی گود میں لاذر کو اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابراہیم! مجھپر رحم کر اور لاذر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کے میری زبان ٹھنڈی کرے کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔ تب ابراہیم نے کہا کہ اے بیٹے۔ یاد کر کہ تو اپنی زندگی میں اچھی چیزیں لے چکا اور لاذر بری چیزیں۔ سو اب وہ تسلی پاتا ہے اور تو تڑپتا ہے۔ اور ان سب کے سوا ہمارے تمہارے درمیان ایک بڑا گڑھا دھرا گیا ہے ایسا کہ وہ جو یہاں سے تمہارے پاس جایا چاہیں۔ نہ جا سکیں۔ اور نہ وہ لوگ جو وہاں ہیں اس پار

ڈالا ہوگا۔ اور یہ کہ لعزر غریب ہونے کے سبب ہمیشہ کی خوشی یعنی بہشت کا مستحق ہوا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ خوشحال نیک ہو سکتے ہیں۔ اور بدقسمت بد۔ اب ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ شرائط خوشحالی کی عدم پابندی یقینی طور پر بدقسمتی اور مصیبت کا راستہ دکھاتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب کہ لوگوں کا خیال تھا کہ شخص واحد کا گناہ تمام فرقے۔ برادری یا قوم پر غرض جس کسی کا اس سے کچھ بھی تعلق ہے۔ پڑتا ہے۔ یہ بات بھی درجہ یقین کو پہنچ گئی تھی۔ کہ اگر کسی مرد یا عورت نے خدا سے کچھ نذر نیاز مان رکھی ہے۔ اور کسی طرح وہ اپنے عہد کے پورا کرنے میں قاصر رہی ہے۔ تو خدا تعالیٰ اس کے بدلہ میں تمام قوم و فرقہ کو سزا دے گا اس خیال کو بھی اب کوئی نہیں مانتا۔ جوں جوں ہم ترقی کر رہے ہیں۔ روز دوں ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر شخص واحد کے حقوق کیا ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں کسی حد تک معلوم ہو گیا ہے۔ کہ شخصی حقوق سے بڑھکر اور کسی کے حقوق نہیں ہیں ایک زمانہ تھا جبکہ عوام کا یہ خیال تھا کہ سزا درست کرنے والی زبردست طاقت ہے۔ گویا بالفاظ دیگر لوگ حیوانی جبر کے فیض اور اثر کے قائل تھے۔ لیکن دنیا اب بدل رہی ہے۔ ایک وقت میں لوگ اس

(بقیہ کا نوٹ صفحہ ۲۳) اس پار ہمارے پاس آ سکتے ہیں۔ تب اس نے کہا میں اے باپ (ابراہیم) منت کرتا ہوں کہ تو اسے میرے باپ کے گھر بھیج۔ کیونکہ میرے پانچ بھائی ہیں۔ کہ انہیں گواہی دے تا نہ ہو کہ وہ بھی اس عذاب کی جگہ میں آویں۔ ابراہیم نے اسے کہا۔ کہ ان کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) اور انبیا ہیں۔ چاہیئے۔ کہ وہ ان کی سنیں۔ اسنے کہا کہ نہیں اے باپ ابراہیم! پر اگر کوئی مُردوں میں سے ان کے پاس جائے۔ وہ توبہ کریں گے۔ اسنے اسے کہا۔ کہ جب وے موسیٰ اور نبیوں کی نہ سنتے ہیں۔ تو اگر مُردوں میں سے کوئی اٹھے تو اسکی نہ مانیں گے۔" ۳۱ آیت (از ترجمہ انجیل) مترجم

امر کے بھی قائل رہے ہیں۔ کہ کیتھولک مذہب[۵۱] درحقیقت سوسائٹی کا منجی ہے اور یہ کہ ایک فلاسفر کا قتل سلطنت کے انتظام کے لیے ازلبس ضروری ہے[۵۲] اور خواہ کچھ ہی ہو سلطنت کی حفاظت کرنی چاہیئے لیکن اب ہم زیادہ روشنی میں آ گئے ہیں۔ اور اس روشن نقطہ پر جسکو زمانہ حال کہتے ہیں۔ کھڑے ہو کر مجھے تمھارے سوالات کا جواب دینا چاہیئے۔

نکاح ایک نہایت ہی ضروری اور نہایت ہی مقدس عہد ہے جسکو بنی نوع انسان انجام دے سکتے ہیں۔ اس کا کچھ مضائقہ نہیں کہ ہم اسے کس نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ خواہ عہد و پیمان کے نام سے۔ خواہ قسم سے لیکن بہرحال مطلب ایک ہی ہے۔ سچا نکاح دراصل روحوں کے اتحاد اور ملاپ کا نام ہے۔ ایسا اتحاد جس میں جھگڑے کا خیال ہی نہیں آتا۔ یہ ایک ایسا اتحاد ہے جس میں کل چیزیں واحد نظر آتی ہیں۔ تمام امتیاز اٹھہ جاتے ہیں۔ اور زمانہ حال دائمی معلوم ہوتا ہے۔ ان اعلیٰ گھڑیوں میں کل چیزیں روشنی کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ اندھیرا نام کو نہیں دکھائی دیتا۔ اور جب دو وجود اس طرح محبت کریں اور آپس میں مل کر ایک ہو جائیں تو فی الحقیقت دو روحوں کا یہی ایک نکاح ہے۔ جو کچھ جج۔ پادری۔ مجسٹریٹ یا دوسرے گواہوں کے سامنے کہا جاتا ہے۔ وہ ایک صرف اس عہد کی جو دل میں کیا جاتا ہے۔ ایک ظاہری گواہی اور نشانی ہے۔ وہ تو صرف اس اتحاد کی تائید کرتا ہے۔ جو ابھی دونوں کے دلوں میں طے ہو چکا ہے۔ یا ایسی

۵۱ کیتھولک مذہب کے معتقد عیسائیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سزا دیا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسے لوگوں کا عدم وجود سوسائٹی کی خوشحالی کے لیئے ضروری ہے۔ مترجم۔

۵۲ مثلاً گیلیلو کو صرف اس بنا پر قتل کر دیا گیا تھا کہ وہ زمین کے سورج کے گرد پھرنے کا قائل ہو۔ مترجم۔

دو ہمجوں کی جو شام سے ایک ساتھ ملنے کی متوقع ہیں ہر ایک نے اپنا اپنا آئیڈیل (مافی الضمیر) معلوم کر لیا ہے مرد نے تمام دنیا میں سے ایک ایسی عورت کو منتخب کر لیا ہے۔ جو اس کے نزدیک محبت۔ پاکیزگی۔ جذبات دل لگی خوبصورتی اور ناز و انداز کی مجسم تصویر ہے اور عورت نے بجائے خود ساری دنیا میں سے ایک ایسے مرد کو پسند کیا ہے۔ جو اس کے نزدیک اس کا آئیڈیل ہے۔ اور جو کچھ بھی وہ دلیری۔ بہادری۔ اور ایمانداری کی نسبت جانتی ہے سب کچھ اپنے خاوند کے وجود میں دیکھتی ہے۔ عہد و پیمان کا خیال جاتا رہتا ہے۔ فرائض اور حقوق فی الفور محبت اور خوشی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور دو زندگیاں دو دریاؤں کی طرح ایک ہو کر بہنے لگتی ہیں۔ اس نکاح اور ان کے باہمی فرائض کے مقدس ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔ اور رسوم میں تو سوائے اس کے کہ مرد اور عورت دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی چاہ ہو۔ اور تمام دنیا یہ جان لے کہ وہ فی الحقیقت بیاہے گئے ہیں۔ اور ان کی روحیں آپس میں مل گئیں اور کچھ نہیں ہوتا۔

نکاح کے کھلم کھلا اور علانیہ طور پر ہونے کی طرفداری میں ہزاروں وجوہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ سب سے بڑھکر تو یہ کہ لوگوں کو اس اتحاد کی پاکیزگی معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ رسوم نہ صرف دولہا دولہن کی حفاظت اور بھلائی کے لیئے ضروری ہیں۔ بلکہ ان کے بچوں کی حفاظت اور سوسائٹی کی عام بہبودی کے لیے بھی ویسی ہی فائدہ بخش ہیں لیکن پھر بھی نکاح ایک ارفع و اعلیٰ درجہ کا عہد و پیمان ہی رہتا ہے۔ ایسا عہد جس میں ہر ایک دل لیتا اور دیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نکاح کسی حالت میں فسخ بھی ہو سکتا ہے؟ مختلف فرقوں کی طرف سے جو کچھ جوابات دیے گئے ہیں۔ آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ لیکن ان مذہبی رایوں کے اندر عہد و پیمان کا سوال چھپا ہوا ہے اس نکاح کے قول و قرار میں مرد اپنی بیوی کی حفاظت کرنے اور اسکو ہر طرح سے خوش رکھنے کا عہد کرتا ہے۔ فرض کرو کہ وہ اب اسکی حفاظت کرنے سے منکر ہے اور اپنی منکوحہ کو گالیاں دیتا ہے اور پیٹتا ہے۔ اور اس پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتا ہے۔ اب اس مظلوم کا کیا تدارک کرنا چاہیئے؟ کیا وہ عورت ان حالتوں کے ہوتے ہوئے اپنے خاوند کی کی پابند ہے؟ خاوند نے عہد شکنی کی ہے۔ وہ اسکی حفاظت کرنے میں ناکامیاب ہوا ہے۔ اور اس کے علاوہ اس نے اس عورت کو جانوروں کی طرح پیٹا ہے۔ پھر کیا وہ عورت اپنے خاوند کی پابند ہے؟ کیا اس عورت پر اپنے خاوند کے عہد و پیمان کا کچھ زور اور اثر ہے؟ اگر ہے تو وہ اثر کس قسم کا ہے؟ کیا اس عورت کو اپنے خاوند کے ساتھ صرف اسکی خاطر رہنا چاہیئے۔ اور اگر وہ عورت اسکو اپنی جان بچانے کے لیئے چھوڑتی ہے۔ تو پھر کیا یہ ضروری ہے کہ عورت اپنے خاوند کی خاطر اسکی بیوی بن کر رہے؟ کوئی عقلمند آدمی ان سوالات کا جوابات اثبات میں نہیں دے سکتا۔

اب اگر عورت اپنے خاوند کی خاطر اسکی بیوی رہنے کی پابند نہیں ہے تو پھر کیا وہ صرف اس بنا پر کہ نکاح ایک قسم ہے۔ اسکی بیوی رہنے پر مجبور ہے؟ کیا خدا کی طرف سے عورت پر کوئی جبر ہے کہ وہ اس وحشی خاوند کے ساتھ زندگی بسر کرے؟ کیا اس عورت کا طریق زندگی

لامحدود ذات کی خوشی پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان لامحدود ذات کی خوشی کو گھٹا بڑھا سکے؟

اِس معاملہ کے متعلق دوسرا سوال سوسائٹی کی فلاح وآسودگی ہے۔ یہ تو بالضرور مان لیا جائیگا۔ کہ سوسائٹی کی بہبودی ایسے لوگوں کی علحدگی پر ممکن ہے یقیناً سوسائٹی کسی عورت پر جبر نہیں کرسکتی۔ کہ وہ ایسے خاوند کے ساتھ رہے جو ہر وقت اس کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہو شادی شدہ عورتیں بھی حفاظت کا حق رکھتی ہیں۔ ذاتی محافظت کا حق کسی عہد و پیمان یا قول وقسم سے ضائع نہیں ہوجاتا۔ اس معاملہ میں اگر ان کی نسبت نہایت ہی ادنےٰ درجہ کی رائے بھی قایم کیجائے۔ تو بھی وہ ادنےٰ متحرک جانداروں کے برابر حق رکھتی ہیں*

اِس بات کو غالباً بہت سے طلاق کے دشمن بھی تسلیم کرلیں گے لیکن وہ پھر اس امر پر زور دیں گے۔ کہ اگر بیوی کو اپنے خاوند کے مکان سے بھاگ جانے اور اپنے خویش واقربا کے ہاں پناہ لینے کا حق حاصل ہے تو کم سے کم نکاح جو ایک قسم ہے۔ فسخ نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایسا کرنے میں کچھ سوسائٹی کا نفع ہے۔ کہ جو لوگ آپس میں نفرت رکھتے ہوں۔ ایک ساتھ رہیں؟ کیا یہ زیبا ہے کہ دنیا ایسے افراد سے آباد ہو جو نفرت۔ بغض۔ شہوت اور حسد کی ذریات ہوں۔ یا باہمی محبت کی مبارک نسلوں سے؟ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ دانا اور رحیم خدا اس امر پر زور دے کہ ایک بیکس عورت ایک کمبخت کی بیوی بنا کر رہے؟ کیا اس فعل سے بہشت کی خوشی میں کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔ یا وہ دونو ایک ہوکر رہ سکتے ہیں؟ کیا گورنمنٹ کے لیے اِس سے بڑھکر کوئی اور بات معیوب ہوسکتی ہے کہ وہ

عورت کو کسی ایسے شخص کی جس سے اسکو دلی نفرت ہے۔ بیوی بنے رہنے کے لیے مجبور کرے؟ کیا کوئی معقول آدمی اپنی بیوی کو اپنے ہی گھر رکھنے کے لیے کسی کانسٹبل یا شریف جج یا پادری سے مدد کی درخواست کرتا ہے؟ کیا ایسے آدمی سے جو اس معاملہ میں زبردستی روا رکھتا ہو۔ بڑھکر کسی نفرت انگیز انسان کا خیال کرنا ممکن ہے؟ عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ عورت گھر سے نکل جانے کے معاملہ میں ہر طرح سے آزاد ہے اور یہ کہ عدالتیں عورت کو ایک ایسے شخص کی شرارت اور وحشی پن سے ضرور محفوظ رکھیں گی جس نے کہ اس کے محافظ بننے کا وعدہ کیا تھا لیکن سوال یہ ہے۔ کہ عورت جائے کہاں؟ ممکن ہے کہ اس کے رفقا اور دوست نہ ہوں۔ یا یہ کہ وہ غریب ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی زندہ نہو۔ تو پھر کیا اسے دوسرا گھر آباد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے؟ کیا ضروری ہے کہ یہ صحیح و تندرست عورت جس میں مہربانی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس مردہ لاش کے ساتھ جکڑ کر باندہ دی جائے؟ کیا اس کے لیے اب کوئی مستقبل نہیں ہے؟ کیا اب ہمیشہ کے لیے اسے مردود اور خارج کرکے اس سے بیوفائی کرنی چاہیئے؟ کیا وہ اب اپنے بچوں کے نازک بازوؤں کو اپنی گردن کے ارد گرد ڈال کر کسی ایسی جگہ ایک ایسے خاوند کے ساتھ جو اس سے محبت کرسکتا ہو اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو نہیں بیٹھ سکتی؟ کیا یہ اچھی بات ہے کہ سوشل امور میں اس عورت کو نہایت ادنے اور حقیر سمجھا جائے۔ اور کیا ایسا سمجھنا بنی نوع انسان کے مفاد کی خاطر ہے یا اس کمبخت کی خاطر جس نے اپنی جان کو تباہ و برباد کردیا ہے؟

بالعموم یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ اگر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ عورت اپنا وقار اور عزت غرض سب کچھ کھو بیٹھے گی۔ کیا اپنا اخلاقی کیرکٹر برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بچاری آزادی سے ہاتھ اٹھائے؟ کیا یہ اچھی بات ہے کہ اپنی عفت[1] و پاکبازی قائم رکھنے کے لیے ایک حیوان یا سوسائٹی یا بدطینت دیو کی غلام بن کر رہے۔

اگر کوئی لامحدود وجود عہد و پیمان کرنے والے فریقین میں سے کسی ایک کا شریک ہے۔ تو کیا یہ اس کا فرض نہیں ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے کہ اس عہد و پیمان کی کہاں تک پابندی ہوئی ہے؟ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے حقوق صرف اس بنا پر ادا نہیں کرتی کہ اس کے خاوند نے عہد کے خلاف کیا ہے۔ بلکہ اس کی جان تک لینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ تو کیا یہ ممکن ہے۔ کہ عورت کے دل میں خاوند کی طرف سے محبت کا احساس پیدا ہو؟ اور اگر ان دونوں میں محبت کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے تو پھر نکاح کی کیا قدر قیمت رہی اور اس عہدنامہ یا قسم میں سے باقی کیا خاک رہ جاتا ہے؟ عورت اب بیوی کے تعلقات قایم نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ اسکو اپنے خاوند سے نفرت ہے اب وہ اس کے مکان میں بھی رہنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ وہ ڈرتی ہے کہ کہیں اس کا خاوند اسے مار نہ ڈالے۔ اس کے بعد اب اگر ان کے درمیان کچھ تعلقات باقی رہ جاتے ہیں۔ تو وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی شکاری اور شکار۔ ظالم اور مظلوم کے مابین ہوں کیا یہ امر قابل تعریف ہے کہ ایسا تعلق زندگی بھر قایم رہے۔ اور اس پر مذہبی رسوم کی رنگ آمیزی کر کے اس رشتہ کو اور زیادہ مقدس بنا دیا جائے؟

---

[1] خلع برباد ی عصمت کا باعث نہیں ہے۔ ایڈیٹر۔

میں پھر پوچھتا ہوں کہ کیا ان حالتوں کے ہوتے ہوئے ایسی عیالداری کی زندگی بسر کرنا کچھ نیک بات ہے؟ کیا ہیں ایسے بچوں کی کچھ ضرورت ہے جو ایسے کمبخت والدین کی اولاد ہوں؟ کیا دوسرے لوگوں کی عفت و پاکبازی صرف اس عیش کی پامالی اور ہمیشہ کی قید سے قائم و برقرار رہ سکتی ہے؟

جس عقد کی بنیاد محبت پر قایم نہیں ہے۔ بہت خراب ہے۔ اور جس شادی کی غرض وغایت ذاتی وجاہت اور دولت کا حصول ہو۔ بہت ادنے ہے لیکن ہم ایسے نکاح کے متعلق کیا کہیں گے جہاں کہ فریقین (دولہا اور دلہن) قطعی طور پر ایک دوسرے سے نفرت رکھتے ہوں؟ کیا ایسا کرنا نیکی میں داخل ہے یا یہ فعل اخلاق کے کسی محاسن میں شمار کرنے کے قابل ہے؟ کیا بغیر اصلی اور سچے تعلق کے ہوتے ہوئے محض خاوند اور بیوی کا نام قائم رکھنے میں کوئی خاص نیکی ہے؟ کیا کوئی معقول عورت یا کوئی معقول مرد یہ ظاہر کرنے پر رضامند ہوگا کہ ایک سچی محبت کرنے والی عورت ایسے بچوں کی ماں بننے کے لیے مجبور کی جائے جن کے والد کو وہ نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے؟ کیا صفحہ ہستی پر کوئی ایسی عورت ہے جو دوسری عورت کو ایسا کرنے پر مجبور کرے جس سے وہ خود دور بھاگتی ہو؟

شادیاں مردوں اور عورتوں سے انجام پذیر ہوتی ہیں۔ نہ کہ سوسائٹی اور سلطنت سے۔ اور نہ مذہب یا مافوق الانسان سے اسوقت تک ہمیں یہ بخوبی معلوم ہو چکا ہوگا۔ کہ جو کام نفس رکھنے والے انسانوں کی بہتری اور فلاح پر مبنی نہیں ہے۔ ہرگز ہرگز اخلاقی نہیں ہو سکتا۔ اگر فی الواقع ہمیں ہمیں کچھ علم ہے۔ تو ہم جانتے ہیں۔ کہ نیکی کرنے کی طرفداری میں اور گناہ کرنے کے خلاف تمام وجوہ اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اپنے

آپ کو کسی دوسرے کی حالت میں ڈالنے کے لیے ہم میں قوت تخیلہ کا ہونا بسا ضروری ہے۔ اس لیئے تھوڑی دیر کے لیے مرد اپنے آپ کو ایک ایسی بیکس مظلوم عورت سمجھ لے جو وحشی خاوند کے زیر تشدد ہو۔ پھر کیا وہ طلاق کو ناجائز قرار دیگا۔ اور اسکی تائید کریگا۔؟

بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جنہیں ماؤں اور بچوں کی تکالیف کا پورا احساس ہے یعنی ایسی بیشمار بیویوں کی تکالیف کا جو اپنے خاوند کے آتے ہوئے قدموں کی چرچراہٹ سنتے ہی خوف زدہ ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور ایسے بہت سے بچوں کی مصیبتوں کا جو اپنے والد کی آواز سنتے ہی چھپ جاتے ہیں۔ بہت ہی تھوڑے لوگ ان طمانچوں کی تعداد کو جانتے ہیں۔ جو ہر روز اس بیکس کے منہ پر پڑتے ہیں۔ اور غالباً صرف گنتی کے لوگ ان خوفناک آنسوؤں کا علم رکھتے ہوں گے جنکو غریب مائیں اپنے بچوں کو چھاتی سے لگا کر بہا کرتی ہیں۔ ان تکالیف کے مقابلہ میں فلاکت و ناداری کی تمام سختیاں جن کو باہمی محبت کرنے والے دولہا دولہن جھیلتے ہیں۔ ہیچ ہیں۔ ایسے مرد اور عورت جو آپس میں نہایت سچے دل سے بیاہے گئے ہیں۔ مفلسی اور ناداری کی آفتوں کی مشقتوں کو باہم مل کر برداشت کر لیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو تسلی اور تشفی دیتے رہتے ہیں۔ شب دیجور میں بھی وہ ستارہ کی روشنی کو دیکھتے ہیں اور ان کی محبت ہر ایک کے دل میں ہمیشہ سورج کی کرنیں ڈالتی رہتی ہے۔

اچھا گھر اچھے انتظام اور عمدہ سلیقہ کی گواہی دیتا ہے۔ ایسے گھر جو ہے کی ہر ایک اینٹ تہذیب و تمدن کی کامل نشانی ہے۔ سوسائٹی نفرت کرنے والے گھروں کے وجود سے خوش نہیں ہوتی۔ یعنی ایسے

گھروں کے وجود سے جہاں کے خاوند اور بیویاں خود غرض رہ کے اور بے رحم ہوں۔ سوسائٹی کا اس میں کچھ نفع نہیں ہے کہ اچھے آدمی غلام ہو کر رہیں اور ہمیشہ پرخطر زندگی بسر کریں۔ یا یہ کہ وہ ایسے خاوندوں کے زندیہ باتیں بنیں جن کو وہ نفرت سے دیکھتی ہیں مگر ہمیشہ نیک اور فیاض والدوں اور سچی محبت کرنے والی ماؤں سے بہرے جانے چاہیں۔ اور جب کہ وہ اس طرح سے بہرے جائیں گے۔ دنیا شائستہ اور متمدن ہو جائے گی فراست بنگوڑوں کو جھلائے گی۔ انصاف عدالتوں میں نظر آئے گا۔ عقل قانون کی کرسی پر براجے گی۔ اور سب سے بڑھکر جو بات ہے وہ یہ ہے کہ آسمان کے گنبد کی طرح آزادی کی روح ہر چیز پر حکومت کرتی ہوئی دکھائی دے گی۔

اگرچہ نکاح ایک نہایت ضروری چیز اور نہایت ہی مقدس عہد و پیمان ہے۔ جسکو بنی نوع انسان انجام دے سکتے ہیں۔ تاہم عہد و پیمان کے ٹوٹنے پر عدالتوں کو اختیار دینا چاہیئے کہ وہ اس کے فسخ کا فتوے عادلانہ طریقوں پر دے سکیں۔

جیسا کہ قاعدہ ہے عورت خاوند کے سامنے اپنے کل مال و متاع یعنے اپنی جوانی۔ اپنی خوبصورتی اور اپنی محبت کا جہیز پیش کرتی ہے۔ اور یقیناً اس عہد سے اسوقت تک خاوند کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جبتک کہ خود بیوی ہی قول و قرار کی شرائط کو نہ توڑے طلاق بھی علانیہ دینی چاہیئے۔ اور اس کے انجام دینے کے لیے گواہوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تاکہ لوگ عہد و پیمان کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ شادیوں کا داخل دفتر ہونا بھی ظاہر طور سے

ہونا چاہیئے۔ اور طلاق کے معاملے میں بھی اس قسم کے اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔ شرائط پیش ہونی چاہئیں مال کو چند بڑے بڑے آدمیوں کی مدد سے آپس میں انصافاً تقسیم کر دینا چاہیئے۔ اور بچوں کی حفاظت اور ان کے رکھ رکھاؤ کا سوال بھی زیر شرائط ضروری ہے۔

مرد اور عورتیں کسی قانونی بندش سے نیک نہیں ہیں۔ قانون بذات خود نیکی کا احساس پیدا نہیں کرتا۔ اور نہ وہ محبت کا سرچشمہ اور بنیاد ہے لیکن قانون کے لیے نیکی اور عصمت کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔ اگر عورت نے خلاف عہد کوئی بات نہیں کی۔ تو قانون کے لیے نہایت ضروری ہے کہ عورت کو اپنی پناہ میں لے کر اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح مرد کی حفاظت کرے۔ اگر اس نے عہد کی شرائط کو پورا پورا نبھایا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ محبت کا عدم وجود۔ نکاح کا اخیر ہے۔ محبت ایک قدرتی امر ہے۔ ان تمام رسوم کے در پردہ محبت کی مبارک شمع جلتی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ جلتی رہے گی۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی سا موقع نہیں ہوا۔ کہ یہ مقدس شمع بجھ گئی ہو۔ ہر زمانے میں ہر ملک میں اور ہر قوم میں سچی خالص اور بے غرض محبت ہوتی چلی آئی ہے۔ پادری کے وجود اور نکاح کے ساتھ ان رسوم کے اجرا سے بہت عرصہ پیشتر دنیا میں سچی اور خالص شادیاں ہوتی تھیں عام رائے کے در پردہ قدرتی حیا اور دل کی محبت ہے۔ اور قانون کے ہوتے ہوئے مرضی کی سلطنت ہے۔ جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔ جہاں کہیں محبت ہے وہ خالص ہے۔ اور ہر وقت اور ہر جگہ شادی کی رسوم اس اتحاد کی تائید کرتی ہیں۔ جو انسان کے دل کے مقدس مندر میں انجام پذیر ہوا ہے۔

(۲)

(ب) کیا طلاق شدہ لوگوں کو کسی حالت میں شادی کرنے کی اجازت دینی چاہئے

اس سوال کا جواب تو اس سوال پر منحصر ہے کہ آیا نکاح کوئی جرم ہے یا نہیں۔ اگر بالفرض وہ جرم نہیں ہے تو اس پر سزا لگانے کی کیا وجہ ہے؟ کیا کوئی شخص اس امر کی نسبت میں عقلی دلائل پیش کر سکتا ہے۔ کہ کیوں ایک عورت کو جسے بغیر کسی قصور کے طلاق دی گئی ہے بطور سزا کے مجبور کیا جائے۔ کہ وہ ہمیشہ کے لیے تنہائی کی زندگی بسر کرے؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس غریب کو کسی دوسرے شخص (خاوند) کے وحشیانہ پن اور بے ایمانی کے سبب کیوں سزا دی جاتی ہے؟ یا اسی طرح کیوں کسی ایسے شخص کو جس نے شادی کے معاہدہ کو ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ نبھایا ہو لیکن اس کی بے وفا بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہو محض سوسائٹی کے مفاد کی خاطر سزا کے شکنجہ میں کھینچا جائے؟ اور اسے عمر بھر تنہا رہنے کے لیے مجبور کیا جائے؟۔

مندرجہ بالا سوال کا ابھی ایک اور رخ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ طلاق کے بعد انسانی جذبات ویسے ہی رہتے ہیں جیسے کہ طلاق سے پیشتر تھے۔ دوبارہ نکاح کی اجازت نہ دینا یا بالفاظ دیگر اسے روکنا گویا گناہ کرنے کے لیے عذر مہیا کرنا ہے۔

(ج) طلاق کا اثر فیملی تعلقات پر کیا پڑتا ہے؟

جس طرح سچی طلاق طلاق نامہ کی پشت پناہ ہو۔ اسی طرح سچا نکاح شادی کی رسوم کا پشت پناہ ہے۔ جب محبت مردہ ہو۔ یا خاوند اور بیوی آپس میں ایک دوسرے سے متنفر ہوں۔ تو دراصل ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ بات

صرف اتنی ہے کہ جس طرح شادی کی رسم اس معاہدہ کی جو ابھی انجام کو پہنچا ہے تصدیق کرتی ہے۔ بعینہ اسی طرح طلاق نامہ باضابطہ طور پر اس واقعہ (دلی نفرت) پر جو اس سے بیشتر ان دونوں کے دلوں میں واقع ہو چکا ہے۔ محض صاد کر دیتا ہے۔

سچی گھرستی زندگی سچی شادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اسی بات کے قائم رکھنے کے لیے سب سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے اگر قانون ان لوگوں کو جو آپس میں دلی نفرت رکھتے ہیں۔ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھنے کے لیئے مجبور کرے۔ تو گھریلو زندگی کی برکت کیا خاک ہوئی۔ اس قسم کا فعل شادی کے معیار کو نہایت ادنےٰ بنا دیتا ہے۔ اور گہر کی بشاش چار دیواری کو ایک تنگ و تاریک قید خانہ سے تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر ہم گھر بار کی زندگی کی محبت اور خوشی کو برقرار رکہنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں چاہیئے کہ خاوند اور بیوی کی مکمل اور پوری مساوات کو قایم رکہیں۔ جبر اور خوف کا استعمال ان کے درمیان نہ ہونا چاہیئے۔ عورت کو عدالت یا پادری کے حکم یا سوسائٹی (برادری) کے تشدد کا پابند نہ رہنا چاہیئے۔ بلکہ برخلاف اس کے اسے پوری آزادی کے ساتہہ آپ اپنی ملکہ ہونے اور آپ اپنی روح اور اپنے جسم کی شہنشاہ ہونے کی حیثیت سے بیٹھنا چاہیئے۔ گہر کی سچی خوشی جبر۔ غلامی۔ اور باطل خیالات کے ذریعہ سے کبھی قایم نہیں رہ سکتی۔ دنیا میں گہر سے زیادہ متبرک کوئی جگہ نہیں۔ اور دستر خوان سے بڑھکر کوئی مذبح زیادہ پاک صاف نہیں ہو

(د) کیا طلاق کا کلی طور پر عدم جواز جہاں کہیں بھی وہ پایا جائے۔ سوسائٹی کی اخلاقی پاکیزگی پر کچہہ اثر رکہتا ہے ؟

سب سے بیشتر ہمیں اپنی اصطلاحات کی تعریف کرنی چاہیئے۔ اخلاقی پاکیزگی

سے کیا مراد ہے؟ اس دنیا کے عقلمند آدمی اپنی فلاح وبہبودی کے ساتھ دوسروں کی بہتری بھی چاہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اصلی خوشی ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ اور اسی بات کے حاصل کرنے کے وہ درپے رہتے ہیں فلاح وبہبودی کی شرائط کے مطابق زندگی بسر کرنا اعلیٰ درجہ کا اخلاقی کام سمجھا جاتا ہے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے۔ اعلیٰ ذرائع کا استعمال کرنا سب سے بڑا اخلاقی خیال ہے۔ یا بالفاظ دیگر اخلاق چال چلن یا طرز زندگی کی تکمیل کا نام ہے۔ ایک ایسا شخص جو خوف یا لالچ کی وجہ سے کسی کی اطاعت کرتا ہے۔ نیک نہیں ہے نیکی اور اخلاق خیالی جبر کی سلطنت میں رہتے ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی شخص خیالی جبر کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ نیک ہے۔ اخلاق غلامی کا مترادف نہیں ہے۔ اور نہ جہالت نیکی کا کامل نشان ہے۔

انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی طرف رجوع کرے۔ اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا وہ دوسرے لوگوں پر کچھ بار تو نہیں ڈالتا۔ اپنی عزت آپ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی روزانہ حاجتوں کا خود کفیل ہو۔ جو شخص کہ آئیڈیل کے مطابق رہتا سہتا ہے وہ گویا نہایت ہی نیک کام کرتا ہے۔ سچے نکاح میں مرد اور عورت نہ صرف اپنے جسموں کو بلکہ اپنی روحوں کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اسی کا نام آئیڈیل شادی ہے اور اسی کو نیک یا سچا نکاح کہتے ہیں برخلاف اس کے جو لوگ اپنی روحوں کے بجائے اپنے جسموں کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ سچے نکاح میں داخل نہیں ہوتے۔ خواہ رسوم کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں۔ اور یہی فعل نیکی کے خلاف ہے۔

اگر یہ بات سچی ہو۔ تو عورت کس اصول محبت کے ماتحت داخل ہو جانے پر بچہ کے

رشتہ کو قایم رکہہ سکتی ہے؟ کیا سچی محبت کے علاوہ کوئی اور اصول ایسا ہی جو اس کام کو انجام دے سکے؟ کیا اس عورت کو روپیہ پیسہ۔ جائداد۔ بلند مرتبہ اور شہرت کی رشوت دیکر اس مقصد کو انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔ کیا اس پر بہی نیک کا لقب ایسی عورت پر چسپاں ہو سکتا ہے؟ کیا اس میں کچہہ بڑا ہی کا فائدہ ہے کہ سلطنت اور مذہب دونوں کے ہاتہوں نیکی کی خوب گت بنے؟ پہر کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ فعل بنی نوع انسان کی اخلاقی پاکیزگی پر کچہہ اثر رکہتا ہے؟

کیا ایسے ممالک ہیں جہاں طلاق جائز نہیں ہے۔ ان ممالک کی نسبت کہ جہاں جائز ہے۔ اخلاق کا کوئی اعلیٰ معیار قایم ہے؟ جہاں خاوند اور بیوی جن کی آپس کی محبت بالکل مفقود ہوگئی ہے طلاق نہیں پا سکتے۔ کیا ایسی جگہ عاشق اور معشوق پائے جاتے ہیں؟

یہ خیال کہ شادی ایک قسم ہے اور نہیں ٹوٹ سکتی۔ برائی کی جڑ معالج ہے دنیا اس عورت پر جس کے خاوند نے اس کے ساتہہ برا سلوک کیا ہی۔ اور جو اپنے خاوند کے گہر سے نکال گئی ہے۔ رحم کہاتی ہے۔ اور جب وہی عورت کسی دوسرے مرد کے ساتہ محبت کرتی ہے۔ تو دنیا اسے معذور سمجہتی ہے بعینہ اسی طرح دنیا اس خاوند پر بھی جو اس کے ساتہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اور جو اپنے گہر سے ہی نکال دیا جاتا ہے۔ رحم کرتی ہے۔ اور اگر وہ کسی عورت کے ساتہ رابطۂ محبت قائم کرے تو اسے معذور خیال کرتی ہی اس سے بڑھکر کوئی اور فعل برا نہیں ہے۔ کہ انسان اپنی بیوی کو جس کے دل میں خاوند کی محبت نہیں ہے۔ اپنے ساتہہ رہنے کے لیے مجبور کری کیا یہ ہمیشہ کا گناہ نہیں ہے؟ کیا عورت اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو

زائل کرنے ؟ کیا انتخاب کرنے میں اسکی مرضی کو کچھ دخل نہیں ہے ؟ کیا اسکی شرم و حیا کسی دوسرے کا مال ہے ؟ کیا وہ شخص جس سے اسکو دلی نفرت ہے اسی کی خواہشات کا مالک ہے ؟ کیا اسے اپنی روح کے جواہرات کی حفاظت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے ؟ کیا اخلاق اسی بنیاد پر قایم ہے ؟ اور کیا سوسائٹی کی اتنی ہی تہذیب ہے ؟ اور کیا تہذیب بذات خود اسی بنیاد پر قایم ہے ؟ کیا ایک طرف اسی ایثار نفسی اور قربانی کا نام لیکر اور دوسری طرف قسم کا حوالہ دیکر خدا کو خوش کیا جاتا ہے ؟

میرے نزدیک نہایت ہی نرم لفظ ہماری زبان میں موجود ہے اور جس سے ہمارا علم کا دائرہ نہایت ہی متاثر ہے ۔ وہ میٹرنٹی (یعنے ماں کی محبت) ہے اسی ایک لفظ پر دنیا بھر کے بنی نوع انسان کے رنج و خوشی ۔ جانفشانی اور فرط جوش کا انحصار ہے ۔ ماں موت کے سایہ میں چلتی ہے ۔ تاکہ وہ ایک دوسری زندگی دے ۔ محبت کی قربانگاہ پر وہ اپنی زندگی کو گرودی رکھتی ہے ۔ جب دنیا مہذب ہو جائے گی تو کوئی بیوی اپنی مرضی کے بغیر ماں بننا قبول نہ کرے گی ۔ اس وقت مردوں کو معلوم ہو جائے گا کہ دوسرے کو غلام بنانا دراصل اپنے آپکو قید کرنا ہے ۔ (ترجمہ)

ضیاء الدین احمد برنی

عید قرباں

کیا عجب جوشِ بہارِ عید قرباں ہو گیا
بسملوں کے خون سے ہر کوچہ گلستاں ہو گیا
مثل گل ہر غنچۂ دل کھل کے خنداں ہو گیا
سارے عالم میں خوشی کا ساز و ساماں ہو گیا

محفل عیش و طرب ہر جا مہیا آج ہے
اک ہمارا خانۂ دل ہے کہ جو تاراج ہے

اک طرف جو برسرِ حسینوں کا ہے با انداز و ناز
اک طرف کوئی بنا محمود اور کوئی ایاز
جانبِ مسجد نمازی ہیں رواں بہرِ نماز
دیدۂ بینا میں اپنے محو شانِ بے نیاز

ہوں زمانے میں تو قربانی کی خوشیاں اک طرف
اور دلِ بسمل کسی کا خوں میں غلطاں اک طرف

باعثِ جمعیتِ خاطر ہیں احباب اک طرف
بزمِ رنگیں میں ہے دورِ بادۂ ناب اک طرف
غم کا ساماں اک طرف شادی کا اسباب اک طرف
اک طرف شاداں ہے دنیا کوئی بیتاب اک طرف

پر مزا ہی عید کا کیا ہے نہ جبتک دید ہو
دوست کا ماتم ہو جس گھر میں وہاں کیا عید ہو

عید قرباں کی ادا پر ایک عالم ہے نثار
لوٹنا قدمیکا کر دیتا ہے دل کو بیقرار
کیا کریں کچھ اپنا قابو ہے نہ اپنا اختیار
جان قرباں کر کے دکھلا دیتے ہم تو جو یار

کیا کہیں جو کچھ ہے غم سے اضطرابِ دل کا حال
زیرِ خنجر بھی نہیں ایسا کسی بسمل کا حال

عید کا ہے جشن ہر خورد و کلاں مسرور و شاد ہے
کوچہ و بازار میں شورِ مبارک باد ہے
عیش سے کاشانۂ دل سب کا آج آباد ہے
اک مکاں اپنا ہے آبادی میں جو برباد ہے

چاند ہم کو عید کا اشکل مۂ غم ہو گیا ✦ اب کے پہلے ہی محرم سے محرم ہو گیا ✦ آغا غلام حسین ۔ ارشد

سوسائٹی کا اثر بے زبان فرقۂ نسواں پر

مدت سے یہ خیال دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے کہ سوسائٹی کا یقیناً یہ ظلم ہے کہ اگر کوئی عورت دھوکہ سے بھی ایک دفعہ صراط مستقیم سے بھٹک جائے تو وہ قابل نفرت اور مرد وہڑلے سے جو چاہے سو کرے۔ حالانکہ قانون فطرۃ اور شرع ہمکو روز روشن کی طرح بتا رہا ہے کہ جو احکام مردوں پر نافذ ہیں وہی عورتوں کے لیے۔ پھر کیا وجہ کہ ہم قانون فطرۃ اور شرع کے خلاف عمل پیرا ہیں۔

کس قدر اندھیر اور صریح ظلم ہے کہ ہم علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک مرد دنیا کے امراض خبائث میں مبتلا ہے اور زمانہ بھر کا آوارہ گرد مشہور ہے اگر وہ یہ کہے کہ میں نے افعال شنیعہ سے توبہ کر لی اور آیندہ ایسے افعال قبیحہ کا مرتکب نہ ہونگا تو محض دولت کی وجہ سے حسین سے حسین لائق سے لائق لڑکی کو اس کے والدین اس کے عقد میں دینے کو موجود۔ مگر وہ لڑکی جو تعلیم یافتہ ہے حسین اور پاکباز ہے محض مرد کی چاپلوسانہ گفتگو اور جھوٹی محبت کے سحر سے مسحور ہوکر (جسکو وہ جانتی نہ تھی کہ یہ آیندہ چل کر دغا کرے گا) اگر بغیر ازدواج شرعی کے مرد کی منت وخوشامد سے طرح طرح کے سبز باغ دکھانے سے بناہے کی قسمیں کھانے سے راہ مستقیم سے بھٹک گئی تو سوسائٹی اس کو سخت حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور وہ ملنے جلنے کے قابل نہیں رہتی۔

خدا لگتی کہنا۔ عورت کا برباد کرنے والا۔ اس کو صراط مستقیم سے بہکانیوالا

اُس کی خوبیوں کو غصب کر لے والا۔ اسکو چاہ ذلت میں گرانے والا۔ صرف مرد ہی تو ہے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے تو ستم ہے کہ خود ہی ایک فعل کا سبب ہو اور پھر اس کی مخالفت کرے۔ اگر قانون فطرۃ مردوں کو عورتوں پر حکومت کی اجازت دیتا ہے تو کیا یہ نہیں کہتا کہ عدل کو ہاتھ سے نہ دو۔

اگر باعتبار ضروریات مقابلہ کیا جائے تو مرد عورت مساوات کا درجہ رکھتے ہیں۔ بدصورت سے بدصورت مرد کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ حسین سے حسین عورت کا مالک ہو۔ علیٰ ہذا عورت کی بھی یہ خواہش ہے کہ وہ بھی حسین سے حسین مرد کو اپنا رفیق ابدی بنائے۔ کیا اسکو محبت کی خواہش نہیں۔ کیا اسمیں قدرت نے شاعرانہ مادہ نہیں رکھا۔ کیا اسمیں جذبات نہیں ہیں اُس کا جی نہیں چاہتا کہ اپنا درد دل کسیکو سنا کر اوس سے داد چاہے گو عورت کے خواہشات مرد سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی کس قدر صابر بیٹھی ہے کہ باوجود اپنی تعلیم۔ حسن۔ اخلاق کے دم نہیں مارتی اور اپنی عزیز زندگی اوسی کے ساتھ تمام کر دیتی ہے جس کے ہاتھ میں والدین ہاتھ دیدیتے ہیں۔ اگر بالفرض محال کوئی لڑکی اپنی آیندہ تقدیر سے خوف زدہ ہو کر والدین کو اطلاع دیتی ہے کہ یہ تعلق مناسب نہیں تو اُسکو دریدہ دہن۔ بے حیا۔ بے شرم۔ خاندان کا نام ڈبونے والی۔ کے خطابات دیئے جاتے ہیں۔ والدین بیزار اور متنفر نظر آتے ہیں۔

شرع میں قبل از شادی۔ مرد عورت کا آپس میں دیکھ لینا مستحب قرار دیا گیا ہے تاکہ بعد عقد جوتیوں میں دال نہ بٹے۔ پر کیوں اِس سے سراسر غفلت اور لاپروائی کیجا رہی ہے۔ حالانکہ ہم صریح دیکھ رہے ہیں

کہ جانبین میں سچی محبت ہے۔ اور ایک دوسرے کو اس کا بیدر رہا ہے
کہ حسب منشا مینی خوشی عقد ہو جائے تو بقیہ زندگی نہایت آرام و آسایش
میں گذر جائے مگر ہندوستان کا یہ کیسا دستور ہے کہ جہاں والدین کو
یہ معلوم ہوا کہ جانبین میں محبت و الفت ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ
اس عقد مناکحت سے دونوں کی زندگی قابل اطمینان ہوگی۔ تو محض
اس وجہ سے کہ کم بخت "محبت" ہے (کیا اچھا ہوتا کہ اس کا وجود ہی
نہ ہوتا) ضرور ایک دوسرے کو جدا کر دیں گے اور کسی اور کے گلے منڈھ دیں
گے۔ بعدہ کیسے ہی خوفناک نتائج کیوں نہ پیدا ہوں۔ اور وہ قبل از وقت
دنیا سے ہی کیوں نہ سدھاریں۔ محض اس جرم پر کہ آپس میں سچی محبت
کیوں کی۔ یہ گویا اس سچی محبت کی سزا ہے جو والدین کے ہاتھوں
مل رہی ہے +

ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ والدین اپنی اولاد کی فلاح اور بہبودی کے
خواہاں ہیں۔ لیکن بعض اوقات وہ بجائے راحت و آرام کے ان کے
حق میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ والدین کی محبت کافی
نہیں ہے اس لیے کہ ہم اکثر خیالات ان سے پوشیدہ رکھتے ہیں
اور ان کے اظہار کا بظاہر کوئی موقعہ ہی نہیں رکھتے اس لئے وہ
ہمارے ساتھ پورے طور پر ہمدردی ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔
لیکن خرابی یہ ہے کہ اگر بیان بھی کر دیں تو ہم کو وضاحت سے بیان
کرنے میں سوسائٹی اور حیا مانع ہے۔

اسی خلش کے رفع کرنے کے لیے کہ ایسی عورت کی قدر کیوں نہ کیجائے
جو دائرہ مستقیم سے باہر قدم دہرنے کے بعد راہ راست پر آتی ہو

بہت ساری کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ ہم یہاں چند مثالیں لکھتے ہیں۔

مثلاً ایک یونانی فلاسفر کہتا ہے، عورت ایک ایسا پہول ہے جسے ایک ہی سونگھہ سکتا ہے۔ دوسرے کے سونگھنے سے اسکی وہ آب وتاب باقی نہیں رہتی"۔

ایک ہندی فلاسفر اس سے بہی بڑھکر کہتا ہے، عورت کی آب اور حرمت صرف اُس کی نگاہوں اور اُس کے ہاتہوں ہی میں باقی اور محفوظ رہ سکتی ہے۔ کوئی دوسرا ہاتہ اُس کا ضامن اور کفیل ہو نہیں سکتا"۔

یہ مثالیں ایسی نہیں ہیں جو قابل تسلیم ہوں محض حالات سے اقتباس کی گئی ہیں۔ اس کو بہی ہم سوسائٹی کا بنایا ہوا کہتے ہیں قانون فطرت اور شارع کا حکم ایسا نہیں ہے بلکہ وہ صاف الفاظ میں حکم کر رہا ہے کہ حد جاری ہو اور دُرّے لگائے جائیں۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور ایسے افعال سے باز آئیں۔

غرض ہم اس امر کے ثبوت میں کہ عورت کو صراط مستقیم سے بہکانے والا مرد ہے۔ اخبار المؤید سے ایک آرٹیکل نقل کرتے ہیں "جو غرفۃ الاحزان" کے عنوان سے شائع ہوا تہا جس سے عورتوں کی بے گناہی کا سچا ثبوت دستیاب ہوتا ہے۔ حالانکہ اس قبیل میں عورتوں سے زیادہ مرد سزاوار سزا ہیں۔ پہر عورتیں کیوں قابل مواخذہ سمجہی جاتی ہیں اور مرد بری +

"کہتا ہے (قاہرہ) میں میرا ایک دوست تہا میں اُس کے صلاح اور پرہیزگاری سے بڑھکر اوس کی لیاقت اور حسن اخلاق کا گرویدہ تھا۔

اس کے بعد مجھکو کوئی ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ میں یہ دریافت کرتا کہ اُس کے چال چلن کیسے ہیں۔ اور اُس کی عبادت کا کیا ڈھنگ ہے۔ فاسق ہے یا پاکباز۔ زاہد ہے یا رند۔ کیونکہ مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اُس سے علوم شریعت پڑھوں۔ یا اخلاق کا سبق لوں۔ یقیناً میں اسبات کو سمجھ چکا تہا کہ محبت کرنے کے لیے جو کچھ کہ میں نے اندازہ لگایا تہا وہ کافی بلکہ کافی سے زیادہ تھا۔

اسی طرح ہماری دوستی اور محبت میں ایک زمانہ گذر گیا۔ نہ کبھی میں اُس کو کسی بات سے رنجیدہ کرتا۔ نہ کبھی وہ کسی ناشائستہ حرکت سے صدمہ پہونچاتا یہاں تک کہ میں قاہرہ سے ایک دور و دراز سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔ تاہم ہماری مراسلت برابر جاری رہی۔ مگر پہر ہماری مراسلت بند ہو گئی جبسے میرے دلمیں اُس دوست کی نسبت وہی خیالات و شکوک پیدا ہونے شروع ہوئے جو ایسی حالت میں جیسے کچھ کہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور پیدا ہونا ضروری ہیں۔ پہر میں قاہرہ واپس آیا۔ اور پوری ہمت و کوشش سے اُس عزیز دوست کی جستجو و تلاش جاری رکھی نشست و برخاست کے وہ تمام مقامات چھان مارے جہاں جہاں کہ اُس کا گذر ہوتا تہا۔ اور جن کو میں جانتا تھا۔ لیکن اُس کا پتہ نہ ملنا تہا نہ ملا۔ آخر میں اُس کے مکان کیطرف گیا اور پڑوسیوں سے دریافت کیا جواب ملا کہ ایک زمانہ گذرا ہے کہ وہ لوگ یہاں سے اُٹھ گئے۔ معلوم نہیں کہ اب کہاں رہتے ہیں۔ اس جواب سے میرے خیالات میں عجیب تلاطم پیدا ہو گیا۔ وڑی دیر کے لیے یاس و نا اُمیدی میں جنگ چھڑ گئی تہی اور سمجھ گیا کہ اول الذکر نے آخر الذکر پر فتح حاصل کر لی۔ اور مجھکو معلوم ہو گیا کہ میں

ادس عزیز دوست کو کہو چکا ہوں۔ اور اُس روز سے یقیناً میں اس کی تلاش کا کوئی ایک راستہ نہ پاتا تھا۔

اس وقت وفورِ غم سے میرے آنسو جاری ہوگئے۔ کیوں نہ جاری ہوتے کہ اس دنیا میں مجکو دوستوں سے بہت کم حصہ ملا تھا اور زمانے نے میرے وفادار دوست کو گم کردیا تھا اور میں آسمان کا نشانہ بن گیا جس کے تیر خطا نہیں کرتے اور جس کی نازل کردہ مصیبتیں غائب نہیں ہوسکتیں!

اس یاس و غم کی حالت میں میرے دن قاہرہ میں بسر ہونے لگے ایک روز میں تمری مہینہ کی آخر شب میں جبکہ گہر کو واپس آرہا تہا تو تاریکی کی وجہ سے راستہ بھول گیا اور ایک تاریک وحشت ناک گلی میں نکل گیا۔ جو آیند و روند سے بالکل سنسان اور خالی تہی اُس وقت کی چھائی ہوئی تاریکی و وحشت سے یہ خیال پیدا ہوتا تہا کہ یہاں یا تو جنات و شیاطین رہتے ہیں یا غول بیابانی کا مسکن ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ دو سر بلند پہاڑوں کے درمیان بحرِ اسود تلاطم برپا کر رہا ہے گویا وحشت ناک موجیں مجھکو آگے اور پیچھے بہائے لیئے جاتی ہیں یا اُٹھاتی بٹھاتی ہیں +

میں اسی پریشانی اور حیرت میں تھا کہ قریب کے کسی ایک مکان سے ایک دردناک چیخ کی آواز سنائی دی۔ اور مجھے غور و فکر لاحق ہوا کہ یہ آواز کدہر سے آئی۔ پہر وہی آواز مکرر سنائی دی۔ اس کے بعد اون دردناک آوازوں کا تانتا لگ گیا۔ جنھوں نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر پیدا کیا۔ میں بول اُٹھا یا للعجب! اس سیاہ رات کے سینے میں کتنے مایوسوں کے اسرار اور غم زدوں کے راز پوشیدہ ہیں

میں نے خدا سے اقرار کر لیا کہ اگر میں اس غمزدہ کو پاؤں تو ضرور اُس کی
ہمدردی میں چاہے وہ کوئی ہو کبھی دریغ نہ کروں - اور اُس کے لیے
کوشش کروں - بشرطیکہ وہ معاملہ میرے بس کا ہو - ورنہ آنسو بہانے
میں تو مجھے کبھی تامل نہو گا - پھر میں آواز پر پتہ لیتا ہوا اوس گھر پر
پہونچا جہاں سے کہ یہ دردناک آواز آرہی تھی - دروازہ کو کھٹکھٹایا -
تھوڑی دیر کے بعد ایک کمسن لڑکی جس کی عمر دس سال سے زیادہ
نہ ہوگی جس کے ہاتھ میں ایک دھندلی روشنی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تھا
اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی آئی - گویا ماہ کامل ابر کے پھٹے
پھٹے بادلوں میں گھرا ہوا ہے - جسکو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا - میں نے
پوچھا حور کے بچے کیا تمھارے گھر میں کوئی بیمار ہے ؟ میری اس
سوال پر اس نے ایک دردناک چیخ ماری جس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں
اوس ننھے دل کے پرزے نہ ہو جائیں - اُس نے کہا اے نیک مرد
کیا تم میرے باپ کی مدد کر سکتے ہو جو عالم سکرات میں بستر مرگ پر لیٹا ہوا
دم توڑ رہا ہے - یہ کہکر وہ آگے ہوئی اور میں اُس کے پیچھے ہو لیا -
آخر ہم ایک تنگ و تاریک کمرہ میں داخل ہوئے جس کا ایک چھوٹا سا
دروازہ تھا - جب میں اُس میں داخل ہوا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم ایک
زندہ دنیا سے نکل کر مردہ دنیا میں جا پہونچے کمرہ گویا قبر ہے اور بیمار میت
میں آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر بیمار کے قریب بیٹھ گیا بیمار کی حالت نہایت
عبرتناک ہو رہی تھی اس کا جسم مشت استخواں بن گیا تھا نفس کی آمد و رفت
ایسی ہی تھی کہ جیسے لکڑی کے گنبد میں ہوا گونج رہی ہے - میں نے
مریض سے دریافت کیا کہ اب وہ کیا چاہتا ہے - میری اس آواز پر

اُس نے اپنی آنکھیں کھولدیں اور اپنی نظر میرے چہرے پر جما کر اور تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دی اور نہایت پست آواز میں یہ کہا "الحمد للہ فقد وجدت صدیقی" (خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے دوست کو پالیا)۔

میں یہ سمجھنے لگا کہ میرا دل رنج و قلق سے پہلو میں دھڑک رہا ہے میرے ہاتھ سے صبر جاتا رہا جس کو میں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ بے صبری ظاہر نہ کروں جو ایسے موقعہ کے لیے نہایت بری ہے مگر اُس وقت کا صبر کرنا میرے دائرہ اختیار سے باہر تھا کیونکہ وہ قریب مرگ تھا۔ میرے اُس غم کا اندازہ ناممکن تھا جو میرے دل میں پوشیدہ تھا۔ اور پہلوؤں میں دفن تھا۔ میری اس ملاقات نے اُس کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ حیات کو اکسا دیا۔ اُس میں کچھ توانائی آئی اور اشارہ کیا کہ مجھکو اُٹھا کر بٹھا دو۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جس کے سہارے وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور اپنا قصہ نہایت ناتوان آواز میں رک رک کر اس طرح بیان کرنا شروع کیا:۔

دس سال کا عرصہ بلکہ کچھ مہینہ زیادہ ہوتے ہیں کہ میں اور میری والدہ ایک مکان میں رہتے تھے جس کے پڑوس میں ایک امیر متمول بھی رہتا تھا اس کے مکان میں ایک دوشیزہ پری تھی میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی ایک مکان میں بھی ایسی حسین جمیل شکیل۔ زیبا۔ خوبصورت۔ حور نہ ہوگی اُس کو دیکھنا تھا کہ میرا دل ہاتھ سے جاتا رہا اور ہزار جان سے پروانہ صفت اُس کے شمع حسن کا شیفتہ و شیدا ہوگیا۔ صبر و تحمل مجھ سے سلب ہوگیا۔ رشتہ محبت قایم کرنے کے لیے ہزاروں منصوبے

لاکھوں تدبیریں کیں۔ اور اُس کے دل پر اثر پیدا کرنے کے لیے مختلف ڈھنگ سوچے۔ ایک مدت کے بعد محبت نے اپنا اثر دکھایا۔ یہ بت سیمیں آہستے رم خوردہ رام ہوا۔ اور بت نامہربان نے بھی مہربانی کرنی شروع کی فتنہ رفتہ اُس کو آئندہ زندگی کا سبز باغ دکھا کر اور عہد و پیمان کی گرہ استوار کر کے ایک دن بہلا پھسلا کر بغیر قاضی کے عقد پر راضی کر لیا ابھی تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ مجھکو معلوم ہو گیا کہ اُس کے پاس ایک ننھی اور جدید مخلوق حرکت کر رہی ہے۔ اس خبر سے میرے حواس ختہ ہو گئے۔ اور میں سوچنے لگا کہ آیا ایفائے وعدہ کروں۔ یا رسے رشتۂ الفت ہی منقطع کر دوں۔ اسی حیص بیص میں کچھ لاچیال پہلے غالب آ گیا۔ اور میں اُس مکان سے اُس مکان میں اُٹھ آیا۔ کہ جہاں ۔۔۔ دوست تو مجھ سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد اُس مظلوم ۔۔۔ کی کوئی کیفیت معلوم ہی نہیں ہوئی۔ نہ میں نے کبھی اس دریافت کی زحمت گوارا کی۔ اس حادثہ کے بعد چند سال گذر گئے ایک روز مجھے ایک خط ڈاک کے ذریعہ ملا۔ (اس وقت مریض نے تو شک کے نیچے سے جس پر بیٹھا ہوا قصہ بیان کر رہا تھا ایک خط نکال کر میرے حوالہ کیا) میں نے پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

اگر مجھے کوئی ایسی ضرورت محسوس ہوتی کہ میں پھر تمہیں اس بوسیدہ عہد و پیمان یا اُس قدیم محبت کی تجدید کرنے کے لیے خط لکھوں تو بھی میں تم کو ایک سطر نہیں بلکہ ایک حرف بھی لکھنا کبھی پسند نہ کرتی کیونکہ مجھے یہ کامل اعتقاد نہیں کہ ایسا عہد جیسا کہ تمہارا دغا بازانہ عہد تھا۔ اور ایسی محبت کہ جیسی تمہاری جھوٹی محبت تھی۔ اس امر کا

استحقاق رکھتی ہے کہ اس کی عزت کروں جس کا میں نہایت افسوس کے ساتھ ذکر کرتی ہوں۔ پھر اس کے تجدید کی درخواست کروں!

جسوقت تم مجھکو چھوڑ کر فرار ہوئے تمہیں معلوم تھا کہ میرے پہلو میں ایک آگ سی بھڑک رہی ہے اور جنین اس دنیا میں آنے کے لیے موجود ہے مگر تمھارے اس بھاگنے کے دو سبب تھے ایک یہ کہ تمکو ان مصیبتوں کے دیکھنے کی آفت نہ پڑے جو تمھاری لائی ہوئی تھیں۔ اور تمھارے ہاتھوں کو ان آنسوؤں کے پونچھنے کی مشقت نہ اٹھانی پڑے جو تمھارے ہی جاری کیے ہوئے تھے۔

اس کے بعد میں تمکو ایک شریف انسان سمجھ سکتی ہوں؟ نہیں بلکہ اس کے سمجھنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتی کہ تم کو "انسان" تصور کروں تصور تو کیا انسان سے تعبیر کروں۔ اس لیے کہ یقیناً حیوانوں درندہ جانوروں۔ وحشی گزندوں کے متفرق خصائل سے کوئی ایک خصلت ایسی نہیں چھوٹی جو تمھاری ذات والاصفات میں جمع نہ کی گئی ہوں نہ ان تمام خصائل اور صفات کے تم مظہر واحد ہو۔ تم اپنے اس دعوے میں بے حد جھوٹے ثابت ہو چکے ہو جس میں تم کہا کرتے تھے کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے مگر اپنی ذات کے لیے۔ خلاصہ یہ کہ تم یہ دیکھ چکے تھے کہ میں ہی ایک ایسا راستہ اور ذائقہ ہوں جس سے عبور کر کے اور اسکو چکھکر اپنے نفس کو راضی رکھ سکتے ہو۔ اس لئے تم نے مجھ پر سے گذر کر اپنے نفس پرستی کے راستہ کو حاصل کر لیا!

اگر یہہ بات نہ ہوتی تو تم کبھی میرے پانے کے لیے کوشش نہ کرتے نہ میرے سے کوشش کرنے میں کوئی وجہہ دیکھتے تم اپنے اس وعدے میں دغابازی کر چکے ہو۔ جبکہ تم نے مجھ سے حتمی وعدہ کیا تھا کہ تم مجھ کو اپنی "بیاہتا بی بی" بناؤ گے۔ مگر تم نے اپنے اوس حتمی وعدہ کے خلاف کیا۔ اس لیے کہ تم یہہ نہیں پسند کرتے تھے کہ ایک ایسی عورت سے جو "مجرمہ" ہے، "ذلیل" ہے اُس سے نکاح کرو۔ للہ بتاؤ کہ یہہ کونسا گناہ ہے؟ اور یہہ کونسی ذلت ہے؟ یہہ تمھارے ہی ہاتھوں اور نفس کے لائے ہوئے ہیں اگر تم نہ ہوتے تو میں نہ گنہگار رہتی نہ ذلیل ہوتی۔ حالانکہ حتے الامکان میں تم سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ آخر تمھارے مقابلہ میں مجکو ہارنا پڑا اور شکست فاش نصیب ہوئی اور میں اوس بچہ کی طرح تمھارے سامنے گر کر رہ گئی جو جلیل القدر پہلوان کے مقابلہ میں بے بس ہو جاتا ہے۔ اور تم نے اس موقع کو غنیمت جانکر مجکو برباد کر دیا۔ اس کے بعد میرا نفس ندامت سے بھرپور اور دل پژمردہ ہو کر رہ گیا۔

زندگی کو الوداع اور موت کو خیر مقدم کہنے لگی۔ قیامت کا آنا برحق ہے۔ خدا کو منہ دکھانا ضروری ہے۔ للہ سچ کہنا۔ بھلا اُس عورت کو زندگی کا کیا خاک لطف مل سکتا ہے جو نہ کسی شوہر کی بی بی بن سکتی ہے۔ اور نہ کسی بچہ کی ماں۔ بلکہ دنیا کے معاشرتی جلسوں میں بھی شریک نہیں ہو سکتی۔ تمام عمر ندامت سے سر نیچا کیے باغیرت کے مارے نگاہ زمین پر

گڑی ہوئی۔ ہاتھوں سے منہ چھپائے۔ طعنہ دینے والوں اور
فضیحتی کرنے والوں کے خوف سے دل پژمردہ کیے ہوئے
حسرت سے دیکھ رہی ہو۔

تم نے میری راحت۔ میرا چین۔ میرا آرام۔ میری عزت۔ میری
حرمت۔ غرض کائنات عالم کی کل خوشی لوٹ لی۔ کیونکہ اس
حادثہ کے بعد اُس قصر سے جہاں مجھے اپنے والدین کے ساتھ
شادمانہ مسرت انگیز زندگی بسر کرتی تھی فرار ہونا پڑا۔ اور
اُن بیشمار نعمتوں کو جو میرے آس پاس تھیں اور اُس خوشحال
زندگی کو چھوڑ کر ایک دور و دراز سنسان محلہ کے ایک
حقیر جھونپڑے میں محض اس لیے نکل جانا پڑا کہ پھر مجکو
کوئی نہ پہچانے۔ اور اس طرح بقیہ زندگی کس مپرسانہ حالت
میں تمام ہو جائے۔

تم میرے والدین کے بھی قاتل ہو کیونکہ مجھے تحقیق طور پر
معلوم ہوا ہے کہ وہ میرے فرار ہونے کے بعد مر چکے ہیں
اور میں یقینی سمجھتی ہوں کہ وہ صرف میرے ہی کھوئے جانے
اور میرے ہی دیدار کی آرزو اور تمنا میں قبل از وقت چل بسے
فقط اس لیے کہ میں اُن کی اکلوتی اور نازونکی پالی لڑکی تھی۔

تم میرے بھی قاتل ہو کیونکہ زندگی کا وہ تلخ پیالہ جو میں نے
تمھارے ہاتھ سے چکھا یعنی طول غم والم جو تمھاری وجہ سے
مجھے نصیب ہوا ہے میرے جسم و روح پر اس طرح اثر کر رہا
ہے کہ اب میں ایک دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح بستر موت پر

پڑی ہوئی ہوں۔ اور سمجھتی ہوں کہ خدا نے مجھ پر مہربانی کی اور میری دعا قبول کی اور اب کہ مجھے موت جلد اس بدنصیب دنیا سے نکال کر عالم حیات (ابدی) اور سر در جاودانی میں پہونچائے حاصل کلام تم ایک جھوٹے مکار۔ دغاباز۔ خونخوار۔ قاتل چور۔ ہو اور میں سمجھ نہیں سکتی کہ وہ منتقم حقیقی میرا بدلہ لیے بغیر تمہیں یوں ہی چھوڑ دے گا؟

میں یہ خط تمھیں اس لیے نہیں لکھ رہی ہوں کہ تم سے پھر تجدید ایفائے وعدہ کے مداومت کی درخواست کروں۔ یا محبت کی سوگند دے کر استحکام محبت کی خواہش ظاہر کروں۔ تم خود اتنی سمجھنے کی قابلیت تو ضرور رکھتے ہو کہ تمھارے متعلق میرے دل میں کیا کیا خیالات ہوں گے؟ سوا اسکے اس وقت میں قبر کے دروازہ پر کھڑی ہوں۔ اس زندگی اور اس زندگی کی تمام بھلائیوں۔ برائیوں۔ خوش نصیبیوں اور بدنصیبیوں کے موقف وداع (جائے رخصت) پر کھڑی ہوں۔ اور میں تمکو یہ خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میرے پاس تمھاری ایک امانت ہے جسکو تم بھول گئے۔ وہ امانت مجھے پھیر دینی ضرور ہے یعنی "وہ تمھاری لڑکی ہے" اگر تمھارے دل میں کچھ بھی پدرانہ شفقت ہے تو چلے آؤ۔ اور اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہو وہ بھی اس بدنصیبی میں حصہ پائے جو اس سے پیشتر اس کی ماں پا چکی ہے"

جب میں یہ خط پڑھ چکا تو اپنے دوست کی جانب نظر کی۔

دیکھتا کیا ہوں کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں میں نے
پوچھا کہ کہئیے اس خط کے وصول ہونے کے بعد کیا ہوا۔ بولا!
اِس خط کے پڑہنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے
پہلو میں بادل کی سی گرج پیدا ہوگئی اور وفور اضطراب اور غم سے میرا
دل وسینہ پھٹ رہا ہے۔ فوراً خط کے پتہ پر مکان کی طرف روانہ
ہوگیا اور وہ مکان یہی ہے کہ جہاں تم مجھے اس وقت دیکھ رہے ہو میں نے
اُس مظلوم کو اس حجرہ میں جس میں اس وقت میں ہوں جسم بے جان
مردہ پایا۔ اور اس لڑکی کو اُس کے بازو میں بیٹھے ہوئے نہایت
تلخ آنسو بہاتے اور روتے دیکھا۔ اس عبرتناک سین کو دیکھکر مجھے غش
اور چکر آگیا اور اوسی عالم غشی میں میرے تمام جرائم مجھے وحشی درندے
سانپ بچھو ہوکر ڈسنے لگے جب مجھے افاقہ ہوا تو میں نے خدا سے
پختہ عہد کرلیا کہ (جب تک میں زندہ رہوں گا) اس حجرہ سے
باہر نہیں نکلوں گا جس کا نام میں نے "غرفۃ الاحزان" (ماتم کدہ)
رکھا ہے۔ میری زندگی بھی اسی کی طرح پژمردہ ہوگی۔ اور میری تقدیر
بھی اُسی کی طرح یکسانہ ہوگی۔ اور آج میں بے انتہا جوش اور مسرت
کے ساتھ مرتا ہوں اور میرا دل مجھے بتا چکا ہے کہ ان رنجوں اور
ان بدنصیبیوں کے سبب جو میں اُٹھا چکا ہوں خدا نے میرے تمام
گناہوں کو معاف کردیا۔

جب سلسلہ سخن اس کا یہاں تک پہونچا تو اُس کی زبان میں لکنت پیدا
ہوگئی۔ چہرہ زرد پڑگیا اور بستر مرگ پر یہ کہتے ہوئے جان دی۔
(افتی یا صدیقی) اے میرے دوست میری لڑکی اب تری حوالہ ہے۔

میں اس کے بازو میں ایک گھنٹہ کامل تک اسی رسم کو ادا کرتا رہا جو ایک دوست دوسرے دوست کے لیے ایسے موقع پر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کے دوسرے دوستوں شناساؤں کو اسکی موت کی مختصر کیفیت سے اطلاع دی۔ سب جمع ہوئے اور اس کو آخری منزل تک پہونچا آئے۔ اور میں نے کبھی عورتوں۔ مردوں کو آجکی طرح اس قدر روتے ہوئے نہیں دیکھا۔

قارئین سچ سمجھنا۔ میں اسوقت یہ واقعہ لکھ رہا ہوں مگر میرا دل رونے سے نہیں تھمتا۔ اور میں جب تک زندہ رہوں گا اس کے الوداعی الفاظ کبھی میرے دل سے نہیں نکلیں گے: "انیتی یا صدیقی

اے مضبوط دل والے مرد۔ اِن کمزور طبیعت والی عورتوں پر رحم کرو جب تم اُن کی عزت۔ عفت۔ عصمت۔ کو لوٹتے ہو تو تم یہ نہیں خیال کرتے کہ تم کیسے معصوم اور شریف خون کا ستیاناس کر رہے ہو۔

کیا اس قدر واقعات سے بھی ہم میں احساس نہیں پیدا ہوتا جو ہم آئے دن کمزور فرقہ پر ظلم و زیادتی کر رہے ہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ زمانہ جاہلیت کی طرح لڑکی پیدا ہونے کے ساتھ ہی زندہ دفن کر دی جائے۔ تاکہ سوسائٹی کا اثر اُن پر نہ پڑے اور ہم صدہا گناہ کا ر نہ بنیں۔ حالانکہ ہمارے ان گناہوں کی انتہا نہیں ہمارے نامہ اعمال میں نقطۂ موہوم کو سپیدی باقی نہیں۔ للہ کمزور بے زبان فرقہ پر رحم کرو۔ انہیں اُن کے جائز حقوق عطا کرو۔

اے سوسائٹی اور اس کے قانون کے بنانے والو جس کی آنکھیں کھولو دیکھو بھالو۔ کہ ہماری وجہ سے عورتوں پر کیسے کیسے مظالم ہو رہے ہیں۔

یادِ نذیر

ہاں اے غروبِ مہر و مہ — اے جاذبِ تارِ نظر
دیکھوں تجھے شام و پگہ — ہو آہ لب پر چشم تر
مژگاں ہو میری خونچکاں

اے سرخیِ رنگِ شفق — اے مرغزارِ آسماں
خورشید کا کیوں منہ ہے فق — چہرہ سے ہی جو یوں عیاں
کیا دل میں ہے دردِ نہاں

اے روشنیِ صبحدم — اے پیکرِ نورِ ضیا
کیا ہے قمر کو رنج و غم — چہرہ ہے جو اترا ہوا
کہہ مجھ سے اپنی داستاں

جو شے ہے حسرت خیز ہے — جو چیز ہے سنسان ہے
کب دل ہی فرحت ریز ہے — ہر عضو گر بے جان ہے
ماتم کدہ سا ہے جہاں

کیوں ہے فسردہ قلب و جاں — کیا ہو گیا جوشِ طرب
پژمردہ ہے جو ہے جہاں — سب مٹ گیا شور و شغب
کیوں روح ہے میری تپاں

ہاں اے نذیرِ بے وفا — کیوں پھیر لی ہم سے نظر
ہم سے ہوئی تھی گر خطا — تو اسکو کرتا درگذر
تو قطرتاً تھا مہرباں

تیری محبت بے ریا — تیری اعانت برمحل

تیری صداقت برملا تھی بزم میں ضرب المثل
لیکن ہے اب اک داستاں

دلسوز تھا ہمدرد تھا۔ ہوتا تھا تجھ سے دور غم
محفل میں اپنی فرد تھا مشہور تھا تیرا کرم
پورا ہو کیوں کر یہ زیاں

تو کیا چھپا راحت چھٹی تو کیا گیا تسکیں گئی
عشرت چھٹی راحت چھٹی رونق گئی تزئیں گئی
سونی ہے بزم دوستاں۔

عجلت تجھے آخر تھی کیا جو چل دیا منہ موڑ کر
لی تو نے کیوں راہ فنا الفت کو سب سے توڑ کر
کیا ہیں وہاں آسانیاں؟

تعمیر ہے کیا خلد کی بہتر وطن کی خاک سے
کیوں مٹ گئی وابستگی گھر کے خس و خاشاک سے
اچھا ہے کیا باغ جناں

کیسے کہوں تو خود کیا تھا تو تو شیدائے وطن
پھر کیا ہوا کیوں کر ہوا بلبل سے چھوٹا کیوں چمن
ایسی کشش کیا ہے وہاں؟

جانے کو تم جاؤ اجی اتنا سمجھ رکھو مگر
بس دن گذرتا ہے کوئی تم سے ملے یہ نوحہ گر
اور ہو گلہ نوک زباں

ہاں اے بس تر ہمنواں پوری ہو جبتک آرزو.

ہو نوحہ خواں، گرم فغاں ــــ سوکھے نہ آنکھوں کا لہو ÷ ہو تربت پہ تو گلفشاں۔

نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری

مکتوبات میر قمر الدین خانؒ

(آصف جاہ اول)

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب حقی - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی -

کچھ مدت پہلے جب میں مشہور تاریخی شہر دار الظفر بیجاپور کے متصل سرکار عالی متعالی کے قصبہ لنگسگور کی نواح میں شکار کھیل رہا تھا - ہماری چھوٹی سی جماعت میں اس تعلقہ کے ایک رئیس بھی شامل تھے جو شکار کی تلاش اور اس کا پیچھا کرنے میں باوجود کبر سنی ہم سب سے زیادہ سرگرم اور انہمک تھے - بس تو ان کی اس طرح کی مستعدی اور ساتھ ہی دوست نوازی کے سبب سے ہمیں نہ صرف جی بھر کر شکار مل جاتا تھا بلکہ اور بھی چھوٹے موٹے کام بآسانی نکل آتے تھے - چنانچہ زیادہ تر انہی کی کوشش سے چند قلمی کتابیں میرے ہاتھ لگ گئیں - ایسے نسخے اب دن بہ دن عنقا ہوتے جاتے ہیں - ان میں سے ایک وہ تھی جس کا نام میں نے اپنی طرف سے ٹھیرا کے اس مختصر مضمون کی سرخی قرار دیا ہے - میں سمجھتا ہوں میری لاپروائی جب تک بھی جاری رہتی یہ نایاب نشانات بھی جن کا تعلق اس عہد کے بعض تاریخی واقعات سے ہے جس میں وہ قلم بند کئے گئے تھے ویسے ہی چھپے رہتے جیسے کہ اب تک رہے میرے پاس پہونچکر بھی جو یہ کچھ عرصہ ظاہر نہ ہو سکے اس کی وجہ یہ ہوئی

کہ یہ ایسی ایک تصنیف کے ساتھ مجلد کے آخر میں منسلک کر دیے گئے تھے کہ جس کی اس زمانہ میں کتب سے اٹھنے کے بعد ذرا کم ہی تلاش ہوتی ہے یہ ایک محمد تاج الدین متخلص بہ بہجت کی لکھی ہوئی چمنستان معنی بہجت بیان۔ یعنی گلستان سعدی کی شرح ہے۔ جو ایک سو بہتر ورق صفحہ (۱۱½ × ۸½) پر تمام ہوئی ہے۔ اس کے نام سے اس کی تالیف کا ۱۱۲۶ھ نکلتا ہے موجودہ نسخہ مگر اس کے سترہ برس بعد ۱۱۴۳ ہجری میں حافظ محمد فضل اللہ ولد مرزا حیم قاضی کے ہاتھ سے بمکان اودونی صوبہ دار الظفر بیجاپور نقل ہوا۔ یہاں سے اسی کاتب کے قلم سے لکھے ہوئے چار صفحہ اور ہیں جن کی سرخی از کتاب سفینۃ النجات مولانا اسلمی صاحب سلمہٗ ہے۔ اور اب ان کے بعد سے ہمارے مکاتیب شروع ہو جاتے ہیں جن کا شمار جیسا کہ میں نے ان کو گنا اٹھاسی ہے۔ یہ حصہ جو بالکل جدا ہے اس کا کاغذ پہلے حصوں سے زیادہ پتلا خط ملتا جلتا مگر صاف تر نستعلیق ہے۔ شروع جہاں سے ہوا وہاں اور جہاں تمام ہوا وہاں اس کا کوئی نام وغیرہ ایسا لکھا ہوا نہیں ہے جس سے غور سے مطالعہ کیے بغیر اس کا کچھ پتہ چل سکے۔ سر صفحہ پر یا فتاح لکھا ہوا ہے جس کے نیچے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور پھر پہلا رقعہ شروع ہو جاتا ہے۔ آخر میں اٹھاونویں صفحہ پر آخری خط ان الفاظ میں کہ مجموع نہ ہزار سوار و یازدہ ہزار پیادہ ملازم سرکار نظر بر جمیع اخراجات سابق و لاحق کہ نمودہ میشود و نظر بر مداخل نمودہ میشود و تحریر رسید۔ یکایک ختم ہو جاتا ہے گویا نقل ادھوری چھوٹ گئی۔

اس وقت تک میں نے اس حصہ کے پہلے چالیس مکتوبات کو کسی قدر تفتیش سے پڑھا ہے۔ ان میں جو جو حالات پائے گئے اور جو بالعموم

دکن کے مہمات سے وابستہ ہیں ان کو ہم عصر واقعات سے جو بعض مروجہ تاریخی کتابوں میں ثبت ہیں. جب کہ مقابلہ کے لیے یہاں مل سکیں ملانے سے یہ صاف طور سے روشن ہو جاتا ہے کہ یہ ابتدائی منشآت بلکہ عرضداشتیں وہیں جو میر قمر الدین خاں آصف جاہ اول نے روشن اختر محمد شاہ بادشاہ غازی کی خدمت میں گذرانی تھیں۔ اور جب اُن اشخاص کا پتہ چلتا ہے جن کے نام ان میں واقع ہیں. (مثلاً خود میر قمر الدین کا جو اکتیسویں مکتوب میں اس طرح ادا ہوا ہے کہ عرضداشت کمترین راسخ العقیدت قمر الدین باداے آداب بندگی الخ) تو پایۂ ثبوت اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ غرض یہ مجموعہ صرف اس قابل ہے کہ اس سے اس زمانہ کی جب کہ ہندوستان میں مرہٹوں کے دور دورہ کا کیا کچھ آغاز ہو چکا تھا دکن کی تاریخ پر روشنی ڈالی جا سکے۔ پس اسی خیال سے اور نیز اس لیے کہ اس میں کے چند مکاتب انشا پردازی کا عمدہ نمونہ خیال کیے جا سکتے ہیں اور کیوں نہ ہو آصف جاہ اول نہ صرف اول درجہ کا مدبر بلکہ سعد اللہ خاں وزیر شاہ جہاں کے بعد سب سے بڑھا ہوا عالم اور علمی قدر شناس تھا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ جب کبھی فرصت نصیب ہو اور ساتھ ہی میرا ہاتھ ان تمام کتب تک پہونچ سکے جن سے اس پر حاشیہ چڑھانے میں مدد مل سکے تو ان تمام مکاتیب کو ایک کتاب کی صورت میں چھپوا دوں۔ لیکن۔ اس خوش وقت کے آنے تک گوارا نہ ہو سکا کہ کم سے کم پہلی عرضداشت بطور نمونہ ایسے حضرات کے روبرو پیش نہ کی جائے۔ جن کو اس قسم کی تصنیف سے کچھ بھی مذاق حاصل ہے۔

کمترین فدویان راسخ العقیدت بعد اداے آداب بندگی بذروہ عرض

باریابان حضور موفور السرور بادشاه سلیمان منزلت فلک جاه خدیو سکندر
منقبت عالم پناه قبلهٔ مقصود و کعبهٔ معبود مسند و یان صادق آبرو بخش بندهای
واثق میرساند که کفار فجار تیره روزگار بارادهٔ فاسده سر از سوراخ خرابهای
خود برآورده بطریق مستمره بعد دسیره هر طرف دویدند و جمعیتی از آنها برهانپور
را محاصره نمودند. فدوی درگاه بعزم تنبیه آنها از مقام چهاونی روانه شد عضد الدوله
را در حوالی حالنه با باجی راؤ که از اشد اشقیا است مقابله و محاربه اتفاق افتاد
و جنگ شد. الحمد لله و المنة باقبال بادشاهی تنبیه رسایافت و جمعیتی کثیر از آن
گروه گمراه کشته شدند و زخمی گشتند. از ینطرف هم چندی بشهادت رسیدند
و زخمی شدند. راو رمبهاجی ترددات شایسته نمود. پسر رشیدش بکار آمد
مردم دیگر نیز تردد نمایان نمودند. باجی راؤ از پیش عضد الدوله گریخته بجانب
برهانپور رسیده ملحق گشت. فدوی هم بجلدی به برهانپور رسیده. آن اشقیا
خواستند که از نربدا بگذرانند. از برهانپور بسرعت روانه شد آنها را فرصت
گذشتن از دریا ندا د خایب و خاسر برگشته رو بکهات کساری نهادند. بعد
برآمدن کهات و بهاره بجانب سنگمیر رفت و باجی راؤ بطرف مونگی پٹن
عضد الدوله را بتعاقب او مرخص نمود. درین ضمن سید لشکر خان و همت
یا خان و راو رمبهاجی وغیره را برسر پیره بهاره دوانید و تنبیه خوب
نمودند چند نا سرداران از اشقیا بجهنم شتافت اسپان با ساز
بدست آمدند عبرت کلی عاید کفار گشت. فدوی الحال اراده دارد که انشاء الله
تعالی بتخریب اماکن و مساکن کفار پردازد و افواج را بتعاقب مقهوران
مقرر دارد بحول قوة الهی و مدد اقبال بادشاهی سید جمال خان بهادر
و پسر عضد الدوله کانهو شقی را در برار اثر بارها تنبیه نمود لیکن در نیوا الا

بست وہفتم شہر ربیع الثانی جنگ عظمی واقع شد بفضل الہی فتح عظیم نصیب شد
تا شکستہ کردہ کفار را نحوی پیش انداختند کہ غیر از گوز یراق کار دیگر درمیان نبود۔
بسیاری تہ تیغ گشتند و بسیاری مجروح گشتند درچنیں وقت کہ ہنگامہ زد و
خورد گرم بود شام شد ناچار غازیاں عنان باز داشتند۔ الحال خبر
رسید کہ کانہو بایں حال تباہ بباجی راؤ ملحق شد۔ غلب کہ سید جمال خان
بہادر ہم با عضد الدولہ یکجا شدہ باشند وہر دو بحولہ و قوۃ الہی و اقبال
بادشاہی باتفاق بہ تنبیہ و تادیب باجی راؤ کانہو خواہند پرداخت۔ بررائے
اقدس اعلی ظاہر است ہم دکہن و تنبیہ مرہٹہ درعہد حضرت خلد مکان بچہ طول
کشیدہ بود سالہا بریں گذشت و افواج و خزاین چہ قدر بر ایں
کار صرف شد۔ الحال فدوی محض بپاس مرضی مقدس چنیں مہم صعب
را بایں مصالح قلیل اختیار کرد تا معاندان روسیاہ شوند ہر روز
نغمہ سرائیدند کہ فلانی چنین ارادہ دارد الحال فدوی بایں قسم مہم
صعب بموجب حکم مقدس پرداختہ معلوم نیست کہ چہ مے گفتہ باشند
فدوی باعتماد فضل الہی و احکام و ارشاد اقدس محض صادق فدویت
بایں کار عمدہ مشغول است آبروئے فدوی وابستہ تفضل حضرت است
در ہر باب امیدوار تفضل و دستگیری و حمایت بندہ نوازیست زیادہ
چہ عرض نماید آفتاب سلطنت و خلافت برسر فدویان تاباں و
درخشاں باد برب العباد۔

خریداران تمدن براہ کرم خط کتابت مین نمبر خریداری کا حوالہ
ضرور دین ۔

منیجر تمدن دہلی

نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے / کہتے ہیں یہ آرام گہہ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے / اٹھا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے / کس باغ کے گل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے؟
کیا بجھ گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے؟ / ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے!

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے؟
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے!

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے / غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی۔ نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاجوری ہے! / دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو۔ مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذ لحد ہے۔ زبر و زیر یہ اندھیرا! / یہ دورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر! یہ اندھیرا!
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیرا / اے گردشِ ایام! یہ اندھیرا یہ اندھیرا!

ماہِ فلکِ حسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ تری سفلہ نوازی کا گلا ہے

حسرت ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا / ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا / اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرربار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی - یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لیئے ہو کا نظارا

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر

اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر
آ آ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد ہے گو رِ غریبانہ کسی کی

آراستہ جس کے لیے گلزار و چمن تھے
جو نازکی میں داغ دہ برگِ سمن تھے

جو گل رخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ وہ گل دبے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لیے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لیے روحِ رواں تھے

محبوبِ دل خلق تھے - جاں بخشِ جہاں تھے
تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں!
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں

باقی ہیں نہ وہ باغ - نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

محمد حسین جعفری

بھائی کا خط ایک دوسرے بھائی کے نام

عزیز از جان! تمھارا خط جو تم نے اپنی آپا جان کو لکھا تھا، اگست کے "تمدن" میں میری نظر سے گذرا! مجھے تمھاری طرز بیان پر حیرت ہے! "جوش" جیسے مضمون آفرین شخص سے بڑھ جانا کوئی آسان بات نہیں۔ "بھائی کا خط بہن کے نام" پر ہم سب نے ہی غور کیا، زور ڈالا۔ لکھنا چاہا: لیکن سچ پوچھو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا! سب سے پہلے زاہدی صاحب نے اظہار خیالات کیا۔ اور جو کچھ لکھا خوب لکھا، بہت خوب لکھا! اب تم بھی پبلک میں آتے ہو، آؤ، مگر دعا ہے کہ خدا تمھیں مخالفت اور اعتراضوں سے بچائے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو تمھارے معترض کا جوابدہ میں بنجاؤنگا، اور خود سلجھ لونگا تم کچھ فکر نہ کرو! مگر ہاں ایک بات لحاظ رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ آیندہ سے اپنے مضامین "پھول" وغیرہ میں لکھو کہ نہ عیب جو نظر کا ڈر اور نہ ناکامی کا خطرہ، ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آیا! "عصمت" اور "تہذیب نسواں" میں لکھو۔ کیونکہ بے پردگی کے خیالات جب تک طبقۂ نسواں میں نہ پھیلائے جائیں گے اور جب تک وہ قیدخانہ سے باہر پردے کی حمایت کرنیوالوں کا ٹیٹوا نہیں پکڑلیں گی اُس وقت تک ہمارا تمھارا چیخنا فضول، مدعی سست گواہ چست!!

ایک اور بات سن لو، اور سنو ہی نہیں بلکہ سمجھ لو! کیونکہ کوئی غیر اگر اس بات کو پکڑ کر کچھ لکھے گا تو سب سے پہلے تو میں ہی آستینیں چڑھا کر مرنے مارنے کو تیار ہو جاؤنگا! اول تو یہ کہ تم نے "جوش" کا مضمون "بھائی کا خط بہن کے نام" غور سے پڑھا ہی نہیں! کیونکہ جو دلائل اور براہین اُس ظالم نے لکھے ہیں اُن پر تم نے کچھ نہ لکھا! یہ بھی چپنے میں ڈالو، زاہدی صاحب بھی اُن دلائل پر کچھ بحث نہ کرسکے؛ تو پھر تم نے بھی نظر

انداز کیا تو کیا بیجا کیا! افسوس تو یہ ہے کہ تم اور پروفیسر زاہدی۔ دونوں اس مضمون کا مفہوم نہ سمجھے تم نے جو کچھ لکھا ہے۔ قید، اور جہنم کی تصویر پردہ کو تسلیم کر کے لکھا ہے یعنی انتہائی درجہ کے پردہ کی مخالفت کی ہے حالانکہ جوش صاحب نہ اس کے حامی تھے اور نہ انہوں نے کہیں ظاہر کیا وہ جس معتدل پردہ کی حمایت کرتے ہیں اُس پر بحث ہوتی۔

تم نے اپنے مضمون میں یہ غضب ڈھایا ہے کہ جس پردہ کی حمایت جوش نے کی ہے اُسکی نسبت لکھ مارا کہ "اچھا ہوا کہ مذہب کو معرض بحث میں نہیں لائے" اور "نہ وہ منجانب اللہ ہے" وغیرہ وغیرہ مذاق کرنا تم کو نہ علم القرآن سے آگاہی، نہ علم حدیث سے واقفیت (اور تمکو کیا ہم میں سے ایک کو بھی نہیں!) جو کچھ ادہر اُدہر سے سُن لیا، لے بھاگے اور گرہ باندھ لیا! پھر اس ہلدی کی گرہ پر پنساری بن بیٹھنا درست نہیں! عزیزم بس لو، اور سمجھ لو کہ ایسے بے سوچے سمجھے دعوے کر دینا اچھا نہیں اور خصوصاً مذہب کے کسی مسئلہ میں! جو پردہ سسٹم ہندوستان میں رائج ہے یعنی قید اور جہنم کی تصویر البتہ اس کا ثبوت کلام پاک میں نہیں ملیگا اور نہ وہ حکم خدا ہے۔ مگر سچ پوچھو تو جوش نے اس پردے کی حمایت ہی نہیں کی، جس معتدل پردہ کی وہ حمایت کرتے ہیں، اور جن لفظوں سے کرتے ہیں اُس کا مطلب مختصراً یہ ہو سکتا ہے کہ شریف عورتیں بزرگوں اور شوہروں کی اجازت سے جایا کریں، اور جہانتک ہو سکے اپنا منہ وغیرہ لوگوں سے چھپایا کریں!

اس کا پہلا حصہ یعنی اجازت لینا تو ادب اور تہذیب کا مقتضا ہے اسکو پردہ سے زیادہ تر تعلق نہیں، رہا آخری حصہ یعنی مُنہ چُھپانا اُسکی نسبت خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ "اے پیغمبر! مسلمان عورتوں سے کہدو کہ ...... اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ کریں ...... اور اپنے سینوں پر دوپٹے کے بُکل مارے رہا کریں" (دیکھو پارہ ۱۸۔ سورۂ نور رکوع ۴) اس کے علاوہ ایک اور جگہ آنحضرت کی ازدواج مطہرات سے علیحدہ رہنے کا حکم دیتے ہوئے سب لوگوں سے فرماتا ہے کہ "اور جب ان سے کوئی چیز تمہیں مانگنی ہو تو پردہ کے باہر ان سے مانگو۔ اس سے تمہارے دل اُن کی طرف سے خوب پاک صاف رہیں گے اور اسیطرح اُن کے دل بھی" (دیکھو پارہ ۲۲

سورۂ احزاب رکوع ۷) پر آگے چلکر خدائے پاک نے بالکل صاف لفظوں میں حکم دیدیا ہے کہ "اے پیغمبر! اپنی بیویوں اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالبًا یہ الگ پہچانی جائینگی اور کوئی چھیڑیگا نہیں" (پارۂ ۲۲ سورۂ احزاب رکوع ۸)

ان آیتوں سے منہ چھپانا تو الگ رہا ایک حد تک یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بالکل آزادی کیسی ہے جس استعمال طبع کا خوف ہے جسکو پروردگار عالم نے کیسے معنی خیز اور عمدہ الفاظ میں صاف ادا فرمایا ہے!

اب میرا تمھارا منہ نہیں کہ ایسے ناطق احکام کی موجودگی میں ہم دعویٰ کریں کہ ہم نیک طبع ہیں تو کچھ بھی نہ ہوگا! گویا ہم اور تم خدا سے زیادہ واقف ہیں! خیر اس ذکر کو چھوڑ دو، مگر اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ مذہب کو کبھی بھولکر بھی معرض بحث میں لانے کی جرأت نہ کرو اور نہ ایسا دعویٰ ہی کیا کرو! میں تو اس کا لحاظ ہمیشہ رکھتا ہوں!

تم جانتے ہو کہ میں (اور میں ہی نہیں بلکہ ہماری پارٹی کا ہر شخص) پردے کا جانی دشمن ہوں مگر تمھاری "آپا جان" پردہ کی مجسم وجان ہیں آئے دن مجھ سے اور اُنسے بحث ہوتی رہتی ہے اور مذکورہ بالا آیتیں بھی اکثر انہوں نے ہی میری تردید میں پڑھی ہیں اور اسی وجہ سے مجھے یاد ہوگئی ہیں! ایکدن اثنائے بحث میں ہم لوگوں کی حالت پر بعض طعن کی بوچھار کرتے کرتے تمھاری "آپا جان" نے ایک رباعی پڑھی تھی! چونکہ تھی نہایت اچھی مجھی یاد ہوگئی! تم بھی سن لو:-

جنکو ہر وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال غور سے دیکھا تو لے ذوق ہے اُنکا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

کیا لکھوں کہ تمھارے اس خط نے جس کا میں جواب لکھ رہا ہوں تمھاری "آپا جان" کے ساتھ کیا کام کیا! وہ ایسی بگڑیں ایسی بگڑیں کہ الحذر اور بندے اسیری جو شامت آئے تو میں بھی کمبختی کا مارا اس وقت گھر میں جانکلا پھر کیا تھا، جہاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئیں اور تمھاری تحریر پر سیکڑوں اعتراض کرڈالے کتنے ہی اعتراضوں کا جواب میں نے اچھی طرح دیدیا اور

اور کئی ایک کا مطلب خبط کر دیا کہ بات کہیں کی کہیں چلی گئی! اُنکی تقریر تو بڑی طول
طویل تھی مگر میں اُن کے بعض بعض اعتراضات تمھیں سنانے کے لیے لکھتا ہوں:-

(۱) اسوقت تک وہ مفید ہوا ہی اسکو بھائی جان مانتے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے اگر ایک شخص
ایک ایسی چیز کی تعریف کرے جس کا مفید ہونا تسلیم کیا جاچکا ہو، اور پھر اسکی تعریف دوسرا
شخص بھی کردے؛ تو کہدیا جائے کہ جسپر تجھے فخر ہے وہ مری تنگ ہے!!
ہاں بھائی جان وہ تنگ نشت سہی، مگر کیوں؟ اس لیے کہ مری سہیلی کا بھائی اسکی
تعریف کرتا ہی اسلئے کہ وہ اسپر فخر کرتا ہی! اس لیے کہ پردہ فائدہ مند بقول آپکے ثابت ہو؟

(۲) "پردہ در اصل پیوندی جامۂ کہنہ کا ہے آج اسے اٹھا دیں تو فوراً عیب کھلجائیں اس لیے کہ جن
لوازمات کی ضرورت ہے وہ مفقود ہیں" نتیجہ نکلا کہ پردہ نکرنا چاہئے یہ تو فرمائیے کہ لوازمات ضروری
بھی تو مہیا کر لیے جاویں یا پہلے ہی سے آب نہ دیدہ موزہ کشیدہ، پر عمل کر کے، پردہ اٹھا دیا جائے
جو عیب کہ اٹھادینے سے کھل جائینگے وہی تو مانع ہیں! اسی سے تو ہم لوگ پردہ کرتے ہیں۔
خود اس دلیل پر قائل ہوئے یا نہیں؟ (اس بات کا جواب تمھاری آپا جان کو ہی کچھ نہ دے سکا!!)

(۳) "جبتک تعلیم نہو ہر زن و مرد کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہونے اخلاق و آداب ٹھیک ہو سکتے
ہیں نہ چال چلن درست ہو سکتے ہیں۔ عورتیں گھر سے نکل کر دنیا کو نہیں سمجھ سکتیں" وغیرہ
وغیرہ کیا اس لیے پردہ نکرنا چاہیے؟ سبحان اللہ! کیا اچھی رائے ہے! کیا اچھا ثبوت
ہے! جب ہی تو کہتے ہیں کہ اندھی تقلید اندھا کر دیتی ہے۔

(۴) "پردہ دھوکے کی ٹٹی ہے اور دیکھنے والوں کی آنکھ پر پٹی ہے" آپکا شاید یہ مطلب ہے
کہ دھوکے کی ٹٹی کو توڑ دیں اور مردوں کی آنکھ پر کی پٹی کھولدیں کیوں یہی مطلب ہی نا؟

(۵) پستی و نکبت کی حد تک ہو بیشک! اسکو شبہ نہیں اگر سوال یہ ہی: حد ختم ہو گئی یا ختم
ہو رہی ہی؟ ملا شاید جب عورتیں باہر نکلنے لگیں گی تو حد ختم ہو جائیگی۔

(۶) اگر مرغی کے ڈربے یا کباڑی کی دکان وغیرہ وغیرہ۔ خوب! خوب!! یہاں تو علیٰ

قابلیت، تجربہ سب فیشن کی تقلید پر نثار ہوگئے!! ہمارے گھر اب مرغی کے دڑبے کہے جائیں یا کباڑی کی دکان۔ غرض جو کچھ کہا جائے بجا اور درست! زمانہ ہی جو ایسی پیچ اور پچر باتیں سنواتا ہے! کیا نہیں ہیں یہ وہی گھر جن کا نقشہ کھینچتے ہوئے تمدن عرب کا مصنف عش عش کرتا ہے! کیا نہیں ہیں یہ وہی گھر جن کی نقل آتارنے کے لیے یورپ والے ابر لیبو طلبا، رفقا اور کی خاک چھانتے رہے ہیں! مگر اسوقت حکومت تھی، تمول تھا بے فکری تھی: جو کچھ بنانے تھے دل کھول کر بناتے تھے: سونا، اٹھنا بیٹھنا ٹہلنا پھرنا کھانا وغیرہ وغیرہ ہر ایک چیز کے لیے علیحدہ علیحدہ حصے اور پھر ساتھ ہی باغیچہ۔ نہر کنواں باؤلی۔ حوض فوارہ وغیرہ وغیرہ سب کچھ موجود! لیکن اب اگر عزت اور شرافت رکھنی ہے تو خیر اسی میں ہے کہ ... چادر ہو اتنے پانوں پھیلائے جائیں! اپائیں بنانے والے باتیں بناتے ہیں گریبان اور کھالی اسے ... ہو جاتے ہیں! اکثر اوقات جانوروں سے بدتر! ابتک تو بفضلہ نہیں ہے البتہ اگر ... تقلید ہی تو ہمارے منہ میں خاک آگے چلکر ضرور ہو جائے گی! ہمیں جو بیمار دیتیں ... مجھ مسلول کا

... ہمارے ہاں زیادہ تر پردہ پوشی اور حیا و شرم کا لحاظ رکھکر ایجاد کیا گیا ہے اور ... میں تھوڑی بہت جھڑک لبرلک آہی گئی ہے وہ ہندوستان جنت نشان کا اثر ہے! ایسا لباس بھلا کیوں سمجھ میں آنے لگا! تو ایسا لباس اچھا ہے جس سے بدن کی جلد جھلک مارتی ہے نرم نرم ہاتھ مونڈھوں تک کھلے رکھکر اپنا پھرا پھرا اور گداز جسم پیش کرتے ہوئے آنکھوں کو سرد دیتے ... ایسے ہی لباس کی ضرورت ہے! اور وہی بہترین لباس ہے جس سے ہر وقت ... لیکر سر و حال ہوتا ہے! پہلے زمانہ کے لوگ تو ایسے نظارہ سے اپنی خیالات ... دیکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ایسی ہوس انگیز اور فتنہ زا باتوں سے دور رہتے ... بے سرد کی بڑھتی جاتی ہے، کمزوری عام و با ہے، نوجوان بڈھوں سے بدتر ... کپڑوں کا غلاف چڑھا ہوا ڈھانچ ہیں! ان کے لیئے اس جیسے ہزار نظارے

بھی کچھ نہیں! کیا ممکن جو گل محمد اپنی جگہ سے چالو ل پھر بھی کھسک جائے! اسد کی شان ہے کہ ہمارے ڈھیلے پائجامہ کے پائنچے اٹھانے پر آوازے کسے جاتے ہیں اور کسا کون ہے جو ایک چھوڑ دو دو۔ گاؤن۔ بھاری بھاری اور زمین پر جھاڑو دینے والے لمبے گاؤن۔ کو اکٹھا کرکے ایک پوٹلی سی بنا کر کولوں کے قریب سے علانیہ اٹھا کر رستہ چلے! جھنجھن کی آواز بری اور سخت بری لیکن اونچی ایڑی کیسی؟ بھدی جوتی یا گھیتلے پر لاکھوں باتیں بنائی جائیں سکین اسکی وجہ لقمان بھی نہ بیان کرسکے کہ خواہ مخواہ ایڑی کو قطب صاحب کی لاٹھ کی چھوٹی ہمشیرہ کیوں بنا دیا گیا جس سے ہر وقت ڈر ہے کہ پاؤں مڑا اور موچ آئی؟ کندھوں سے کمر تک اور کمر سے گھٹنوں یا ٹخنوں تک دو دو سائیوں کے نیچے بدن کو جکڑ لینا لو ہے او چمڑے سے شکنیں کس دینی سیانس تک آزادی کیسا تنفس لینے کے قابل نہ رہنا۔ بجا اور بالکل جائز! آزادی کی موجودگی میں سرکس کے شیر دیکھ کر خواہ مخواہ سر پاؤں تک کانپ جانا، تھرا جانا، سب قابل فخر! لیکن اپنے آبا و اجداد کی جائز رسوم تہہ ہر بار ہنسنے کے قابل! اسی کا نام قومیت ہے؟ ہمارا منہ نہیں کہ ایسی باتیں سمجھتے ساتھ ہی اپنے لباس پر حرف گیری کریں۔ کانسٹری پہلے اپنا لوٹمنٹ نکال لے پھر کسی کی بھلی نکالنے پر آمادہ ہوا ہے

دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب

(عزیزم سچ کہتا ہوں اس بات پر یہی تمھاری آپا جان نے لتے ہی لے ڈالے تم نے بھی لکھنے میں اپنا اور بہت کم نظر رکھی ہے!)

(۷) واہ بھائی جان واہ کتنے اچھے طریقے سے پردہ کی حقیقت سمجھائی ہے مضمون پردہ کیموافق لکھا ہے نتیجہ نکالا اور نکالا ہی نہیں بلکہ لکھ دیا کہ "پردہ نہ کرنا چاہیے" اور تاکید اس طرح کی "اپنا گھونگھٹ کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریئے"

(۸) جی ہاں وہ ایسے مذہبی پردہ پر ناز کرتے ہیں، اور کرینگے" نہ وہ گھونگھٹ کھولیں

اور نہ وہ لاجوں مریں کیا آپکی اتنی جلد لئے بدل گئی ؟ کیا آپ گھٹنہ کھولکر لاجوں
مرنے پر (خدا نہ کرے) تلے ہیں ؟ (یہاں بھی میں مجسم کم عقلی کی تصویر بن گیا)

(۹) خود تو کہہ رہے ہیں کہ "سبب قومی کیرکٹر نہیں تو فخر کی جگہ شرم کا مقام ہے" اور
اب خود ہی کہہ رہے ہیں کہ "باوجود تعلیم و احساس و قومی کریکٹر ہونے کے۔ گھر سے
نکلنا چاہیئے۔ ٹھیک تو یہ ان سب کے ہونے کی شرم مار ہی ڈالے گی آج نہ سہی تو کل سہی
اس لیے یہ بہتر ہے کہ آج گھر سے نکلیں اور دوسروں کی نظر ہم پر پڑے اور آج ہی مر جائیں

(۱۰) عورت کو "غنچۂ دلاویز" سے مثال دیتے ہیں اور "آبدار موتی" سے تشبیہ دیتے ہیں، مگر پھر بھی
ضد ہے کہ عورتیں پردہ نہ کریں۔ سوچو تو وہ پردہ کیوں نہ کریں، اگر وہ غنچۂ دلاویز ہیں تو تمہاری
میرے ہاتھوں میں جا کر مرجھا جائیں گے اور اگر وہ آبدار موتی ہیں تو بھی ناجائز استعمال
سے بے آب ہو جائیں گے آپ ہی بتائیے کہ موتی بے آب ہو جائیگا؟ اور کیا پھول
نہ مرجھا جائے گا؟

(۱۱) نیچر بتاتی ہے کہ جتنی خوشنما، نازک، اور قابل حفاظت و احتیاط چیزیں ہیں وہ
سب پردہ میں پیدا ہوتی ہیں، پردہ میں رہتی ہیں، اور اسوقت تک وہ قابل
قدر و قیمت ہیں۔ جہاں پردہ سے باہر نکلیں اور برباد و تباہ ہوئیں مثلاً دماغ
انسانی کیسی حفاظت کے ساتھ قید کیا گیا ہے؟ قوت بینائی کس طرح چھپائی گئی
کان کے پردے کس پردے میں پوشیدہ ہیں؟ دل کو دیکھئے کتنی محفوظ جگہ ہے؟
اور پھر سب کے آخر میں خدا خود کس قدر ہر جگہ موجود ہو کر اور حاضر ہو کر غائب اور پوشیدہ ہے؟
اب فرمائیے پردہ فطری شے ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں ہے تو کوئی بات خلاف
قانون قدرت تو رائج ہو نہیں سکتی،، اس لیے دو نتائج نکلے۔ یا تو پردہ فطری
شے نہیں ہے یا خلاف قانون قدرت چیزیں رائج ہو سکتی ہیں۔ جواب دیجئے
کونسی بات ٹھیک ہے؟ (اس کا جواب میں نے الٹ پلٹ کر دیا تو سہی مگر

ایمان لگتی تو یہ ہے کہ خود میرے دل کو نہیں لگتا تہا۔

(۱۲) بقول ہز ہائنس آغا خان کے (حالانکہ اُنہوں نے اور موقع پر استعمال کیا تہا) "آدہی قوم مردہ ہی" اس لیئے پردہ نکرنا چاہیئے۔ پردہ نکرنا قوم کی زندگی ہے اور پردہ کرنا قوم کی موت۔ کیوں ہی ٹہیک؟

(۱۳) باہر مردانے میں ایک چوڑے دو دو بالشت اُترے ہوئے ہیں مانند کوئی بی صاحب کسی دوست کی بیوی کے نام سے گہر میں مہمان ہیں" اس سے کیا مطلب؟ آپ چاہتے ہیں کہ عورتیں بہی اسطرح سے کریں؟ کیا اسی کے معنے "حقوق طلبی" میں، ہاں یقیناً! کوئی وجہہ عورتوں کے پابند رہنے کی نہیں ہے۔ وہ بہی کُہلم کُہلا اسی طرح سے جس سے، اور جس طرح چاہیں، ملیں دونوں کے حق برابر ہیں، اور اُن کا صحیح استعمال یہی ہے! شاباش، مرحبا! انصاف اسی کو کہتے ہیں۔ البتہ بات صرف یہ پیدا ہوگی کہ عزت وحیا، انصاف پر سے قربان کرنی پڑی!!

(۱۴) بہائی جان کا تجربہ بالکل ٹہیک ہے "بیشک اُن کے (لڑکیوں کے) قویٰ میں، عقل میں، توانائی میں۔ ذرا سا فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض بعض بچیاں بچوں سے زیادہ قوی اور فرزانہ ہوتی ہیں بلکہ لڑکیوں کا اُٹہان اول اول عام طور پر بڑا ہوتا ہی اور مردوں کی نسبت سن بلوغ کو بہی جلدی پہنچ جاتی ہیں"

"مشہور جس کا ذکر کرتے ہوا ہمیں اب قوت پرواز کیسی طاقت رفتار بہی نہیں ہی" اس لیئے آپکا منشا ہی کہ اسکو چہوڑ دیا جائے اور خالہ بلی ہڑپ کر جائیں۔ رائے تو صائب ہی ہمیشہ کی داستان کل کل سے تو نجات مل جائیگی (میاں میں یہہ غائب تہا!!)

"معیار تہذیب" اخلاق کا بڑہانا ہی یہ سب سے بڑی بات ہی اور بیحد اچھا خیال ہی مگر تم نے "اگر مگر" میں لاکر اسکی ریڑہ لگادی۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ "اگر" ہی تو نہیں۔ اگر ایسا ہوجائے تو پہر نہ یہ نہ وہ قصہ ختم۔ ۔۔۔ م

بتقریب تاج پوشی قیصر ہند - ہر دو حصہ بجائے (عہ) کے ایک روپیہ میں ملیگے

وصل حبیب

ناول نہیں عجیب اداؤں کی ہے تصویر رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

حسن تو ہے جہاں میں میرا افسانہ کیا
کہتی ہے مجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی سید محمد صاحب ارشد تھانوی از بھوپال - امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیرجی شبیر علی صاحب از بجنور - الحمد للہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول حسب دلخواہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر انوار سے منظر شائقین ہوا اور کی ضرورت نہیں - کہ آپ کی قابلیت حد اواد ہے حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے اس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر فدا حسین صاحب صوداگر از ملتان - آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) قاضی عبدالشکور صاحب از ڈبائی ضلع بلند شہر - وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی حقیقت آپ نے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

(۵) مولوی فصیح الدین صاحب از محل مراد آباد - وصل حبیب دیکھا - ماشاء اللہ آپ نے اپنا عزیز وقت صرف کر کے خوب کام کیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو سرکشن لال صاحب سمندر از دہلی - آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو بنسی گوپال صاحب کندن از حیدر آباد دکن - آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر حصہ کو دیکھا نہایت عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شعیب صاحب مترجم شرکو قوییا از آرہ - کتاب (وصل حبیب) کو ترک ہیبت سے زیادہ لطف اوٹھایا عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے چھوٹے چھوٹے گرچست اور مبینہ جملے مصنف کو پوری قابلیت کی شہادت دے رہی ہیں عبارت کا زور اشعار کی ترتیب - جملوں کی ترکیب الفاظ کی بندش صاف بتلا رہی ہے کہ مصنف کو مشرقی علوم پر کمال عبور ہے - مذکورہ بالا صفات نے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے کہ ناول کو ایک بار دیکھکر انسان آسودہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار میں کیا دس بار میں بھی سیری نہیں ہو سکتی - یہ تو موتیس تنہائی بن جاتا ہے - منتہے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد - ہمیں اعتراف ہے کہ ہم مرغوب اخلاق ناولوں کے گرویدہ ہیں وصل حبیب کو ہم نے نکتہ چیں نگاہوں سے غور سے دیکھا - ہمارا خیال تھا کہ موجودہ لغو افسانوں کی طرح یہ بھی ہوگا مگر کس قدر خوشی ہوئی کہ مصنف نے کل ہمارے خیال کا جو اپنی تصنیف میں توڑ دیا ہے زبان کی سلاست صحیح معنوں میں ایک قابل قدر خدمت ہے یہ ناول بہر صورت ہماری قابل قدر ہے ایسے ہی کتابوں کی اشاعت ہم مومن ...

(۱۰) اخبار ... سال ریاست کشمیر از سری نگر - وصل حبیب ہم کو شائق ہو ... کا اشتیاق تا ... ہو دی ...

مہتمم کتب خانہ حبیبیہ ڈاک خانہ گوبرنج یا شیوپال

ڈاکٹر برمن کی بنائی ہوئی مشہور دوائیں

ستائیس برس سے سارے ہندوستان میں استعمال میں آرہی ہیں

(۱) دمہ چاہے زور سے اچھلتا ہو اس دوا کے دو ایک خوراک ہی سے دب جاتا ہے۔

(۲) نیا ہوا دمہ اس دوا کا استعمال کیا جائے تو دمہ جڑ سے جاتا ہے۔

(۳) پرانے دمہ والے یا جن کا دمہ دم کا ساتھی ہو گیا ہے وہ بھی اس دوا سے بہت صحت پاتے ہیں

دمہ کی دوا } ڈاک محصول ایک سے تین شیشی تک ۵ آنہ قیمت ایک شیشی ایک روپیہ چار آنہ (۱؍۴)

مقوی گولیاں } ڈاکٹری میں طاقت دینے والی دوائیوں میں مشہور دوائیں فاسفورس اسٹکنیا اور ڈمیانا ملا کر یہ گولیاں بنی ہیں مغز ریڑھ رگ، ماس اور خون کو یہ طاقت دیتی ہے اس لیے ان کی کمزوری سے پیدا ہوئے معمولی کمزوری، ہول دل، بہولنا، ہاتھ پیر کا پھٹنا، لقوہ وغیرہ ان گولیوں سے آرام ہوتے ہیں دو ہفتہ کی خوراک تین گولیوں کی شیشی قیمت ایک روپیہ (عہ) ڈاک محصول ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ۔

امراض مستورات کی دوا } یہ ہر ایک اقسام کے مستورات کی دوا ہے ہر طرح کا رحم کی بیماری پردر، روگ حمل کی کمزوری پیٹ جانگھ میں درد وغیرہ کو رفع کر اس دوا کے استعمال سے رحم کی خرابی تمام دور ہو کر جسم قوی ہوتا ہے ایک دفعہ اس دوا کی بھی آزمائش کیجئے قیمت ایک شیشی ایک روپیہ (عہ) (۱؍۲) خوراک محصول ڈاک

ان دوائیوں کی مفصل حالت مع سرٹیفکیٹوں کی پوری کتاب بلاقیمت ملتی ہے منگا کر دیکھئے۔

ڈاکٹر ایس کے برمن

نمبر ۵ / ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

نوٹ: ہمارے ایجنٹ آغا منصب علی کشمیری دروازہ دہلی میں ہیں۔
فرمائش کے ساتھ اخبار کا حوالہ ضرور دیں

جلد ۱ — فروری سنہ ۱۹۱۲ء — نمبر ۵

اللہ

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر۔ شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

تمدن پریس ۱۳۳۰ دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ قسم اول ۵ قسم دوم ۴ قیمت فی پرچہ ۸ (٭) کتابت حقیر ابوالظفر حامد میرزا دہلوی

عصمت

(دہلی)

جب یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے تو ہاں اکثر بندگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی اصلاح و بہبودی ملحوظ ہے کنواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق بہن عصمت سے بہتر ناصح مصلح کا ملنا ناممکن ہے عصمت ان کو بتلائے گا کہ کنوار پنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے ماں باپ کا ادب۔ بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں ان کو پیش آئیں گی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہییں۔ غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پر لطف و باطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عصمت ہے عصمت ان کو بتائے گا کہ جس آمدنی کو وہ بے فکری سے خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کیے ہیں ان کی ذمہ داریاں ان پر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتلائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائے گا +

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا فرصت میں کہانیاں سنانے والا مذہب کی وقعت بتانے والا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو گا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ہر ماہ ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں قیمت سالانہ [illegible] روپے!

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)



تمدن

بنائے ابراہیم

از شمس العلما ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی ڈی اویل

ہمارے محترم لندن ٹائمز لکھتے ہیں کہ اگر اب بھی ترکوں نے اٹلی سے صلح نہ کی تو (خاکم بدہن و دہنش) اٹلی کے ہوائی جہاز کعبۃ اللہ اور روضۂ اطہر کو مسمار کر دیں گے کعبۃ اللہ کا مختصر جواب تو اس مضمون کے آخر میں ہے اور روضۂ اطہر کے متعلق امر یں کہ ہم اس کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتے کہ تاج برطانیہ کو ایسے دلخراش الفاظ پر توجہ کریں

چار ہزار برس کے لگ بھگ ہونے آئے کہ ابراہیمؑ نے جن کو یہود اور نصاریٰ اور مسلمان کل اہل کتاب یکساں طور پر پیغمبر برحق مانتے ہیں اپنی بیوی ہاجرہ اور فرزند اکبر اسمٰعیلؑ کو جو ہاجرہ کے بطن سے تھے سرزمین مکے میں لا کر بسایا اس وقت شہر مکے کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا سنگلاخ پہاڑی زمین اجاڑ پڑی تھی وہیں باپ بیٹوں نے عبادت کے لیے چار دیواری سے کوٹھے کی طرح تھوڑی سی جگہ گھیر دی جو کعبہ کہلائی۔ کچھ کم چار ہزار برس کی بات ہے

اس سے سمجھ لو کہ ابراہیم نے کس طرح کعبہ بنایا ہوگا چھت تک نہیں پاٹی مگر تھا کیا کہ ابراہیم جبکہ ہر طرف بت پرستی پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی شد و مد کے ساتھ عقیدۂ توحید کے پہلے رواج دینے والے تھے۔ تو کعبہ پہلی اور اکیلی مسجد تھی۔ جو خدا واحد کی عبادت کے لئے بنائی گئی۔ کوئی عمارت اس ترقی کے زمانے میں بھی کیسی ہی مستحکم بنائی جائے آخر کار کبھی نہ کبھی بوسیدہ ہو کر ضرور تجدید یا مرمت کی محتاج ہوگی اور ایسا ہی دیکھا گیا ہے۔ ؎

لدوا للموت وابنوا للخراب لہا ملک ینادی کل یوم

یہی حال ابراہیم کے بنائے ہوئے کعبہ کا ہوا کہ جب سے بنا چھ بار اس کی تجدید ہو چکی ہے مرمت اور تحسین تزئین کا تو کچھ شمار نہیں ثبات و قیام عادت کے لحاظ سے غنیمت ہے کہ حجاز کے علاقے میں جہاں کعبہ ہے برسات نہیں ہوتی۔ یا ہوتی ہے تو بہت کم ورنہ خدا جانے اس عرصہ میں کتنی بار تجدید کرنی پڑتی برسات تو معمول سے نہیں ہوتی مگر پہاڑی نالوں کا سیلاب کبھی کبھی آجاتا تھا تین مرتبہ تو سیلابوں کی وجہ سے کعبے کی تجدید کرنی پڑی ہے دو بار آگ کے لگنے سے مسمار ہو گیا تھا از سر نو بنایا گیا۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہو جائے گا کہ کب کب کس کس ضرورت سے خانۂ کعبہ کی تجدید ہوئی اور کس نے کی۔ بیشک ہر تجدید کے وقت اصل عمارت کی وضع میں حسب تقاضائے وقت تھوڑی بہت تبدیلی بھی ضرور ہوئی ہے۔ بنائے ابراہیم کی چھت نہ تھی بعد کو چھت پاٹی گئی دیواریں اونچی کی گئیں۔ اندر آنے جانے کا ایک دروازہ تھا ایک کی جگہہ دو بنائے گئے ایک آنے ایک جانے کا پھر بعد کی تجدید میں نیا دروازہ مصلحت سمجھ کر بند کر دیا گیا داخل کا دروازہ سہولت کے لئے زمین دوز تھا بنظر مزید احتیاط چوکھٹ

اونچی کی گئی کہ اب تک پہنچنے کے لیے زینہ لگانا پڑتا ہے رقبہ کے تھڑ جانے سے
مجبوری حطیم کی قدر سے جگہ چھوڑ دی گئی تھی ۔ پھر ملالی گئی پھر نکال گئی۔

یہ سب کچھ ہوا مگر بندہ سے جگہ وہی ہے جو ابراہیمؑ نے اختیار کی تھی چونکہ کعبہ ابراہیم
کا بنایا ہوا تھا وہی اسکی رفت و روب بھی کرتے تھے اور وہی کعبے کے حقدار متولی
تھے اور ان کے وقت میں رفت و روب کے سوائے کعبہ کا اور کام ہی کیا تھا،
خدا نے ابراہیمؑ کو اور ابراہیمؑ کے بنائے خانۂ خدا کو برکت دی تھی ! ابراہیم کے
فرزند اسمعیل نے قبیلۂ بنی جرہم میں اور اسمعیل کے بیٹے ثابت نے بنی خزاعہ میں شادیاں
کیں اور یوں ابراہیمؑ کی نسل بڑھتے بڑھتے بجائے خود ایک بڑا قبیلہ بن گئی
ادھر خانۂ خدا کی برکت سے نسل اسمعیل کے علاوہ عرب کے دوسرے قبائل نے دین
ابراہیمؑ کی پیروی اختیار کی اور خانہ کعبہ ایک حساب سے تمام عرب کا معبد قرار پایا
لوگ گروہ گروہ سال کے سال حج اور وقتاً فوقتاً عمرہ کرنے زیارت کعبہ کو آتے
اور ابراہیمؑ کے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق خدائے واحد کی عبادت کر کے لوٹ
جاتے عام مقبولیت کے ساتھ کعبہ کی حرمت یعنی متولیوں کی ذمہ داریاں بڑھتی
گئیں اور ذمہ داریوں کے ساتھ ان کے اقتدارات و اختیارات ذمہ داریوں
میں سرداری زوار کعبہ اور وہ ہزاروں ہی ہوتے تھے اور برس کے بارہ مہینے
انکا تانتا لگا رہتا تھا ۔ پانی پلانا (سقابت) اور کھانا کھلانا (رفادت)
مکہ ہمارے ہندوستان کے بڑے شہروں جیسا ہوتا تو چٹکی بجاتے میں
آسانی سے سقابت اور رفادت دونوں کا انتظام ہو سکتا تھا مگر مکہ کا حال
یہ تھا کہ پانی کمیاب اور جو قدرے قلیل تھا بھی کھاری تو لوگ کیا کرتے کہ قسمت سے بارش
ہو گئی تو مینہ کا پانی چمڑے کے حوضوں میں جمع کر رکھتے تھے، یا پہاڑی چشموں
سے ڈھو کر لاتے تھے اور چھوہارے یا کشمش اور منقی بھگو کر پینے کے قابل بنا لیتے

تعمیر کعبہ کا نقشہ

کونسی دفعہ بنا	کس نے بنایا	کس سنہ میں بنا	کیوں بنایا	پہلی تعمیر میں کیا تجدید کی
اول مرتبہ	حضرت ابراہیم	[illegible]	[illegible] کوئی بھی نہ تھی خدائے واحد کی عبادت کے لیے مسجد بنائی	صرف چار دیواری بنائی تھی چھت نہ تھی زمین سے ملا ہوا بے کواڑ دروازہ تھا دیواریں زمین سے نو ہاتھ اونچی ایک طرف سے ۳۲ اور ایک طرف سے بائیس ہاتھ کا عرض اور طول ایک طرف سے ۳۱ اور دوسری طرف سے ۳۲ ہاتھ کا
دوسری مرتبہ	بنی جرہم نے	[illegible]	پہاڑی نالہ کعبہ میں گھس آیا کعبہ ڈھے گیا	کچھ تجدید نہیں کی پہلی ہی بنیاد پر اسی صورت کا بنا دیا اور اتنی ہی بلندی رکھی
تیسری مرتبہ	قبیلہ عمالیق نے	سنہ عیسوی سے تخمیناً سو برس پیشتر	ایک عظیم الشان سیلاب کے صدمہ سے کعبہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا۔	اس مرتبہ بھی کسی طرح کی تجدید نہیں ہوئی۔
چوتھی مرتبہ	قصی بن کلاب نے	ہجرت نبوی سے [illegible] برس پہلے	متواتر سیلابوں سے جابجا کعبہ شکستہ ہو گیا	چھتوں کو پاٹ دیا اور حطیم کی طرف سے کچھ عرض کم کر دیا کیونکہ یہانتک پہونچکر اس کے پاس کا سرمایہ تھڑ گیا تھا۔

کعبہ کتنی دفعہ بنا	کس نے بنایا	کس سنہ میں بنا	کیوں بنایا	پہلی تعمیر میں کیا تجدید کی
پانچویں مرتبہ	قریش نے	اس وقت ہمارے پیغمبر صاحب کی عمر ۱۲ برس کی تھی	ایک عورت غلاف کعبہ کو دہونی دیرہی تھی چنگاری اڑکر غلاف پر جاپڑی اور اس کے بھڑک اٹھنی سے کعبہ جل گیا دیواریں گرپڑیں	دیواریں اٹھارہ ہاتہ بلند کردیں چارہاتہ ایک بالشت کی کرسی دی اور اس کرسی پر دروازہ کہولا کعبہ کے اندر چہ ستون دو صفوں میں کہڑے کیئے حطیم کی طرف چہ ہاتہ ایک بالشت زمین چھوڑدی اندر کے رخ زینہ چڑھایا۔
چہٹی مرتبہ	عبداللہ بن الزبیر نے	۶۴ھ میں	عبداللہ بن الزبیر نے جو پیغمبر صاحب کی پہوپھی بن عبدالمطلب اور زبیر بن العوام کے بیٹے تھے یزید بن معاویہ کی بیعت انکار کیا اور مدینہ سے مکہ چلے آئے اُسپر یزید کے حکم سے مکہ پر فوج کشی ہوئی لوگوں کے پتھراؤ سے کعبہ میں آگ لگ گئی۔	حطیم کو کعبہ میں داخل کیا شرق وغرب میں آمدورفت کے لیے دروازے زمین سے ملاں رکھے دیواریں ۲۷۔ ہاتہ اونچی لے گئے چہ ستونوں کی جگہ صرف تین رکھے
ساتویں مرتبہ	حجاج بن یوسف ثقفی نے	۷۴ھ میں۔	عبداللہ بن الزبیر نے حطیم کو کعبہ میں شامل کرلیا تھا حجاج نے اس کو ناپسند کیا اور عبدالملک سے اجازت لے کر حطیم کو پھر کعبہ سے خارج کردیا	غربی دروازہ بند کیا حطیم کو کعبہ سے خارج کردیا دروازہ اتنا ہی اونچا رکھا جتنا پہلے تہا کعبہ کے اندر سیڑھی لگائی اور اسپر دو روشندان رکھے ✦

رفاہت سقایت سے بھی زیادہ مشکل تھی کہ اسکو چاہیئے صرف کثیر اس لیے کہ مکہ میں تو کچھ پیداوار ہوتی ہیں زمین بھی پیداوار کے قابل نہیں خود ابراہیم جنہوں نے اس سرزمین کو آباد کرنا چاہا تھا فرماتے تھے رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ - چارونا چار اناج باہر سے لانا پڑتا اب بھی ہمارے ہندوستان کے مقابلہ میں وہاں ہمیشہ قحط ہی رہتا ہے مکے میں سات سیر کا آٹا سماں ہی اور ہمارے ہاں کال اور اب تو بدقسمتی سے یہاں بھی متواتر کال ہی ہونے لگے ہیں برسات ناغہ ہوتی رہتی ہے نہروں اور کنوؤں سے بقدر کافی غلہ پیدا ہوتا ہے تو یورپ کو کھچا چلا جاتا ہے۔

جس سال عبداللہ (پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے والد) کی شادی ہوئی تو ملک عرب پر چاروں طرف آفت کی بھرمار تھی اور طرح طرح کے لشکر مصائب لوگوں پر ٹوٹ رہے تھے اگرچہ یہ سارا سال واقعات ہائلہ سے پُر اور مصائب و آفات کا دنگل بنا ہوا تھا لیکن ایک وہ واقعہ جس نے عرب کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا اور تمام ملک میں عام طور پر ہل چل ڈالدی یعنی یمن کے حاکم کا خانۂ خدا پر خونخوار حملہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

یمن کا حاکم ابرہۃ الاشرم ایک نہایت سخت متعصب عیسائی تھا جس نے مذہبی تعصب کی وجہ سے خانہ کعبہ کی تخریب کا ارادہ کیا اس نے جب دیکھا کہ لوگ موسم حج میں نہایت ذوق شوق سے دور و دراز کا سفر طے کر کے جوق جوق خانہ کعبہ میں آتے اور طواف و زیارت سے آتش شوق کو بجھاتے ہیں تو اس کے مذہبی تعصب کی آگ اور بھڑک اٹھی اور خانہ کعبہ کی تعظیم اور انتہا سے زیادہ جاہ و جلال دیکھ کر آتش حسد پہ لوٹنے لگا شہر صنعا میں ایک عظیم الشان گرجا بنایا اور زوار کعبہ کو

اسکی زیارت کی تکلیف دی لیکن جب لوگ اس گرجا کی زیارت کو نہ آئے تو ابرہہ غصہ میں جھلا اٹھا اور ایک خونخوار لشکر کی سرکردگی میں خوفناک اور مہیب ہاتھیوں پر سوار ہو کر مکے کی طرف بڑھا۔ مکے کے لوگ بھاگ پہنچا تو قریش اور کنانہ اور خزاعہ اور ہذیل کے قبائل سب ملکر لڑنے کو تیار ہوئے لیکن جب انہوں نے ابرہہ کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں دیکھی تو اپنے اہل و عیال کو لے کے مکے کی اونچی اونچی پہاڑیوں پر جا چڑھے۔ عرب بیشک بہادر تھے بڑے بڑے معرکوں میں بے خوف کود پڑتے تھے خطرناک اور جان جوکھوں کے موقع میں اندھا دھند گھس جاتے تھے اور جان دے دینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی لیکن تو بھی انہوں نے گوارا نہیں کیا کہ ایسے زبردست اور ڈراونی شکل کے جانوروں کے مقابلہ میں سینہ بسینہ اور کلہ بکلہ ہو کر لڑیں ابرہہ نے رستے میں سے حمیر کو بطریق سفارت سرداران قریش کیطرف روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ میں تم لوگوں سے لڑنے کے ارادے نہیں بلکہ کعبہ کے ڈھانے کے لیے آیا ہوں اگر تم لوگ میری مزاحمت کروگے اور جنگ کی طرف مائل ہوگے تو میرے پاس بہت سامان حرب موجود ہے اس گفت و شنید میں دو روز گذر گئے اور قبائل قریش میں سے کسی کو ابرہہ سے مقابلہ کرنے کی جرآت نہیں ہوئی ابرہہ نے رستہ صاف دیکھا تو جھٹ شہر مکہ میں آ دھمکا قبائل قریش پہلے ہی مکہ کی پہاڑیوں میں جا چھپے تھے تاہم کعبہ مقدس کی عمارت میں کچھ لوگ اس غرض سے جمع بھی تھے کہ لشکر یمن کعبہ پر حملہ آور ہوگا تو ہم ایک خونریز جنگ کر کے اپنی جانیں کعبہ پر قربان کر دیں گے ابرہہ کو معلوم ہوا تو اس نے اس روز کعبہ پر دھاوا کرنا مناسب نہ سمجھا اور آج کے حملہ کو کل کے لیے اٹھا رکھا دوسرے دن کی صبح کو اپنی خونخوار فوج کو لیکر آگے بڑھا مگر قبل اسکے کہ دھاوے کا حکم دے اسے خیال آیا کہ جو لوگ کعبہ میں موجود ہیں انہیں پیغام تو پہنچا دیا جائے تاکہ غفلت میں مر کر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ اس نے لوگوں سے

دریافت کیا کہ کعبہ کے مجاوروں کا سردار کون ہے سب نے کہا عبد المطلب ابرہہ
نے عبد المطلب کو بلایا اور تخلیہ میں گفتگو کی عبد المطلب یہ کہتے ہوئے ابرہہ کی مجلس سے
باہر نکل آئے کہ جو اس گھر کا مالک ہے وہی اس گھر کا محافظ بھی ہے ہمیں یقین ہے کہ
وہ اپنے گھر کو مخالفوں کی زد سے بچا لیگا اور اپنے گھر کے خادموں کو ذلیل و رسوا نہیں کریگا۔
الغرض ابرہہ لشکر کو لیکر آگے بڑھا اور جب کعبہ کی دیواریں نظر آنے لگیں تو یکا یک
دھاوا کرنیکا حکم دیا خدا کا کرنا جوں ہی گستاخ لشکر نے خانۂ خدا کی جانب قدم
اُٹھائے کہ مکے کی غربی سمت سے لشکر الٰہی نمودار ہوا یعنے بہت سے پرند چھوٹی چھوٹی کنکریاں
پنجوں اور چونچوں میں لیئے فوج فوج آگئے اور لشکریوں پر کنکریاں برسانے لگے۔
جس پر کنکری پڑتی گولی کا اثر کرتی۔ تھوڑی دیر میں سارا لشکر خداوندی غضب میں مبتلا
ہوکر غارت ہوگیا ظالم اور گستاخ ابرہہ اگرچہ زخموں سے چور ہوکر یمن کیطرف
بھاگا لیکن اس کا مرغ روح عقابِ موت کے چنگل سے بچ نہ سکا اور رستے ہی میں مر کر رہ گیا۔

ہم نہایت خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے شہر کے مشہور فوٹوگرافر ایچ۔ ای۔ میرزا صاحب نے اپنی متبرک
البمونیں (ارپین ویوز) طرابلس فنڈ کے واسطے ایک خاص رعایت کی ہے۔
یہ البم دو قسم کی ہیں جنمیں بارہ بارہ فوٹو ۱۲×۱۰ سائز پر مکہ معظمہ۔ عرفات۔ مسجد خیف۔ جنت المعلیٰ
خانہ کعبہ۔ دروازہ عنبری۔ خیمہ جات ترکی۔ مسجد قبا۔ مدینہ منورہ۔ جنت البقیع۔ مقبرہ امیر حمزہؓ۔ روضہ مطہر
کے شامل ہیں۔ اور انگریزی خواں حضرات کیلئے ہر فوٹو کے نیچے انگریزی حروف میں عمارت کا نام اور اسکی تصریح ہے
دوسری البم جو اُردو خواں حضرات کے واسطے ہے اسمیں ہر مقدس عمارت کی مفصل تاریخ حاشیہ اور لوح عمارت کے اشعار درج ہیں۔
ہر البم کی قیمت بارہ بارہ روپیہ ہے لیکن اب میرزا صاحب بجائے بارہ روپیہ کے نو روپیہ کو دیں گے۔
اور جس قدر اس رعایت کے ذریعہ سے بکری ہوگی اوسمیں سے ۱ر فی روپیہ کے حساب سے طرابلس فنڈ میں چندہ دینگے
اُمید ہے کہ ناظرین تمدن میرزا صاحب کی حوصلہ افزائی فرما کر طرابلس فنڈ کو تقویت دیں گے۔

انقلابِ روزگار

نکلا اُفق پر صبح دم وہ تاجدارِ خاوری جس کی شعاعوں میں ہم برپا ہے جنگِ زرگری
رنگِ شفق ہے جلوہ گر یا شعلہ رخسار اک پری پُر خوں ہے یا وقتِ سحر مینائے چرخِ اخضری
نظروں سے غائب ہو گئے روشن ستارے رات کے
دم بھر میں آخر کیا ہوئے سامان سارے رات کے

صبح

گلزارِ ہستی اُجڑا ہوا بزمِ طرب برہم ہوئی شمعِ سحر سرتا بہ پا تصویرِ رنج و غم ہوئی
گلشن سے سوئے آسماں گرمِ سفر شبنم ہوئی سنبل لبِ آبِ رواں مثلِ صفِ ماتم ہوئی
نکہت چمن میں چار سو کیسی پریشاں ہو گئی
ہر عندلیبِ خوش گلو گلشن میں نالاں ہو گئی
رخصت ہوا شب کا قمر نکلا ستمگر آفتاب روشن گر دیوار و در ہے شعلہ پیکر آفتاب
بستر سے اُٹھی دھوپ ہے آیا ہے سر پر آفتاب منزل یونہی کرتا ہے طے دنیا میں دن بھر آفتاب
دن رات میں شمس و قمر پامالِ جورِ آسماں
گردش میں ہیں شام و سحر پابندِ دورِ آسماں

دوپہر

مغرب کی جانب ہے رواں کشتیِ مہرِ آتشیں ساقی نے پھینکا ہے کہاں اپنا یہ چھوٹا ساتگیں
فصلِ خزاں میں زرد ہے یا ایک برگِ یاسمیں مدفن ہے جس کے واسطے دم بھر میں مغرب کی زمیں
خورشیدِ تاباں کوئی دم میں سرنگوں ہونیکو ہے
اقصائے مغرب میں ابھی جگر اس کا خوں ہونیکو ہے

شام

خورشید عالم تاب پر آیا ہے کیا وقتِ زوال دھندلی سی آتی ہے نظر گردوں پہ تصویرِ ہلال
میدانِ میں اک شیر ز صحرا میں ہے آشفتہ حال گردن کے لپٹے ہیں مگر گرگ و سگ و شغال
آنکھوں سے جاری اشک خوں اور دل سے اٹھتا ہے دھواں
آنے لگی کانوں میں آوازِ درائے کارواں

نیرنگیِ باغ جہاں ہر دم ہے تازہ انقلاب بچپن کا عالم اب کہاں گذرا وہ ہنگام شباب
عہدِ جوانی ہو چکا پیری میں ہے رنگ غضب غفلت کی نیندیں تا کجا ہشیار ہو اے مستِ خواب
ٹوٹا ہوا ہے بادباں بادِ مخالف تیز ہے
کشتی ہے گویا نیمجاں اور بحر طوفاں خیز ہے

یارب جہاں میں آسماں جبتک ہے گردش پذیر خورشید تاباں تا ہے باقی سرِ چرخِ اثیر
روشن زمانے میں ہے تا طلعتِ ماہ منیر آنکھوں کا اپنی قوم کی تارا ہو ہر برنا و پیر
چمکے ہمیشہ اوج پر اقبالمندی کا نشاں
روشن رہے علم و ہنر کے نور سے ہندوستاں

سفیہ

راحتِ زمانی } مولوی سید احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ناول کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے بیگماتی زبان قلعہ معلی کے محاورے قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم } یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی، زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اس کی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ ؍

منیجر عصمت تمدن دہلی سے طلب کیجئے۔

مدینہ کی ایک مغنیہ (عزۃ المیلاؔ)

مَدِیْنَۃُ الرَّسُوْل۔ جسے آستانۂ نبوت ہونے کا افتخار حاصل ہے، اور جو جناب رسول اللہ صلعم کے روضۂ اطہر، اور مسجد نبویؐ کے قیام سے تا قیامت مسلمانوں کا کعبۂ آرزو رہے گا، اس کی مقدس آبادی ایک مستحکم شہر پناہ سے محصور ہے، جس کے نیچے نیچے ہر چہار جانب ایک عمیق خندق چلی گئی ہے، جیسے سرکار مدینہ خالق کون ومکان کے لاڈلے اور محبوب تھے، ویسے ہی مدینہ کے سواد کو کائنات (گردونواح کے عمدہ مناظر) اپنے جھرمٹ میں لیے ہوئے قدرت کا مقرر کردہ پہرہ دے رہے ہیں، اور بزبان حال ہر زائر وصادر کو آگاہ کرتے رہتے ہیں، "ادب سے جاؤ کہ سرکار سو رہے ہیں"

مدینہ کی بستی میں بسنے والے قبائل ٹھیٹھ بدو یا اہل بادیہ نہیں، بلکہ ایسے شائستہ اور سنجیدہ لوگ ہیں جن کے سینہ و دل صدق و صفا سے معمور ہیں۔ روشن ضمیر بھی ہیں، اور صاحب سلیقہ، متمدن اور ہنرمند بھی، ان کی صاف ستھری منزلیں اگر ان کی نفاست پسندی پر داد خواہ ہیں، تو ان کی قدرتی سادگی ہزار آرائشی تکلفات، کو مات کرتی ہے،

سیدھی سادی طرز تعمیر کے مکانات، کشادہ صحن، اور خانہ باغ خانہ باغ، میں آذوقہ بہم پہونچانے والے درخت، ہم خرمہ وہم ثواب کے مصداق،

یہ صدر اسلام کی بہار تھی، مگر اس زمانہ سے تقریباً نصف صدی ہم آگے نکل آئے ہیں، یزید ابن معاویہ صاحب تخت و تاج ہے، بلاد اسلامی میں

شورش اور طوالف الملوکی سے ہر طرف قدم جما دیے ہیں، گو بہتوں نے اس تازہ شورش سے مدینہ ہی کو خیرباد کہا ہے، مگر مدینہ کی مردم خیزی سو وہاں کی خاص و عام دلچسپیوں پر اس بھگدڑ کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا؛

اِن دنوں مدینہ میں ایک مغنیہ عورت رہا کرتی تھی، عزۃ المیلا جس کا نام تھا، اور فن موسیقی میں مہارت نے جس کے نام اور صفت سے حوالی اور مضافات کے لوگوں کے کان بھی پورے طور پر آشنا کر دیے تھے، یہ انصاریوں کی مُنہ بولی بہن تھی۔ اور سرزمین حجاز کی عورتوں میں سب سے پہلی مغنیہ عورت تھی +

عرب میں افسانۂ کہن کی یاد تازہ کرنے کی جو رسم قدیم الایام سے جاری تھی اُس میں عزہ اپنی جادو بیانی اور طلاقت کے زور سے ایسے مجیدین میں شمار ہوتی تھی جس کا نام مشاہیر میں ہوتا تھا،

اس کی شہرت میں مقبولیت کا جو عنصر شریک تھا اُس کے ذمہ دار عزہ کے وہ اوصاف تھے جنھوں نے اُسے ایک حد تک محسود خلائق بنا رکھا تھا۔

اُس میں حُسن اور خلق کی خوبی کے ساتھ ظرافت، خوش مزاجی اور کریم النفسی کا جوہر بھی تھا، اور ایسا کہ مدینہ سے کوئی وارد و صادر ایسا نہ گزرتا جسے عزہ سے ملنے، یا اُسے دیکھنے، اور اُس کا سامعہ نواز نغمہ سننے کی آرزو نہ ہو،

اگرچہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب فن موسیقی کا شمار عربوں کے یہاں فنون لطیفہ میں تھا، اور نہ اِس فن کو عرب اس قابل سمجھتے تھے کہ انجاب و اشراف اسے سیکھیں، باوجود اس کے عزہ اس فن سے لگاؤ رکھ کر بھی

اُسی حشم و وقار سے دیکھی جاتی تھی، جس کے مستحق اُس کے اوصاف اور اُس کی وجاہت اُسے ٹھہراتے تھے۔ بلکہ کچھ اُس سے زیادہ ہی، اُسکی مجلس میں لوگ اس ادب اور خاموشی سے آبیٹھتے کہ گویا اُن کے سر و نسر طیور اپنے پروں کا سایہ کیے ہوئے ہیں،

شہر مدینہ میں عزہ کا مکان سمت شمال میں آبادی کے سرے پر اُس شاہی راستہ سے متصل واقع تھا، جو شام کو جاتا ہے۔ مکان کے ہر چہار جانب باغ تھا، جس میں انواع و اقسام کے میوہ دار اشجار تھے۔ باغ کے گرد بلند آدم احاطہ کی دیوار تھی، اور ایک جانب اندر آمد و رفت کا دروازہ تھا، باغ کے بعض گوشوں میں دو رویہ سایہ دار درختوں کے جھک کر ملنے سے ایک قبہ نما چھت (عریش) رسی بن گئی تھی جہاں اونٹوں کا مزین تھا،

مکانیت یہ تھی، کہ بیچ میں ایک بڑا صوفہ (ہال) جس کے دو طرف غلام گردش اوس اس کے بعد تھوڑا صحن چھوٹ کر پردہ کی بلند دیوار جس میں ہر سمت دو دو کھڑکیاں اس کے نیچے تہ خانہ،

بڑا صوفہ عزہ کی نشست گاہ تھا، جس میں چاروں کھونٹ فرش تنا ہوا، اور صدر میں رومی مسند جس پر بڑا تکیہ لگا رہتا تھا،

صحن میں سایہ دار درختوں کے پاس پاس ہونے سے ایک عمدہ خنسرزی کا لطف آتا تھا،

ربیع الثانی ۱۳۰۳ھ کی آخری تاریخیں ہیں، جو اگست ۱۹۲۶ء سے مطابق ہیں، اس زمانہ میں دن کو یہاں اس شدت کی گرمی پڑتی ہے

کہ "الامان والحفیظ"۔ ایک روز کا مذکور ہے جب آفتاب قریب بہ غروب آیا، دہوپ ڈہلنے سے گرمی کی شدت و تمازت گئی۔ تو عزہ بھی نہا دہو اور جوڑا بدل کرتہ خانہ سے برآمد ہوئی، عطر دان منگایا، اور افراط سے عطر کپڑوں میں ملا، کہ ملبوس اور بدن عطر میں بس گیا،

اس وقت اُس کے بدن پر زرد رنگ کی قمیص چادر تہی، اور چہرہ پر کالی نقاب، جو کچہہ تو گرمی کے خیال، نیز مکان میں کسی مرد ذات کے نہ ہونے سے چہرہ سے ہٹا دی گئی تہی،

عزہ مختلف شغلوں میں رہی کہ اسنتے میں عشاء (رات کا کھانا) کا وقت آگیا، تب اُس نے پیش خدمت جاریہ کو حکم دیا، کہ مائدہ (دستر خوان) صرفہ کی چاندنی (چہت) پر زیر سما لیجا کر چنے، جس کی تعمیل مُنہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ ہونے لگی،

اس موقعہ پر یہ بتانا غالباً بے موقعہ نہ ہوگا کہ عزہ کا رکھ رکھاؤ بر طور جیسے امیرانہ تھا، ویسا ہی اُس کا دستر خوان بھی وسیع اور پُر تکلف ہوتا تھا، اُس کے مطبخ کی مثال سخی کی ہانڈی سے ملائی جاتی تہی، جس کے واقعی اور بلا مبالغہ ہونے میں جاننے والوں کا اصرار تھا، امرآدل کے لوازم طبعی کے طور پر اُسکی طبیعت عیش کی حد درجہ خوگر ہوگئی تھی اور اس تن آسانی نے روز بروز اُس کی فربہی کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے کر اُس کے اپنے بوجہہ کو جان کا دوبہر کر رکھا تھا، بہرحال کچہہ اپنی خودداری کے بناء، اور زیادہ ان مجبوریوں (اور ہمارے نزدیک تو سراسر مجبوریوں کی وجہ سے) عزہ کہیں آتی جاتی نہ تہی، بلکہ اُس کے کمال فن کے شائق خود اُس کے گھر دُور دُور سے آتے تہے، اور اقسام اقسام کے تحائف

اُس کے لیے، کیا از قسم مال وزر، اور کیا بیش قیمت اشیا، مثل لباس و زیورات کے اسے نذرانہ کے طور بھیجتے تھے، اس بنا، پر عزہ امیر نہیں امیروں کی امیر تھی، جو چاندی سی سفید سونے سے زرد، جس کا جوڑ جوڑ جواہرات سے مرصع، اور جس کے بال بال گج ہوتی تھے

گھر میں ساز و سامان اور اثاثہ کا شمار کیا جائے تو اچھا خاصہ قیمتی اشیا، کا اسٹور (توشہ خانہ) ترتیب دیا سکتا تھا، ایسا نہیں کہ جس میں ایشیائی لفاظی اور تراش کی رونق ہوتی ہے، ہوتا ہوا کچھ بھی نہیں، بلکہ نادر اور نفیس اشیار کا ایسا مجموعہ کہ الفاظ میں جس سے جان پڑے، اور تراشیدہ دیکھ پائے تو روح تازہ ہو جائے ،

مگر باایں ہمہ عزہ کی مزاجی سادگی، لباس اور آرائش کے ہر طریق سے ظاہر ہوتی تھی اس کی قدرتی زنانہ شان جیسے اُس کے جسم کو لباس کے تکلفات سے بری رکھنے میں اُس کے مذاق کی پختگی کا ثبوت پیش کرتی، ویسی ہی اُس کے لعل و جواہر سے معرّٰی گردن و بازو شوق آرائش سے اس کے استغنار پر گواہ تھے۔ اور ان جملہ شہادتوں کو اس کے ان ثقہ اور صوفیانہ رنگ کے گوشواروں سے قوت پہونچتی تھی، جو اس کی کان کی لووں کے نیچے چراغ کی لو کی طرح اُجالا پھیلا کر بزبان حال کہتے تھے، کہ دعوی حسن و برآت کی تصدیق جس کا جی چاہے آئے اور کر جائے ،

عزہ کے حسن اخلاق، مروت اور سب سے بڑھکر اس کی اصابت رائے نے اس درجہ اشراف مدینہ کے حسن اعتماد کو اس کے ساتھ بڑھا دیا تھا کہ اکثر اُن کے خانگی قضایا میں وہ شخص ثالث، اور معاملات عروسی

وغیرہ میں تمام قابل دریافت امور کیلئے وہ معتمد واسطہ ٹھہرائی جاتی تھی،

خلاصہ یہ کہ آن کی آن میں چھت پر فرش کر کے کھانا چن دیا گیا، اور باندی نے آکر اس کی اطلاع کی۔ عزہ اوپر جانے کے لیے اٹھی کہ کسی نووارد کی آواز قدم نے اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا، اور اس نووارد کے سامنے ہوتے ہی عزہ نے (اہلاً وسہلاً ومرحبا) خوش آمدید کہہ کر ادسے لیا،

نئی آنے والی ایک کواری نوعمر خاتون تھی جس کے نازک جسم کو حریر کی سرخ چادر چھپائے ہوئے تھی، اس نازنین کا نام سمیّہ ہے اور یہ مدینہ کے ایک معتقد شخص کی لڑکی ہے،

تجربہ کار مگر پاک طینت عزہ کو ناتجربہ کار مگر بھولی لڑکی سمیّہ سے قلبی موانست اور دلی رابطہ ہے، اگرچہ اُس کی ہر ہر ادا میں شرم اور عفیفانہ غیرت جھلکتی ہے مگر وہ کھل کے جو کچھ بولتی ہے، وہ عزہ سے، اور جن گھڑیوں میں وہ خوش رہتی ہے، وہ وہی گھڑیاں ہیں جو اس کی عزہ کے یہاں گذرتی ہیں،

اس دستور کے مطابق اس وقت بھی اُسے شگفتہ ہونا تھا، مگر نہیں! اُس کے پھول سے مکھڑے میں دلربائی کی تازہ کشش اس وقت موجود نہیں، جس سے اُس کے آئینہ ضمیر پہ دلی کاوشوں کا غبار پایا جاتا ہے، سمیّہ اور وہی سمیّہ جو اس وقت ہماری مہمان نواز عزہ کے بازو آکر بیٹھ گئی ہے۔ اس کے حسن خداداد میں کوئی ایسی انیلی آن ہم نہیں پاتے جسے خواہ مخواہ کو بھی فتنہ بپا ٹھہرادیں، اور قیامت کے ہوپچال سے بڑھانے میں بڑھ جائیں۔ مگر ہاں اس ہونے پر

جو کچھ ہے، وہ اُس کی نرگسی آنکھ اور اُس میں محبت کا رس، عشق کی تڑپ، اُس کی خوشنما ہنسی جس سے آب تیسا موتیوں کی لڑی شرمائے، اور تبسم ناز کرتے ہوئے جو ہر عقل کے ساتھ برقِ بلا کا کام کرے، اُس کا قد دلجو رعنائی و دلبری کے نخل کی باثمر شاخ،

غرض اُس غیر معمولی تپاک اور خلوص کے اظہار کے بعد جس سے ہر آنے والے کی مدارات نہیں کیجاتی، دل کا بھید لانے والی عزہ کی متجسس نظریں سمیّہ کی پُرشکن پیشانی سے اُس کے دل میں اُتریں، اور بکھڑی سے نازک دل پر غبار غم چھایا ہوا دیکھ کر عزہ محبت کے لب ولہجہ میں بولی،

عزہ:- سمیّہ! تمھارا آنا میرے سر اور آنکھوں پر، مگر اس آنے پر ہرگز یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ تم غریب عزہ کے لیے سرور قلب اور قرۃ العین بنکر آئیں، بلکہ تم خود غمگین آئیں، اور اپنے ساتھ تم نے اپنے دل سے چاہنے والی عزہ کو بھی غمزدہ کر دیا، خدا کے لیے کچھ کہو تو سہی! دشمنوں کو کیا فکر لاحق ہے۔ اور خلاف معمول چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟

اچھا اوپر آؤ، میں خیال کرتی ہوں کہ یثرب کے سرسبز و شاداب مناظر کی قدرتی دلفریبیاں تمھارے مغموم دل، اور فکرمند دماغ کو بہت جلد اپنی طرف مائل کر کے انھیں مسرور اور تازہ کر دیں گے"

یہ کہتے ہوئے اُس نے سمیّہ کا نازک حنائی ہاتھ پکڑا، اور کوٹھے پر لیچلی، سیڑھی سے آگے آگے عزہ اور اُس کے پیچھے سمیّہ کوٹھے پر پہونچیں جہاں پر تکلف دسترخوان بچھا ہوا طیار تھا۔ دونوں جا کر فرش پر بیٹھ گئیں، مگر عزہ کو اب یہ فکر لگ گیا تھا کہ سمیّہ کے خیالات کدھر پھیرے جائیں

کہ اس کی پریشانی رفع ہو، چنانچہ اُس نے سلسلۂ سخن کا آغاز یوں کیا،
عزہ "پیاری سمیہ! تم نے کبھی ادھر بھی غور کیا، دیکھو! فصیل مدینہ کے اطراف باغات، چشمے، حوض اور جھاڑیوں کا، دور تک کیسا شاداب تختہ نظر آرہا ہے جس کے اختتام پر ایک ٹیلہ اور اُس سے پرے ایک پہاڑ دکھائی دے رہا ہے، یہی کوہ اُحد ہے، جہاں غزوہ اُحد ابتدائے اسلام کا ایک مشہور درد انگیز معرکہ نبی آخر الزماں صلعم اور سرداران قریش کے درمیان پیش آچکا ہے اور جس میں تقریباً ستر جلیل القدر صحابہ رسول اللہ کام آئے خود حضور رسالت مآب صلعم کے دندان مبارک شہید ہوئے، اور آپ کے عم حضرت حمزہؓ نے اسی معرکہ میں شہادت پائی۔ یہ واقعہ اس لحاظ سے کہ مسلمانوں کی اس وقت تک کوئی بڑی جماعت نہیں پیدا ہوئی تھی، اور نہ اُنہیں کوئی قوت حاصل تھی کہ اتنے بڑے امتحان میں کسے گئے۔ مسلمانوں کے لیے بڑا سخت مرحلہ تھا، جس کے واقعات سنکر اب بھی جگر دو نیم ہوتا ہے"
سمیہ (جو ان واقعات کو بغور سُن رہی تھی) "اور کیا آپ اس واقعہ کے وقت موجود تھیں"
عزہ "اس واقعہ کو تقریباً ستر سال ہوئے، میں بھلا اُس وقت کہاں! مری پیدائش اُس سے بہت بعد کی ہے"
عزہ۔ (قریب کے مناظر کیطرف متوجہ ہوکر) "دیکھو! جس رُخ پر آفتاب غروب ہوا ہے، اُس کا منظر کیسا عجیب و غریب ہے، سامنے والی تالاب کی ساکن سطح آب گویا چاندی کی ایک چمکیلی چادر ہے جو ادھر سے اُدھر تک پھیلی ہوئی ہے، جس پر تاروں کے عکس سے زرکار بوٹیاں

گڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں گویا زمین اپنے طاقچے کا ایک سرا کھول کر تاروں بھری رات میں آسمان کے کہنہ تھان کے مقابلہ میں رکھ کر صاحب نظروں کو دکھا رہی ہے، ادھر پانی میں درختوں کے سایہ گویا جنوں کے پیکر ہیں، جو اپنی ڈراؤنی شکلیں دکھا دکھا کر فضاء وسیط کے رہنے والوں کو مرعوب کر رہے ہیں،

شفق اور اس کے انعکاس سے لحظہ بہ لحظہ بدلتا ہوا نقشہ دیکھنے میں ہمیہ کچھ ایسی محبور ہوئی کہ اندھیری چھائی اور یہ سارا رنگ بگڑ بگڑ کر کالے پانی میں محض تاروں کی کچھ جھلملاہٹ اور درختوں کے کوہ پیکر عکس کے بجائے اب وہاں کالے خطوط رہ گئے اور وہ بھی بغور دیکھنے سے نظر آتے تھے۔

اتنے میں عزہ دسترخوان کی طرف پلٹی، اور ہمیہ سے شرکت طعام کو کہا۔ جس پر ہمیہ بھی پھری، اور دونوں نے کھانا شروع کیا،

خا نعالی

راحت زمانی مولوی سید احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے بیگماتی زبان قلعہ معلی کے محاورے۔ قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

لڑکیوں کی انشا ہمارے حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبد الراشد صاحب خیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ) ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنے (۸/) منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے۔

تشنہ لب بچے

آہ پھر یاد آتے ہیں دریا ہی آنکھوں سے رواں وہ زمین کربلا کے چھوٹے چھوٹے میہماں
تین دن تک جو رہے وقف بلائے آسماں

تشنگی میں پھول سے رخسار کمھلائے ہوئے جستجوئے آب میں پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
خشک لب ہیں چہرۂ پژمردہ ہیں سوکھی ہے زباں

ڈبڈبائے آنکھوں میں آنسو لبوں پر سرد آہ ہر کی جانب مگر حسرت بھری ہے اک نگاہ
اشک عارض پر ادھر جاری اُدھر پانی رواں

لے رہی ہے نہر موجیں اور یہ ہیں تشنہ کام ننھے ننھے ہاتھوں میں خالی لئے پھرتے ہیں جام
آنکھوں میں حلقے پڑے ہیں اُن میں ہے سوزِ نہاں

کچھ نفس باقی ہیں خیمہ میں بپا کہرام ہے معجزہ ہے زندگانی تو برائے نام ہے
تین دن کی پیاس میں جیتے ہیں ایسے بیزباں!!!

مائیں بہلاتی ہیں اُنکو اور وہ ہیں بیقرار لاکے دیں پانی کہاں سے کچھ نہیں ہے اختیار
سوکھے ہی ہیں پاس ہے بچوں کو اپنے بیبیاں

تپ رہی ہے دھوپ کی شدت سے جنگل کی زمیں اور اُسی جنگل میں ہیں وہ تشنہ لب بچے مکیں
ایک خیمہ ہے فقط اور وہ بھی سب سے ٹپاں

گو کہ بچے ہیں مگر دل زندگانی سے ہے سیر سامنے میدان اور میدان میں لاشوں کے ڈھیر
جینے کوئی رونیوالا ہے نہ کوئی نوحہ خواں

جب نظر اٹھی نئی لاش ایک آئی ہے نظر جب سُنی آواز کوئی قتل کی پائی خبر
ہر طرف سامان غم کا ہر طرف غم کا سماں

کوئی بھی باقی نہیں ہے اب خدا کی فوج میں	خون تازہ جوش زن ہے ہر سپاہی کی رگ میں
جس کی خوشبو سے مہکتا ہے چمن زارِ جہاں
آہ اے بچو! اگذاری کس طرح یہ تین دن	یہ مصائب یہ بلائیں یہ تحمل اور یہ سن
کون یوں ثابت قدم رہتا ہے وقت امتحاں
کیوں نہ ہو کس نسل سے ہو اے اسیرانِ چمن	خون ہے کس کا رگ و پے میں تمہاری جوش زن
نور کس کا ہے تمہارے پاک چہروں سے عیاں
حق ادا ایسا کیا عالم میں کس نے صبر کا	سنگ بنیادی رکھا دنیا میں جس نے صبر کا
کون ہے کس ہے کشتۂ عبرت امام انس و جاں
تو نے دیکھا ہے زمینِ کربلا کیونکر یہ حال	میں تو مرجاتا وہیں گر دیکھتا دم بھر یہ حال
شامیوں کے وہ مظالم الحفیظ و الاماں
میرزا محمد ہادی - عزیز - لکھنوی

یاسمین - پروفیسر میرزا محمد سعید صاحب ایم اے مصنف خواب ہستی کا یہ لاجواب نتیجہ خیز ناول اور تمدن ایجنسی کی پہلی کتاب جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا تیار ہوگئی ہے یہ کتاب جو درحقیقت حسن و محبت کی زندہ تصویر ہے قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلباء کے واسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس قابلیت سے بحث کی ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان اور بنگال کی ایک مشہور نازنین ہے اسکی زندگی کا ہر ورق فلسفۂ حیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کر رہا ہے قابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونیکی کافی ضمانت ہے قیمت عمر

منیجر عصمت و تمدن - دہلی

کائنات پر ایک نظر

انسانی زندگی بھی ایک عجیب و غریب معمہ ہے جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ نیچر کس وضع خاص پر اس کے چلانے کا ارادہ رکھتا ہے اگر غور کیا جائے تو متنوع طبائع کے تماشے اور گوناگوں امزاج بشری کے نتیجے اسباب کا یقین دلاتے ہیں کہ نیچر خود بے انتہا شوخ طبع ہے جس طرح ایک کی دوسرے سے صورت شکل نہیں ملتی اور حسب اصول علمائے سمدرک ہاتھ کی لکیروں تک میں اختلاف ہے اسی طرح فطرت انسانی میں بے انتہا تفاوت ہے اور اوسپر تماشہ یہ کہ نیچر سب طبیعتوں سے کام ایک کرانا چاہتا ہے۔ عالم ایجاد بہ اعتبار تمدن ایک چیز ہے جس میں تغیر طبائع کو کم دخل ہے۔ ہمدردی محبت، الفت، صلہ رحم، سچائی، دیانت یہ وہ سب باتیں ہیں جو تمدن کی جان ہیں اور تا وقتیکہ ہمارا مقصد ترقی یہ نہ قرار پائے، ہم عالم ایجاد میں گویا ایک عضو بیکار ہیں۔ مذہب اور تمدن ایک چیز ہیں اس لیے مذہب وہی تعلیم دیتا ہے جو مقتضائے تمدن ہے۔ مذہب ہم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو اصول فطرت کے مطابق ہیں قطع نظر اس امر سے کہ طبائع مختلف ہیں یا نہیں۔ ایک تنگ سینہ سے یہ امید رکھنا کہ وہ حوصلہ مند، وسیع خیال، اور جراأت آزما ثابت ہو یا ایک لالچی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عاقل اور سمجھدار ہو یا ایک چھوٹی آنکھ سے فراخ دلی سخاوت عالی ظرفی چاہنا بہت وقت طلب بات معلوم ہوتی ہے مگر پھر مذہب کیوں سب کو ایک سبق دے رہا ہے اور سب سے

ایک بات کا امیدوار ہے؟ پھر اگر کوئی پابند مذہب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو ایک واعظ اُسکو یوں تسکین دیتا ہے کہ دنیا دار الجزا نہیں، یہاں تو ہمیشہ نیک کام کرنے والوں کو ایذا رہتی ہے اور بُرے اعمال والے خوش رہتے ہیں۔ کیا اس کی علت یہ نہیں ہے کہ آدمی جس فطرت پر مجبور ہوا ہے اُس کے خلاف چلایا جاتا ہے اور اسی سبب سے وہ کسی طرف کا نہیں رہتا؟ اگر دنیا وار یا بالفاظ دیگر گنہگار اس اصول کے مطابق آخرت میں مستوجب سزا ہوں گے اور ہم اپنے اعمال نیک کی وجہ سے یہاں کے مصائب اور تکالیف کا عوض وہاں حور و قصور شراب و کباب کی شکل میں پاویں گے تو فرق کیا ہوا یہی نا کہ جو باتیں اُن لوگوں نے یہاں کی ہیں ہم وہاں کریں گے اُنہوں نے یہاں گناہ کیا ہم وہاں کریں گے؟ یہ خیال اور یقین کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ جو لوگ بد ہیں وہ دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں اور یہ کہ انصاف اس دنیا میں نہیں ہوسکتا دینیات جس کو ہم نے مذہب قرار دیا ہے اگر یہ سبق دیتی ہے تو بالکل ناکمل ہے اور صرف ظاہری نمود میں ترقی کی ہے۔ اس قسم کے شبہات اکثر پیدا ہوتے ہیں لیکن قانون مکافات پر غور کرنے سے جس سے اکثر فلاسفر اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں، معلوم ہو جاوے گا کہ اُس کے اصول اس کے ساتھ منطبق نہیں ہوسکتے۔ امرسن لکھتا ہے کہ قدرت کے ہر حصہ میں اضداد جمع ہیں تاریکی و ظلمت میں حرارت و برودت میں، مد و جزر میں، نباتات و حیوانات کے تنفس میں کہ ہوا کو اندر باہر کھینچتے ہیں، جسم حیوانی میں، خون کی مقدار و کمیت میں، دل کے قبض و بسط میں، مایعات کے گشاد و بڑھاؤ میں، حرکت دوری کے مائل المرکز اور دافع المرکز کششوں میں، قوت کہربائی اور ربط کیمیائی میں، ایک جگہ کو

خالی کرنا دوسری جگہ کو بھرنا ہے۔ غرضکہ اس دوئی نے کارخانہ عالم کی تنصیف کر رکھی ہے اس طرح پر کہ ہر شئے نصف ہے اور اپنے دوسرے نصف کے طرف ذہن کو منتقل کرتی ہے۔ تاکہ مل کر ایک ہو جائے جیسے روح و مادّہ، ذہنی و خارجی، طاق و جفت، اوپر نیچے، حرکت و سکون، ہاں اور نہیں جب کہ کل عالم میں دوئی ہے تو یہ دوئی اس کے ہر جز و میں ہے کل نظام کے اشیا ہر ذرہ میں پیدا ہے عورت مرد میں، پانی کے اتار چڑھاؤ میں، شب و روز کے تغیر و تبدل میں عناصر عالم میں جو رد و عمل ہوتا رہتا ہے وہ تمام خفیف سی خفیف مخلوق کے مختصر حدود میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ قوا جسم کے تقیل کے اصول میں دیکھئے جو کچھ قوت ہم حاصل کرتے ہیں۔ اوسیقدر وقت ضائع کرتے ہیں۔ زمین جہاں غلہ نہیں پیدا ہوتا بخاروں اور مہلک جانوروں سے پاک ہوتی ہے۔ سرد ملک میں جہاں اور عیب ہیں یہ ایک وصف بھی ہے کہ جسم کو قوی کرتا ہے۔ غرضکہ دوئی انسان کی فطرت میں بھی اسیطرح نہاں ہے۔ ہر لذت کے ساتھ کلفت اور ہر مصیبت کے ساتھ راحت لازمی نتیجہ اصول مکافات کا ہے اور اس لیئے اگر ہم بنا بر علیہ یہاں کے عیش و تنعم سے لطف اٹھانے والوں کے لیئے تکلیف آخرت اور یہاں کے غربا اور مصائب اٹھانے والوں کے لیے راحت عقبےٰ عوض قرار دیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ مگر اس صورت پر بہت سے اعتراض پیدا ہوتے ہیں جس سے اصول مکافات میں بہت بڑا رخنہ پڑ جائیگا۔ اس لیئے معاد کو چھوڑ کر اور اس عالم کو حیطہ اصول مکافات سے خارج کر کے دیکھتے ہیں تو بیشک ہم کو اصول مکافات کا قانون بہت زبردست قانون ماننا پڑے گا اور ہر حدہ میں اس کا

جلوہ نظر آنے لگا۔ ہر وہ امیر جو اپنے محلوں میں تمام اسباب آسایش و لذت کے ساتھ بےفکری سے زندگی بسر کر رہا ہے ایک جھونپڑے میں رہنے والے آدمی کے لیے بیشک قابل رشک ہے لیکن اوسی کے ساتھ اصول مکافات کی عینک لگا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اوس دولت مند کو ان تمام اسباب معیشت کے عوض میں کیا کیا چیزیں اور کس قدر دینی پڑی ہیں اور طہارت قلب اور اوصاف حمیدہ جو باعتبار تمدن ہر شخص میں ہونا چاہئیے اُس کے پاس سے گم ہیں کیسی غریب نے اگر ظاہری اسباب معیشت کو کھو یا ہے تو اُس کے پاس اُس کے عوض میں سلامتی ضمیر طمانیت دل اور بہت کچھ ملا ہے۔ اب ہم انہیں اصول کی رُو سے طبائع مختلفہ کو دیکھیں تو معلوم ہوجائیگا کہ فی الحقیقت ہر شخص معاون تمدن ہے۔ ایک متنفس اگر باعتبار اپنے جبلت کے جرأت آزما۔ دلیر اور شجاع نہیں ہے اور اس صورت سے وہ تمدن عالم کے ایک حصہ میں عضو بیکار ہے تو اُسی کے ساتھ اب یہ بھی سمجھ لیں کہ اُس میں جبر تعدی ظلم و زیادتی کی بھی قوت نہیں ہے اور اوراس سے اگر ایک جری آدمی تمدن کے ایک حصہ کو قوت دیتا ہے تو دوسرا دوسری حیثیت سے معاون ہے۔ اگر ایک عقلمند آدمی دوسروں کے لئے نفع رساں ہوسکتا ہے تو اُسی کے ساتھ بیوقوف آدمی میں دوسرے کو نقصان پہونچانے کا مادہ نہیں ہے اگر ایک اپنی سخاوت اور عالی ظرفی سے عالم امکان میں ایک جز و ضروری بنا ہوا ہے تو دوسرا اپنی منتظمانہ اصول سے کچھ کم مفید نہیں ہے۔ اس لیے کوئی شخص نظر بہ وضع فطرت و جبلت مسئول نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اُس سے جو کام ایسی اضطراری حالت میں ہوئے ہیں اُن پر وہ قادر نہ تھا اور ایسے کام سے باز پرس

Saeed ...

ہونا خلاف عقل و انصاف ہے۔ مگر وہ چیز جس نے آدمی کو ذمہ دار بنایا ہے
اصول مکافات سے جدا ہے اور اسی پر اعتبار کرکے سلے دے ہوگی۔ آدمی
کے کسی فطرت خاص پر مجبول ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ مجبور محض ہے
اور اس کے پاس ارادہ نفسی بھی نہیں ہے۔ انسان کی فطرت چاہے کچھ
ہو مگر اس کے ساتھ اس کو قوت ارادی اور رہبری ضمیر عطا کی گئی ہے جس کا منشا
صرف یہی ہے کہ وہ قواے نفسانی پر جو جبلاً انسانی وضع میں ودیعت ہیں غالب
نہ سکے اور پھر خاصکر اس حالت میں جبکہ ضمیر ایک کسبی چیز ہے کسبی اس معنے
کر کہ اس کا حصول مدارج اور شعبات کے اعتبار سے وہبی نہیں ہے بلکہ
سعی اور کوشش سے پایا جاتا ہے اور اسی سبب سے اگر کوئی شخص باعتبار
کمزوری ضمیر نظام تمدن میں خلل انداز ہے تو یہ اس کا ذاتی قصور ہے جس کو
فطرت اور جبلت انسانی سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ کہنا کہ ضمیر ہمیشہ نظام
کائنات کے موافق ہو کر چلتا ہے خلاف واقعہ ہے کیونکہ ایسے
افراد انسان موجود ہیں جو یا تو بالکل ضمیر نہیں رکھتے یا اگر رکھتے بھی ہیں تو پورے
معنے ضمیر کے اس پر صادق نہیں آتے اور اس لیے ایسے لوگ جنھوں
نے کسب ضمیر نہیں کیا یا کسب ضمیر کے بعد اسکو بالکل محو کر دیا ہے اخلاقی
مجرم ہیں خواہ وہ فطرتاً کسی امر خاص کے اوپر مجبول ہوئے ہوں اور
یہیں سے تقدیر کے مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تقدیر کی نسبت
اعتقاد رکھنے والے تین جدا اعتقاد رکھنے والے گروہ ہیں۔ ایک
انسان کو مختار کل سمجھتا ہے اور دوسرا مجبور محض تیسرا گروہ وہ ہے
جو بین الاختیار والجبر ہے۔ اختیار کا عقیدہ سب سے پہلے جس شخص کے
ذہن میں آیا یا بالفاظ دیگر باعتبار وسعت تمدن اس مسئلہ پر غور کرنے کی

مزدمت ہوئی وہ معبد جہنی تھا جو اعتزال کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ جبر کا عقیدہ اُن لوگوں کا ہوا جنھوں نے بلا سوچے سمجھے اختلاف معتزلہ پر کمر باندھ لی اور تعصب نے اُن کے آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ فقہائے اسلام نے بہت چھان بین اور غور و تعمق کے بعد ایک بین بین حالت اختیار کی۔ غور کرنے سے خود معلوم ہو سکتا ہے کہ کون سا مسلک موافق فطرت ہے یا کوئی بھی نہیں۔ ان تینوں گروہ میں سے اُس فرقہ کو تو خارج کیجئے جو بالکل اپنی کو مجبور محض سمجھتے ہیں کیونکہ سب کے رنگ اور قوانین قدرت کے منافی یہی مسلک ہے اور اس لیے اب صرف دو باقی فرقے رہ گئے ہیں جو فطرت عالم کے پہلو بہ پہلو چلتے نظر آتے ہیں۔ انسان کو مختار ماننا گو ذات باری تعالیٰ کی شان تنزیہ کی رعایت پر مبنی ہے مگر اوسی کے ساتھ تھوڑی سی انانیت اور تکبر کی بو آتی ہے جو اگر بڑھ گئی اور یقینی بڑھے گی تو انتظام کائنات میں تخریب کا باعث ہوگی اور روابط تمدن میں کمزوری پیدا ہو جائیگی جو مقتضائے نیچر کے خلاف ہے۔ اس لیے علمائے اسلام نے جو حالت بین بین رکھی ہے وہ نہایت ہی پاکیزہ اور مستحکم اصول پر قایم ہے اگر گروہ معتزلہ مسئلہ اختیار میں زیادہ غلو سے کام نہ لیں تو اُن کو خود بعض اوقات ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز ایسی بھی ہے جو ہمارے ارادوں میں، ہمارے قوانین تمدن کے اصول، ہمارے سمجھے ہوتے عالم اسباب پر حکمراں ہے اور وہ آناً فاناً بدل سکتی ہے۔ مگر تاہم معتزلہ ہمارے بھائی ہیں اور ہمارے معتقدات کے ایک جزو کے موید ہیں۔ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں اِنَّ الْاِمَام ابا القاسم الانصاری سُئل عن تکفیر المعتزلۃ فقال لا لانھم

نزّهُوه فسل عن اهل السنة فقال لا لا هم عظموه یعنے ایک بار
امام ابو القاسم انصاری سے سوال کیا گیا کہ کیا معتزلہ کافر ہیں آپ نے کہا
نہیں کیونکہ انہوں نے ذات باری کی تنزیہ کی ہے پھر اہل سنت کی نسبت
سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ وہ بھی نہیں کیونکہ انہوں نے اُس کی
عظمت وجلال کا خیال رکھا ہے۔ اور پھر آگے چل کے امام فخر الدین
نے فرقہ اہل سنت کو ترجیح دی ہے

تعلیم الٰہی یہ کہتی ہے کہ ہر ایک قسمت کا حال لوح محفوظ میں مرتسم ہو چکا
ہے اور اس کے خلاف ہرگز نہیں ہو سکتا ہر شئے انسان، حیوانات
نباتات، جمادات، غرضکہ ذرہ ذرہ کا حال منقش ہو گیا ہے اور اسی
تحریر کے مطابق ظہور میں آئیگا جف القلم بما ھو کائن له مگر اس کے
معنے یہ نہیں ہیں جیسا کہ عوام سمجھے ہوئے ہیں یا بادی النظر میں معلوم
ہوتے ہیں۔ کیونکہ قلم سے مراد نہ یہ دنیاوی قلم ہے جس سے ہم لکھا
کرتے ہیں اور نہ لوح سے مراد وہ تختی ہے جس پر بچے مشق کیا کرتے ہیں۔ بلکہ قلم
اور لوح سے مراد قوانین قدرت ہیں جن کا دوسرا نام علم الٰہی ہے۔ جو علم الٰہی
ہے وہی قانون قدرت ہے اور جو قانون قدرت ہے وہی تقدیر ہے
علت ومعلول سبب ومسبب میں جو رشتہ قایم کر دیا گیا ہے وہی تقدیر ہے
جس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں اور یہی مطلب ہے۔ لا تبدیل لخلق الله
کا اور یہی منشا ہے لفظ محفوظ کا جو لوح کے ساتھ منضم ہے۔ زہر کا کام مار ڈالنا
اور آگ کا جلا دینا ہے پس گویا یہ ایک تقدیر ہوگی جب کوئی زہر کھائے گا
مر جائیگا، آگ میں کودے گا جل جائے گا۔ اسی طرح ہر ذرہ کی تکوین میں
اصول فطرت طاری اور ساری ہیں جن پر نظام عالم کا مدار ہے یہ وہی

کرکے سزا پانے والا کسی کو قتل کر کے پھانسی پر لٹکنے والا مجرم اپنے معصیت کا الزام خدا پر نہیں رکھ سکتا کہ اوس نے ایسا کیا میری تقدیر میں یہی لکھا تھا، نہیں بلکہ اس نے خود قوانین قدرت سے اس بات کی استدعا کی کہ مجھکو قید کرا دو، مجھکو پھانسی پر لٹکا دو اگر وہ خود علت اور سبب نہ ہوتا اور اپنے ضمیر سے کام لیتا تو ہرگز اس آفت میں مبتلا نہ ہوتا۔ کوئی قوم نہیں بگڑتی تاوقتیکہ وہ خود اپنے تئیں نہ خراب کرے کیا مطلب رکھتا ہے یہی کہ جبتک نظام عالم اور ترتیب تمدن کے اصول میں انحراف نہ کیا جائیگا ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیگی لیکن جب اس کا لحاظ اور خیال ترک کر دیا جائیگا تو وہی تقدیر پھر اپنا کام شروع کر دے گی جس پر ہم الزام رکھا کرتے ہیں۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:-

یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

اللہ بدکاروں ہی کو گمراہ کرتا ہے جو نقض عہد کرتے ہیں اور احکام الٰہی کے خلاف کرکے باعث فساد ہوتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ اور کیا کھلے ہوئے الفاظ اختیار انسانی کی نسبت ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ خاندان عباسیہ بنو امیہ صفویہ مغلیہ کی شان و شوکت کے زوال کا باعث کیا ہوا جبتک انہوں نے اصول کائنات کے نظام پر لحاظ رکھا اور اپنی تمدنی حالت درست رکھی کوئی زوال و انحطاط نہیں شروع ہوا، لیکن جب انہوں نے

خلاف ورزی قانون قدرت کرنا شروع کیا تو لگے تباہ و برباد ہونے جو لازمی نتیجہ تھا اُن کے افعال کا۔ ان سب قدرتی جکڑبندیوں کے ساتھ یہ نہیں کہ ہم بالکل اندھوں کی طرح چھوڑ دیے گئے ہیں بلکہ ہم کو ایک رہنما ایک چراغ روشن ہی دیا گیا ہے جس کو عقل یا ضمیر کہتے ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس سے کام لیں نیک و بد میں تمیز کر سکیں ورنہ اگر آدمی باعتبار اپنی جبلت کے مجبور محض ہوتا تو اُس کے اعمال سے باز پرس خلاف دانشمندی اور انصاف تھا مگر نیچر جانتا ہے کہ اگر آدمی انسانیت سے کام لے تو اپنی جبلت اور جذباتِ خلقی کو بدل سکتا ہے۔ شیر اور چیتا وغیرہ درندے ہیں جن کی جبلت میں درندگی اور خونخواری اور بے رحمی ہے لیکن جب وہ پال لیے جاتے اور اچھی طرح ہل جاتے ہیں تو ویسے ہی حلیم اور بے ضرر ہو جاتے ہیں جیسے اور معمولی جانور اُن کی درندگی اُن کی ایذا دہی جو فطرت میں تھی بالکل بدل گئی اور وہ صرف اس سبب سے کہ وہ شروع سے جبلت کے خلاف چلنے کے عادی بنائے گئے۔

فلیمون بہت بڑا حکیم تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ محض ترکیب اعضا اور ساخت جسمانی سے اخلاقی حالت بخوبی پہچان سکتا ہے بقراط کے شاگردوں نے اُس کا امتحان لینا چاہا اور ایک تصویر اپنے اوستاد (بقراط) کی ہوبہو کھینچکر فلیمون کے پاس لے گئے۔ فلیمون نے دیکھ کر کہا کہ جس شخص کی یہ تصویر ہے وہ بڑا زانی ہے۔ تلامذہ بقراط ہنسنے لگے اور کہا کہ یہ تصویر بقراط کی ہے اور آپ ایسا کہتے ہیں اُس نے کہا کسی کی ہو مگر میرا علم و تجربہ یونہی کہتا ہے جیسے

بقراط کے پاس واپس گئے اُس سے سارا قصہ بیان کیا۔ اُس نے کہا بیشک میں زنا پر بہت حریص ہوں مگر میں نے اپنے قوائے عقل سے اُس کو دبا رکھا ہے اور کبھی اپنی جبلی نقص کو نمایاں نہیں ہونے دیتا۔ علاوہ اس کے اور مشاہدات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر انسان کسب ضمیر کرے اور پھر اُس ضمیر سے کام لے تو بہت کچھ کام اپنی فطرت کے خلاف کر سکتا ہے اور اسی اصول پر نظر رکھ کر معاد کا انتظام رکھا گیا ہے ورنہ ہرگز انسان سے کوئی سوال نہ ہوتا اور نہ کوئی باز پرس کی گنجائش تھی غرضکہ انسان کسی طرح اپنے کو اس الزام سے نہیں بری کر سکتا کہ اسنے اپنی عقل اور ضمیر سے کیوں کام نہیں لیا جب کہ اُس کے لئے ایک کھلا ہوا راستہ ترقی تمدن اور کسب معیشت کا موجود ہے۔ جاہل ہیں وہ لوگ جو ہر بات میں تقدیر پر الزام رکھتے ہیں۔ کاہل ہیں وہ جو محض تقدیر کے بھروسے پر کوئی کام نہیں کرنا چاہتے یا وہ کہیں کہ اگر انہوں نے کوئی کام نہیں کیا تو تقدیر ہمیشہ اُن کو ذلیل و خوار رکھے گی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہماری تدابیر کارگر نہیں ہوتیں اور باوجود سعی و کوشش ہمیں ناکامیابی ہوتی ہے لیکن اسکو دیکھ کے بجائے اس کے کہ ہم تدابیر کرنا چھوڑا دیں اور بالکل تقدیر پر بیٹھ رہیں، اللہ کی قوت و برتری اور حکمت بالغہ کا قائل ہونا چاہیئے اور یہیں سے انسانی مجبوریت ظاہر ہوتی ہے بقول شخصے اللہ یعرف بفسخ العزائم۔ سچ ہے ایک قوت برتر ہمارے اوپر اور ہے جو ہمارے ارادوں، ہمارے خیالوں پر حکمراں ہے کہ جدھر چاہے پھیرے وھذا ما قدر دتی بری

(نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری۔)

نامۂ یار

ہے جگر کو تجھ سے تسکیں مرے دل کو چین ہے تجھ سے
تجھے دل میں اپنے رکھوں کہ جگر میں اپنے رکھوں

ہے اگرچہ دیکھنے میں تو ذرا سا ایک پرزہ
نہیں پر ترے برابر کوئی چیز زیر گردوں

تو ہی درد کی دوا ہے تو ہی زخم دل کا مرہم
تو ہی روح کی ہے قوت تو سکون قلب محزوں

ہوئی تجھ سے آنکھ روشن ہے دماغ تجھ سے فرحاں
ہوں نثار میں بتا تو کوئی سحر ہے کہ افسوں

یہ ہے آنکھوں کا تقاضا کہ گڑی رہیں تجھی پر
تجھے کس طرح میں پھاڑوں تجھے کس طرح میں پھینکوں

تو شریک وحشت فرقت تو ہی غمگسار غربت
بھلا کس طرح ہے ممکن کہ تجھے جدا میں کردوں

مجھے کب یہ ہے گوارا کوئی غیر تجھکو دیکھے
وہ نہ تیری بو بھی پائیں تجھے ایسی جا چھپاؤں

ہے کشش غضب کی تجھمیں ہے غضب کی تجھ میں قوت
لیا صبر بھی سکوں بھی کیا دم میں مجھکو مجنوں

یہی اب مری دعا ہے یہی میری آرزو ہے
لکھا جس نے ہے یہ نامہ اسے اک نظر تو دیکھوں

مذہب و سائنس

نہ پوچھو تم کہ مذہب کی ہے پابندی کی حاجت کیا؟
مسلماں ہو کے اس کے پوچھنے ہی کی ضرورت کیا؟
جو بندے ہو تو ناحق دخل دیتے ہو خدائی میں
خدا کو مان کر فرمان میں اسکے یہ حجت کیا؟
پڑھو تم فلسفہ سائنس لیکن رہ کے با مذہب
ہے مشکل آدمی بننا پھر ایسی قابلیت کیا؟
نہیں بچ سکتے بے مذہب شرِ نفس و شیطاں سے
بھلا اخلاق کی قانون سے ہو گی حفاظت کیا؟
مطابق کس قدر قانونِ فطرت سے ہے یہ مذہب
بتاتی ہے تمہیں اسلام کی دیکھو شریعت کیا؟
نہ رہبانیت اس میں ہے نہ چوپایوں سی آزادی
بھلا انسان ہو کر اور ملتی ہم کو نعمت کیا؟
مضر ہیں جتنی چیزیں جسم کے یا روح کے حق میں
حرام آئی ہیں مذہب میں تو بیجا ہے یہ حرمت کیا؟

کہو گے تم کہ قیدیں ایک پر ہیں ایک مذہب میں
شریعت تو ہوئی پھر دوسری ہے یہ طریقت کیا؟
سمجھنے کا طریقہ سہل سا یوں ہے اگر سمجھو
کہ ہے ظاہر کو باطن سے نہیں ہوتی ہے نسبت کیا؟
تصوف اصطلاحی نام ہے اصلاحِ باطن کا
نہوں صوفی تو پھر اصلاحِ باطن کی ہے صورت کیا؟
حدیثِ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ سے یہ صاف ظاہر ہے
عمل کوئی ہو دیکھی جائیگی ہے اس میں نیت کیا؟
حقیقت کو سمجھ لو حال وہ کیا قال میں آئے
یہاں مُلّا کی ہے قَالَ اَقُوْلُ کی حقیقت کیا؟
جہاں اٹھ جائینگے غفلت کے پردے چشم خود بیں سے
تو آنکھیں تیری کھلی دیکھو گے کہ ہے کثرت میں وحدت کیا؟

شفق از خود پرستی جلوۂ عرفاں کجا بینی
بُت پندار بشکن کز خود بینی خدا بینی

شفق عمادپوری

مردوں اور عورتوں کی اخلاقی حالت

طبیعت انسانی کا خاصہ یہ ایک مشہور مقولہ اور مقبولہ امر ہے، کہ انسان کی طبیعت خوش آمد پسند واقع ہوئی ہے؛ اچھے سے اچھا، فہمیدہ سے فہمیدہ، اور عقلمند سے عقلمند، آدمی بھی، جس وقت اس سے اس کی تعریف کیجاتی ہے، خواہ وہ کسی قدر مبالغہ آمیز ہی کیوں نہو، ضروری محظوظ اور مسرور ہوجاتا ہے، لیکن جہاں یہ مسرت و انبساط ہے وہاں یہ بھی بات ہے، کہ جس وقت اس سے اس کی برائیوں کا اظہار کیا جاتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی خفیف اور اس کے مقابلہ میں بالکل ہی سچ اور ناقابل اشتباہ کیوں نہو مگر وہ اس کی ناخوشی اور رنجیدگی کا باعث ہوتا ہے؛ روزمرہ کے تجربہ اور رات دن کے مشاہدہ نے یہ امر اچھی طرح پایۂ ثبوت کو پہونچا دیا ہے، کہ اچھی بات کو سنکر خوش اور بری بات کے سننے سے رنجیدہ ہوجانا طبیعت انسانی کا ایک مسلم خاصہ ہے؛ اسی لیئے دانشمند اور ذی فہم ناصح جب کسی شخص کو نصیحت کرتا ہے، تو نہایت پاکیزہ۔ نہایت پسندیدہ الفاظ ایک خوش آیند اور خوشگوار لہجہ میں استعمال کرتا، اور اس کی سچی بھلائی۔ اور سچی خوبی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ سامع کی طبیعت اس نصیحت کا اچھا اور نہایت اچھا اثر، اور وہی اثر جو ناصح کا مفہوم اصلی اور مقصود حقیقی ہوتا ہے، بڑی عجلت، بڑی سرعت، اور بڑی سہولت کے ساتھ قبول کرلیتی ہے؛ اور اگر نامناسب الفاظ اور ناگوار طرز بیان کو ذریعہ

اصلاح قرار دیا جاتا ہے، تو اس کا نتیجہ مخالفت اور برافروختگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسی قسم کے غیر مفید نتائج آجکل اس بحث کے متعلق ظہور میں آرہے ہیں، جو مردوں اور عورتوں کے بارہ میں نہایت شد و مد کے ساتھ متعدد رسالوں میں معتد بہ حصہ لے رہی ہے؛

نامناسب الفاظ کا استعمال اور اس کا نتیجہ

جو مضمون مردوں کے خلاف لکھا جاتا ہے اس میں مردوں کو جابر، ظالم، اور بیرحم جیسے سخت الفاظ سے مخاطب کیا جاتا ہے، اور ایک ناقابل برداشت طریقہ پر کوشش کیجاتی ہے، کہ ان کو ایسا ہی ثابت بھی کیا جاسکے، اسی طرح جو مضمون عورتوں کی مخالفت میں شائع ہوتا ہے، اس میں عورتوں کو مکار، بیوفا، اور ناقص العقل کہا جاتا ہے، اور نہ صرف کہا جاتا ہے، بلکہ اس کے ثابت کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کیجاتی ہے، جس سے طبیعتوں میں اشتعال پیدا ہو کر ایک فریق دوسرے کی مخالفت پر آمادہ اور اسکو ترکی بترکی جواب دینے پر کمربستہ ہوجاتا ہے، اور نصیحت کا مفہوم اصلی اور منشاء حقیقی بالکل مفقود ہوجاتا ہے، یہ کیوں ہوتا ہے؛

صرف اس لیے کہ نصیحت کا پیرایہ اور اصلاح کا طریقہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جو فطرتی طور پر طبیعت کو اسی نتیجہ پر پہونچاتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

مردوں کو جابر، ظالم، اور بیرحم، عورتوں کو مکار، بیوفا، اور ناقص العقل، جیسے سخت اور کریہ الفاظ سے مخاطب کرنا، پھر ان باتوں کے ثابت کرنیکی

سعی اور فضول سعی کرنا، کامیاب ہونا تو کیا معنی، اور اُن دونوں میں مخالفت کا پیدا کرنا ہے؛

طرز تحریر اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ہمارے ذی علم ریفارمر قوم کی اصلاح کے متعلق مضامین نہ لکھیں، نہیں، لکھیں، اور ضرور لکھیں لکھیں اور زور کے ساتھ لکھیں، مگر وہی پاکیزہ اور شستہ پیارے پیارے الفاظ ہوں، جو اپنا بہترین اور عمدہ تریں اثر کئے بغیر نہ رہیں؛ اور وہی دلکش، دل آویز اور دل کو لبھا لینے والا طرز تحریر ہو، جو ایک نظر پڑتے ہی پڑھنے والے کے دلکو اپنی برقی اور مقناطیسی کشش سے اپنی طرف کھینچ لے۔

الزامات کی تحقیق الفاظ اور طرز تحریر کی موزونیت سے گذر کر، اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ الزامات جو مردوں اور عورتوں پر عاید کئے جاتے ہیں کیا فی الحقیقت وہ صحیح طور پر اون سے متعلق ہوسکتے ہیں؟ یا صرف ایک نتیجہ اشتعال ہے؟ جو ایک فریق کو دوسرے کی نسبت الزامی جواب دینے پر مجبور کرتا ہے؛

چونکہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ اور رات دن کا مشاہدہ، نیز آئے دن کے پیش آنے والے واقعات بظاہر ہمکو یقین دلا رہے ہیں، کہ مرد اپنی عورتوں کے ساتھ طرح طرح کی سختی اور جبر و تعدی عمل میں لاتے رہتے ہیں، اور عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ قسم قسم کی بے وفائی اور مکاری کا برتاؤ کرتی رہتی ہیں، اس لیے ہم بادی النظر میں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں، کہ فی الواقع ہر دو فریق کی نسبت یہ الزامات صحیح معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن کیا صرف اسی قدر تحقیق ایک کامل تحقیق کہی جاسکتی ہے؟ کیا ہمکو اسی قدر تحقیق پر اکتفا کر لینا چاہیئے؟ نہیں ہرگز

نہیں، سرسری اور بادی النظری تحقیق پر رائے قائم کر لینا سخت غلطی ہوگی، بلکہ ہمکو ان الزامات کے اصلی اور حقیقی اسباب پر۔ غائر اور عمیق نظر ڈالنی چاہیئے، اور ایسی چھان بین کرنی چاہیئے، جس سے واقعیت کا انکشاف پورے طور پر ہو جائے؛ قدرت نے عورت اور مرد کو ایک سی شکل و صورت، ایک سا ڈیل ڈول، ایک سے قوائے ظاہری و باطنی، عطا فرمائے ہیں، بجز ایک خاص فرق تذکیر و تانیث کے اور کوئی مابہ الامتیاز تفاوت نہیں پایا جاتا؛ اس لیئے ہم باعتبار تعدد اعضا کے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دے سکتے ہیں لیکن تعدد کے بعد جب ہم اُن کے اعضا ظاہری و باطنی کی قدر و قوت پر غور کرتے ہیں، تو ہم کو ایک بین فرق نظر آجاتا ہے، اگرچہ ہم اُس کو قدرت کی طرف منسوب نہیں کر سکتے، نہ ہم اس کو عورت کی فطرت قرار دے سکتے ہیں مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ عورت کی دماغی حالت نہایت تاریک اور اُس کی قوت عقلیہ، بحالت موجودہ نہایت کمزور پائی جاتی ہے؛ اس مسئلہ میں اگرچہ حکما کے اقوال بہت کچھ مختلف ہیں اور فلاسفر بھی باہم بہت بڑا اختلاف رکھتے ہیں، کسی کا قول ہے، کہ "علم فزیالوجی کی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ عورت کا دل۔ دماغ اور گردے وغیرہ بمقابلہ مرد کے قدرتاً کمزور واقع ہوئے ہیں"، اور کسی کا مسلک اس کے برعکس ہے؛ لیکن ہمکو ان مختلف خیالات سے کوئی بحث نہیں ہماری رائے میں اس وقت ان متضاد خیالات کو مابہ البحث بنانا، موضوع زیر بحث کے لیے ایک غیر ضروری امر ہے، ہم ان خیالات سے

علیحدہ ہوکر ایک تیسری بات دکھانی چاہتے ہیں، جو عورت کے دماغ کی تاریکی اور اس کی کمزوری عقل کا ایک خاص سبب ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، کہ عقل ایک بڑھنے اور گھٹنے والی چیز ہے، جس کا مدار اس کوشش پر ہے کہ جو اس کے متعلق کیجائے، اور جس کا بہترین ثبوت ہر انسان کی سوانح عمری ہوسکتی ہے، تجربہ نے اس امر کو پورے طور پر ثابت کردیا ہے، کہ علم انسان کی عقل کی ترقی اور افزونی کا سب سے اعلیٰ اور مفید ذریعہ ہے، اور یہی انسان کے دماغ کو روشن بنا دیتا ہے، یقیناً یہ امر اس قدر ناقابل اشتباہ ہے، جس میں کسی شخص کو شک اور شبہ کی گنجایش نہیں مل سکتی، اور یہ انسان کے وہ حالات ہیں جن کو ہر شخص روز روشن کیطرح اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں: پھر جس وقت ہم مرد و عورت کی اکتسابی حالت، اور علمی لیاقت پر غور کرتے ہیں، تو ہمکو مرد تمام لازوال دولت سے مالامال نظر آتا ہے، اور عورت علم کے نام سے بھی ناواقف معلوم ہوتی ہے، گویا اس کو مرد سے وہ نسبت بھی نہیں ہے جو ایک کو ایک ہزار سے ہوتی ہے، پس معلوم ہوا کہ یہی اصل سبب ہے اس کے دماغ کی تاریکی اور عقل کی کمزوری کا، ورنہ عورت کا دماغ خواہ کیسا ہی محدود پیمانہ پر تیار ہوا ہوتا، پھر بھی اس قدرتی باغ میں وہ پھول ضرور ہی کھلتے، جن کی پود قدرت نے اپنے دست قدرت سے لگادی تھی، مگر وہ کب کھلتے جب کہ اس کی آبیاری علم کے پانی سے کی جاتی، ہر چیز جب تک اپنے قدرتی مرکز پر قائم رہتی ہے اس وقت تک اس سے، اس مختار حقیقی کی صحیح طور پر تکمیل ہوتی رہتی ہے، جو واضع کا اس کے وضع کرنیسے تھا

لیکن ہمارا غلط استعمال اُس اصل مقصود کو غلط نتیجہ پر پہونچا دیتا ہے، علم صرف
مرد ہی کے خانۂ دماغ کا روشن چراغ نہیں ہے، بلکہ عورت کے دماغ کی تاریکی
کو بھی کافور کردینے کے لیے شمع کافوری ثابت ہوا ہے، مردوں نے
اُس بدبختی سے صرف اپنے ہی دماغ کو منور کرنا پسند کیا، اور عورتوں کے
لیے اُس کو غیر مفید تصور کیا، یہی غلط فہمی سب خرابیوں کی جڑ قائم ہوگئی،
جس کی مختلف شاخیں، مختلف اطراف میں، مختلف اشکال سے پھیلی ہوئی
نظر آتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ بحالت موجودہ عورتوں کی ناقص العقلی
مکاری اور بیوفائی کی مثالیں، عورتوں ہی کے افعال میں زیادہ تر ملتی ہیں،
جس کے جواب میں مردوں کی جانب سے بدرجۂ مجبوری باستثنار السنہ او جبرو
سختی عمل میں آتی ہے، اور اس لیے مردوں پر وہ الزامات جو اُن پر
لگائے جارہے ہیں، ایک حد تک صادق نہیں آتے، لیکن ساتہ ہی ایسے
ہم عورتوں کو بھی بالکل بے قصور پاتے ہیں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی
جہالت کے اصلی اور حقیقی باعث یہی مرد ہیں، خود عالم بنے اُن کو جاہل
رکھا، خود متضاد صورتیں اختیار کیں، خود جہالت کو اپنا انیس، جلیس، اور
رفیق زندگی بنایا، اور خود ہی اب یہ شکایت ہے، کہ اُس سے
غیر مفید نتائج کیوں پیدا ہوئے؟

تمثیل | یہ بالکل ایک ایسی مثال ہے، کہ ایک شخص اپنی عورت کو
ایک ایسی کوٹھری میں بند کردے جس میں نہ روشن دان ہو، نہ روشنی
کے آنے کا کوئی اور راستہ ہو، بلکہ اندھیرا گھپ ہو، بقول شخصے کہ
ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا ہو، اور جس میں رکھی ہوئی چیزیں کبھی اُس عورت
نے دیکھی بھی نہ ہوں، پھر وہ شخص اس صورت سے اُس کوٹھری کی

چیزوں میں سے کسی چیز کے ڈھونڈھنے اور تلاش کرنے کو کہے، اور وہ عورت تعمیل حکم میں، اُس چیز کی جستجو کوٹھری کے چاروں کونوں میں کرتی پھرے کسی چیز میں اُس کا ہاتھ لگے اور کسی میں پیر، اور کسی چیز پر وہ خود ہی اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑے، اور اس اندھا دھند حرکت سے مختلف چیزیں ٹوٹ پھوٹ جائیں، پھر وہ شخص اُس عورت سے اُن چیزوں کے ٹوٹ جانے کی بابتہ باز پرس کرے، خشمگیں ہو، اور سخت سُست کہے، مگر اپنے کیے پر نادم نہو، تو وہ کون شخص ہے؟ جو ایسے شخص کی ایسی حرکت کو، دانائی، اور عاقلانہ کارروائی پر محمول کرے گا، وہی جو خود اس نادانی میں مبتلا ہے،

اعتراض | اس امر کے ثابت ہو جانے پر کہ عورتیں فطرتی طور پر مکار، ناقص العقل، اور بیوفا واقع نہیں ہوئی ہیں، بلکہ یہ ایک دوسری ہی چیز کے اثرات ہیں، جو عورتوں کی فطرت میں داخل کیے جاتے ہیں، مردوں پر پھر وہی اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے، جس میں سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے، کہ مردوں نے عورتوں کو جہالت میں پھنسا اور علم سے بے بہرہ رکھا، یہ مردوں کی ایک ایسی ظالمانہ کارروائی ہے، جس کے بدترین الزام سے وہ کبھی رستگاری حاصل نہیں کر سکتے، اور اُسی ظلم کا نتیجہ ہے کہ آج عورتوں کے اخلاق پر مختلف رنگ کے وہ بدنما دھبے پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ مکار، ناقص العقل اور بے وفا قرار دیجاتی ہیں، اس لیے مردوں کی نسبت جو کچھ الزامات لگائے جاتے ہیں وہ سب اپنی جگہ پر صحیح معلوم ہوتے ہیں، مگر نہیں یہ اعتراض بھی اپنی جگہہ صحت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا،

ایک عام غلط فہمی | کیونکہ اس پردہ میں ایک ایسی غلط فہمی مخفی ہے جس کا انکشاف اصل واقعہ کو ظاہر کردے گا، اُس وقت وہ اعتراض خود بخود اُٹھ جائے گا، اور ثابت ہو جائے گا، کہ فی الواقع مرد بھی اس معاملہ میں بالکل بے قصور ہیں، اور ہرگز اُن الزامات کے مستحق نہیں جو اُنکی نسبت کہے جاتے ہیں؛

عورت اور مرد میں جو فطری اور ازلی ربط الفت اور سلسلہ موانست ہے اُس سے کون واقف نہیں، وہ زرین اصول فطرت، یعنی وہ باہمی محبت، جس نے ابتدائے آفرینش سے دونوں کو ایک روح دو جسد ایک جان دو قالب بنایا کون نہیں جانتا؛

عورت اور مرد کا باہمی اتحاد | وہ سب سے پہلا اور اکیلا انسان، جس نے سب سے پہلے اس دنیا میں قدم رکھا، اور ابو البشر کا خطاب پایا، جب تنہائی سے تنگ آکر گھبرانے اور پریشان ہونے لگا، تو عورت ہی اُس کی مونس تنہائی، اور باعث شکیبائی ہوئی، عورت ہی نے اُس کو اتحاد اور یگانگت کی شاہراہ دکھائی، اور تکثیر نسل انسانی کی تدبیر بتائی؛ انسان کا وہ فطرتی جذبہ، یعنے محبت، سب سے پہلے عورت ہی کی جانب مائل ہوا۔ اور انسان سب سے بیشتر اسی کا فریفتہ اور دلدادہ ہوا۔ اسی کا سب سے اول اور سب سے زیادہ وہ ہمدرد اور غمگسار رہا، مخلوقات عالم میں مرد کے لیئے قدرتی طور پر عورت ہی سب سے اچھی اور سچی رفیق زندگی پیدا ہوئی ہے؛

لانگ فیلو کی مقولہ ہے کہ جس طرح کمان میں چلہ ہوتا ہے، ویسی ہی میاں بی بی کی مثال ہے، کمان کو خم دینا یا اُس کو چلانا چلہ کے بغیر محال ہے

اسی طرح ان دونوں کی زندگی منشاء قدرت کے موافق بسر ہونا ایک دوسرے کی شرکت کے بغیر محال ہے،

عورت کی قدر | یہ ایک مانی ہوئی بات اور مسلمہ اصول ہے، کہ ہر شخص اُس چیز کی سب سے زیادہ قدر و منزلت اور نگہداشت کرتا ہے، جو اُس کو سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے، گویا ہر چیز کی وقعت اور حفاظت کا معیار اُس کا درجہ مقبولیت اور مرتبہ محبت ہے، جو چیز جس قدر مرغوب محبوب اور منظور نظر ہوتی ہے اسی قدر انسان اُس کے محفوظ رکھنے کی کوشش، اُس کی افزونی وقعت اور ازدیاد قدر و قیمت کی سعی اور اُس کے لیے بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کی تدبیر کرتا ہے، اسی طرح چونکہ مرد عورت کو جو اُس کی سب سے بڑی غمخوار سچی ہمدردی کی بہی خواہ ثابت ہوئی، اور قدرتی طور پر اُس کی رفیق زندگی بنائی گئی ہے دل سے عزیز رکھتا ہے، اس لیے اُس کی بہتری اور بہبودی کی فکر کرتا اُس کی نگہداشت کو اپنا فرض اعلیٰ سمجھتا ہے، پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جان بوجھکر سوچ سمجھکر ایک ایسے قابل قدر عطیہ قدرت اور ایسی لازول دولت علم سے اسکو محروم رکھتا، بلکہ یقیناً وہ اس خوشنما اور بیش بہا زیور علم سے اُس کو ضرور آراستہ کرتا،

اثبات غلط فہمی | مگر اُس کی سمجھ نے غلطی کی، وہ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہوا، وہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ بیش قیمت زیور میری پیاری اور عزیز چیز کو بھی خوبصورت بنا سکے گا، بلکہ وہ اس نتیجہ پر پہونچا، کہ اُس کی اخلاقی حالت بگڑ جائے گی اور اُس سے اُس حسین چہرہ پر جو نیکی اور سادگی کے سانچہ میں ڈھلا ہے بدنما دھبے پڑ جائیں گے، اُس سے اپنی رہے

اور اپنی عقل کے موافق اُس کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کا برتاؤ کیا۔ گو کہ اُس نے عورت کو ایک غلط رستہ پر چلایا لیکن نیت اوس کی اُس کو اُس منزل مقصود پر پہونچانے کی تھی۔ جو عورت کے لیے بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید خیال کی جا سکتی ہے، اس صورت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے، کہ اُس نے عورت پر ظلم کیا، جبکہ صریح طور پر یہ صرف ایک غلط فہمی ثابت ہو رہی ہے مرد اگر مرد رہے، اور عورت۔ عورت تو یہ کبھی ممکن نہیں کہ مرد عورت کے لیے جابر۔ ظالم اور عورت مرد کے لیے مکار اور بے وفا ثابت ہوسکے، یہ دونوں کی فطرت کے بالکل خلاف امر ہے، ایسا صرف اُسی وقت ہوسکتا ہے۔ جبکہ وہ اپنی قدرتی مرکز سے ہٹ جائیں۔ لیکن اُس وقت نہ مرد۔ مرد رہتا ہے نہ عورت عورت، سو جو وہ حالت اس امر کی بیّن دلیل ہے، جبکہ مرد غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے اور عورتیں جہالت کی تاریکی میں پھنس گئیں تو ان برائیوں کا اظہار کہ جو اس حالت کا نتیجہ لازمی تھا۔ ہونے لگا، لیکن نہ مرد اپنے صحیح معنی میں مرد رہا نہ عورت عورت۔ اس لیے اس صورت میں یہ کہنا کہ مرد جابر اور ظالم ہیں اور عورتیں بے وفا اور مکار ہیں باعتبار منشا رقدرت اور اصول فطرت کے خود ہی غلط ہے، غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ عورت ہی مرد کی ماں ہوتی ہے، عورت ہی اُس کی بہن۔ عورت ہی اُس کی بیٹی۔ عورت ہی اوس کی بی بی۔ پھر جبکہ ایسے اہم تعلقات باہم وابستہ ہیں تو کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ مردوں نے عورتوں کو تاریکی میں ڈالنے اور نقصان پہونچانے اور ذلیل کرنے کے خیال سے ذی علم

نہیں ہونے دیا، جبکہ ہر طرح پر عورتوں کے نقائص خود مردوں ہی کے نقصانات ہیں، اور مردوں سے ایسے متعلق ہیں کہ وہ اُن کے اثرات سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے، اس لیے یہ امر بلاشبہ پورے طور پر ثابت ہے کہ مردوں نے صرف ایک غلط فہمی کی ہے جسکو اجتہادی غلطی سے زیادہ نہیں کہہ سکتے، اور جو ایک مقتضاء بشریت ہے محض ایک غلط فہمی کی وجہ سے انپر ایسے الزامات صحیح طور پر قائم نہیں کئے جا سکتے، بلکہ جس طرح عورتیں بے قصور ہیں اسی طرح مرد بھی بے خطا سمجھے جانے کے لائق ہیں،

اصلاح اب رہی یہ بات کہ ان خرابیوں کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے، اس کے متعلق بے شمار کوششیں کیجا رہی ہیں، ہزاروں مصلحان قوم اس غلط فہمی سے واقف ہو کر ان لوگوں کو چلا چلا کر خواب غفلت سے بیدار کر رہے ہیں جنھوں نے ابھی اس میٹھی نیند کا چسکہ نہیں چھوڑا ہے، لیکن کہاں تک سوتے رہیں گے آخر جگانے والے جگا کر رہیں گے؛

نور احمد۔ وکیل۔

شُکریّہ

دنیا کے مہذب ممالک کی قوموں میں شکریہ کا اس قدر لحاظ ہے کہ اسکی خلاف ورزی ایک اخلاقی جُرم خیال کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس کا اثر ہماری روزانہ زندگی یا یوں تصور فرمائیے کہ روزانہ طرزِ معاشرت پر اس قدر غالب آگیا ہے کہ بات بات پر شکر گذار ہونا پڑتا ہے حتیٰ کہ حرکات اور سکنات بھی اس اعلیٰ ترین اور پاکیزہ اصول سے مستثنےٰ! نظر نہیں آتے +

لیکن مشاہدات کے تجربہ سے اور بھی بہت سی ایسی ذی روح مخلوق معلوم ہوئی ہے کہ جس کو فیاض قدرت نے اس تمام صفت سے محروم نہیں رکھا، گو شکریہ کا طریق اظہار ان میں مختلف ہے،

شکریہ شکریہ اُس جذب نامتناہی کا نام ہے کہ جو جسم کے تمام حصص سے منتقل ہوکر ایک خوشگوار مسرت کے ساتھ زبان سے ادا ہو جائے، یعنی وہ حقیقی جذبۂ دل جو احسانات کے مقابلہ میں اظہارِ خیالات کا کافی قائم مقام ہو۔ مزید توضیح کے لیے میں ایک مثال بیان کرونگا۔ وہ یہ کہ فلسفۂ منطق کی رُو سے کسی چیز کے اثبات کے لیے ہمیشہ اُس کے خلاف سے بحث کی جاتی ہے اور جب تک وجہ ثبوت کا طریق استدلال قوی نہو اُس کی صحت ہمیشہ مشتبہ رہتی ہے مثلاً رات نہو تو دن کی تمیز کیا۔ محنت نہ ہو تو راحت کیسی۔ احسان نہ ہو تو شکریہ کہاں۔ تعرف الاشیاء باضدادھا؟

غالباً شکریہ کے صحیح مفہوم کے لیئے مذکورہ بالا بیانات کافی ضمانت ہیں اب میں چند زندہ اور نمایاں مثالیں پیش کرکے شکریہ کا غالب اثر سوسائٹی پر ثابت کرونگا +

شکریہ کے مختلف طریق ہیں اور جہاں اُس کے مختلف طریق ہیں وہاں اُس کے اظہار کے بھی مختلف ذرائع ہیں۔ ایک ہندی مثل کے مطابق کہ ہمارا رُواں رُواں شکرگزار ہے،، کوئی چیز ہمیں دی جائے تو ہم شکریہ کے ساتھ لیں اور کوئی چیز ہم پیش کریں تو شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے۔ جہاں کسی سے کوئی غیر معمولی خدمت سرانجام ہوئی اور شکریہ کے رزولیشنوں کا تانتا باندھ دیا گیا ہماری انجمنوں اور کلبوں میں صدہا رزولیشن ہر روز شکریہ کے کسی نہ کسی واقعہ کے متعلق پاس ہوتے رہتے ہیں

چھوٹی چھوٹی باتوں میں بعض اوقات ہم آنکھ یا ہاتھ کے اشارے سے یا کسی اور حرکت جسمانی سے شکریہ کا اظہار کرتے ہیں۔

ایک بیرسٹر جب اپنے موکل کی جانب سے مقدمہ کی پیروی میں خاص قانون اور دماغی قابلیت صرف کرکے ڈگری حاصل کرتا ہے تو علاوہ اُس حق المحنت محنتانہ کے نذرانہ اور اُس پر مزید ٹیکس شکرانہ کے نام سے بھی وصول کرتا ہے (گو یہ ٹیکس جائز ہو یا ناجائز اس سے ہمیں بحث نہیں)

ایک سادہ اور اوسط شخص کی زندگی کو اگر ہمارے وجود سے کچھ فیض ہو تو گو ابھی اُس کی جانب سے شکریہ کا اظہار باقاعدہ نہ کیا گیا ہو، تاہم اُس کے لب و لہجہ سے شکرگذاری کی شان ٹپکتی ہے۔

مذہبی حیثیت سے بھی شکریہ کو ایک خاص وقعت ہے، ہم ہر روز ہر وقت خدا سے کسی نہ کسی آرزو و برآنے کی ملتجی رہا کرتے ہیں اور جب ہمیں

اُس میں کامیابی نصیب ہوتی ہے تو ہم شکرانہ کی نماز کے ذریعہ سے اُسکی بارگاہ میں رطب اللسانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لطیفہ، ایک ظریف اخبار کے انتظامی شعبہ کے متعلق سینے اپنی کچھ رائے لکھ کر بھیجی تو دفتر ظرافت سے مجھے ایک خط موصول ہوا جس کے الفاظ یہ تھے "شکریہ بادلِ ناخواستہ" بس الحق تم سمجھے۔ وکھلانا یہ منظور ہے کہ شکریہ سے تمام تک نہیں رہے احسانات کا بدل بعض اوقات غیر ممکن ہے مگر ایک شکریہ ہے جو شکور کی جانب سے محسن کے دل پر اس کے احسانات کا صحیح اثر محسوس کراتا ہے اور یہ وہ سچا اثر ہے جو خالص بدل اور کھوپرے دل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ شکریہ عقیدت مندی کی ایک شان ہے اور احسانات کا اعتراف۔ کہ جس سے محسن محسوس کرے کہ ہمارا احسان رائگاں نہیں گیا۔

شکریہ جزو اخلاق ہے اور اسکی ادائیگی فرض، اور جب تک ادائیگی نہ ہو اخلاق نامکمل ہے۔

شکریہ سے نہ صرف شکرگذاری مقصود ہوتی ہے بلکہ اُس اعلیٰ ترین اور پسندیدہ صفات کا اظہار بھی ہے جو اطاعت و انقیاد کے نام سے موسوم ہیں۔

غرضکہ شکریہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہو رہا ہے۔

اُردو کا ایک حقیقت پرست شاعر کہہ گیا ہے ؎

منعم کے شکر میں بھی بلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں

سید لطف علی بلگرامی

شکایت صیّاد

ہوئی ہے بلبلِ آشفتہ جاں ملب صیّاد
اسیر کرکے تو اتنا نہ ڈھا غضب صیّاد

بلاکے دام میں گیسوئے خم بخم تیرے
کہ پھانس لیتے ہیں دل کو بے سبب صیّاد

ہے غم نصیب زخود رفتہ، نامراد ہزار
نہیں امید رہائی کی اسکو اب صیّاد

تڑپ تڑپ کے قفس میں غمِ جدائی سے
غریب جان بھی دیدے تو کیا عجب صیّاد

کچھ اسکو قید میں رہنا تو ناگوار نہیں
گلوں کے غم میں ہے لیکن فغاں ملب صیّاد

زباں دراز نہ تھی یہ بوقت آزادی
ہوئی ہے یاس رہائی سے بے ادب صیّاد

پڑے گا صبر اس بے زباں کا کیا تجھپر
دیے ہیں رنج بہت تو نے بے سبب صیّاد

کیا ہے خانہ خراب اور بے وطن ناحق
کسی چمن ہی میں رکھدے قفس کو اب صیّاد

گلوں کی جامہ دری ہر عندلیب تہ ہو
یہ تجھ سے کرتے نہوں خونبہا طلب صیّاد

ہزار صدمے نہ صدمے اُٹھائیگا محوی
ہلائیگا ترے آزار سے نہ لب صیّاد

قفس میں شوقِ رہائی و حسرتِ پرواز
فضول ہے جو اسیروں کا بخت ہو ناساز

محمد حسین محوی

آہ مظلوماں۔ ہماری بہن محترمہ نبت نذر الباقر صاحبہ نے آہ مظلوماں کے نام سے جس کتاب کا اعلان فرمایا تہا وہ مکمل ہوگئی اور اس کتاب کو دیکھکر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ جس قابلیت سے محترم بہن نے اس مسئلہ کو حل کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ قصہ اس قدر پر لطف ہے کہ بغیر ختم کئے کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اس کا منافع تمام یونیورسٹی فنڈ کے واسطے ہے امید ہے کہ ناظرین تمدن اپنی ایک بہن کی حوصلہ افزائی فرماکر اپنے یونیورسٹی فنڈ کو تقویت دیں گے قیمت ۱۲ ار۔ مصنفہ سے کوراٹ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

تیر تاتار

(از محمد شفیع الدین خاں ایم - آر - اے - ایس)

اگرچہ مذہب اسلام اس وقت دنیا کے ہر ایک آباد او غیر آباد ملک میں پھیلا ہوا ہے اور چین - ہندوستان جزیرہ نمائے ہند زانڈ - جزیرہ نمائے ملایا - او رمجمع الجزائر ہند شرقی کے زرخیز اور سرسبز میدانوں کے رہنے والے کروروں کی تعداد میں اس مقدس مذہب کے پیرو ہیں. لیکن عجیب اتفاق یہ ہے کہ ساحل بحر اطلانتک سے لیکر ساحل بحر الکاہل تک جو ممالک اور اقالیم خود مختارانہ طور پر پرچم اسلامی کے زیر نگین ہیں وہ سب کوہستانی - ریگستان - اور بڑے بڑے صحرا اور بیابانوں سے مملو ہیں. کیا شمالی افریقہ کی حکومتیں جن میں مراقش - ریاستہائے بربری طرابلس مصر - سوڈان اور وسط افریقہ کے اسلامی حکومتیں شامل ہیں اور کیا مغربی اور وسط ایشیا کے اسلامی ممالک جن میں عرب - شام عراق - ایران - افغانستان - بلوچستان - ترکستان شرقی یعنے تاتار اور ترکستان غربی میں توران داخل ہیں - ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے چوتھائی رقبہ میں ریگستان اور بڑے بڑے لق و دق بیابان نہ واقع ہوں اور اس لیے نکتہ چین عیسائی معترضین اسلامی بہشت کا مضحکہ اڑانے کی ہمت کر بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں. کہ بہشت میں نہریں - باغات - اور میوے شیریں اور سرد پانی کے چشمے اس غرض سے دکھلائے گئے ہیں کہ ریگستان کے بادیہ نشینوں اور بے آب و گیاہ

بیابانوں کے مسکن گزینوں کو باغ رضواں کے حصول کا بیحد ذوق و شوق پیدا ہو۔ لیکن جیسے ہر معاملہ میں تعصب کی عینک نظر کو خیرہ کر دیتی ہے اور کچھ کا کچھ دکھلاتی ہے اسی طرح بہشت کا مسئلہ بھی معترضین کو نظر آیا اور سیر باغات اور بہتے ہوئے چشموں کی فضا کا ندیدہ صرف عرب کے بادیہ نشینوں کو ٹھہرایا حالانکہ یورپ والے جو نہایت سرد آب و ہوا میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور ریگستان و بیابان کی تصویر جن کے خواب و خیال میں بھی نہیں گذرتی اور جو ایسے ممالک کے باشندے ہیں جنکی ہوش سنبھالتے ہی سربلند پہاڑوں۔ پُر فضا منظروں اور بہتے ہوئے چشموں پر نظر پڑتی ہے پھر بھی اُن سے زیادہ کوئی قوم باغوں۔ پھلوں اور پھلدار درختوں۔ نہروں۔ آبشاروں۔ اور چشموں کی شایق نہیں یہاں تک کہ جن شہروں میں قدرتی مناظر کی کمی ہے وہاں مصنوعی سیر گاہیں (پارک) بنا کر ان کی نقل کرتی ہیں کروڑہا روپے صرف کر دیئے ہیں۔ جن سے صاف ثابت ہے کہ نہ صرف خشک و گرم ریگستان کے باشندوں کو بلکہ عام بنی نوع انسان کو بالطبع اُن چیزوں سے عشق ہے جن کا ذکر اور وعدہ بہشت کی حدود میں کیا گیا ہے۔ ورنہ چاہیئے تھا کہ جیسے عرب والوں کو بہشت کی ٹھنڈے مناظر کی خواہش ہے اسی طرح یورپ کے سرد ممالک کے باشندوں کو اور برفستان کے رہنے والوں کو بمقابلہ عربوں کے دوزخ کی خواہش ہوتی جہاں تاپنے کے لیے آگ اور پینے کے لیے کھولتا پانی اور حرارت عزیزی قائم رکھنے کے لیے پگھلی ہوئی گندھک بافراط موجود ملیگی لیکن تجربہ ثابت کرتا ہے کہ اسکاٹ لینڈ اور ناروے کے برفستانی

باشندوں کو بھی متعدد درختوں پھل پھولوں اور آبشاروں سے شوق ہے مگر ان کے مقابلہ میں عربی باشندوں کے شوق کو ایک ہزار اور ایک کی نسبت بھی نہیں۔

ملک تاتار یا مشرقی ترکستان بھی عجیب ملک ہے سیاح جب ایک آباد مقام سے گھوڑے یا اونٹ پر روانہ ہوتا ہے تو چند میل چلنے کے بعد ہی وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق بیابان اور بظاہر صحرائے بے پایان میں موجود پاتا ہے۔ ہندوستان کے لہلہاتے جنگل اور اناج سے بھرے ہوئے کھیت ان اطراف میں عنقا کا حکم رکھتے ہیں۔ درخت اور بعض اوقات صدہا میل تک درخت تو درکنار گھاس کا تنکا تک نظر نہیں آتا۔ البتہ ریت کے ٹیلے اور پہاڑ جابجا خط افق کو ناہموار بناتے ہوئے دکھلائی دیتے ہیں۔ شب کو ریت اس قدر سرد ہو جاتا ہے کہ ہاتھ لگانا ناگوار گذرتا ہے لیکن گرمیوں کے موسم میں جب کہ دن کے وقت زمین اور آسمان تپنے لگتے ہیں اور کرہ ہوا ایں کوہ نار کا سماں پیدا ہو جاتا ہے تو ان ایام میں رات کے وقت ریگ صحرائی ایسا خوشگوار اور سرد ہوتا ہے کہ مسافر کو اس پر لیٹنا بحد پُر لطف معلوم ہوتا ہے۔ یارقند کے قریب کے ریگستان میں ریتا اس قدر نرم اور باریک ہے کہ مٹھی میں دبانے سے پانی کی طرح گھائیوں میں سے بہ کر نکل جاتا ہے اور جو مسافر رات کو اس پر لیٹتا اور کروٹیں بدلتا ہے تو فرش مخمل کا مزا آتا ہے۔ دن میں ہوا کے ساتھ افق نظری ہمیشہ گرد آلود رہتا ہے۔ اسی حال میں چلتے چلتے راہرو کو معلوم ہوتا ہے کہ دور کوئی پہاڑ ہے جو اس صحرا کو گھیرے ہوئے ہے لیکن چند منٹ میں اس عجیب راز کا انکشاف ہو جاتا ہے

وہ پہاڑ نہیں ہوتا بلکہ نخلستان کے پُر فضا باغات ہوتے ہیں جو گرد کے پردہ میں پہاڑ نظر آتے ہیں۔ سیّاح کو حیرت ہوتی ہے کہ یکایک سماں کیونکر بدل گیا اور کسی ایسے صحرائی جانگزا میں نمونہ فردوس نکل آیا۔ جہاں سبزہ زار کی بہتات۔ درختہائے میوہ دار کی کثرت۔ نہروں اور چشموں کی افراط باغ ارم کا دہوکہ دیتی ہے۔ انگور۔ نارنگی۔ لیموں۔ آڑو۔ شفتالو اور تربوز کے انبار نظر آتی ہیں۔ ایسے ہی شاداب مقام میں ترکستان کا کوئی نہ کوئی شہر و قصبہ آباد ہے جہاں بازار بھی ہوتا ہے قصبات کے بازار پختہ نہیں ہیں بلکہ لکڑی کے دروں اور ستونوں پر چٹائیوں کا سائبان لگا دیا جاتا ہے یہ بازارات اکثر بیکار پڑے رہتے ہیں۔ صرف پینٹھہ یا بازار کے روز ان کی دہوم دہام اور رونق قابل دید ہوتی ہے جہاں اطراف و جوانب سے سوداگر و دوکاندار جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ہفتہ بہر کے لیے لین دین ہو جاتا ہے۔

مکانات یہاں کے شہروں کے اس طرح پر ہیں کہ بازار اور رستہ کی طرف کوئی دریچہ نہیں ہوتا صرف ایک دروازہ اور صحن ہوتا ہے اس کے بعد مکان صحن میں درختوں کی کثرت ہوتی ہے اور عموماً دیواروں سے اونچے اونچے درخت سڑک کی طرف جھکے نظر آتے ہیں باشندے اس ملک کے سب مسلمان ہیں اور حکومت چین کی ہے۔

ناظرین تمدن براہ کرم اپنے خطوں پر نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں ورنہ تعمیل کی شکایت سے معاف کریں۔ **مینیجر تمدن**

تازہ ستم

دشمن ہوا ہے ناحق چرخ کہن ہمارا   بیش نظر خزاں نے لوٹا چمن ہمارا
گردش چھڑا رہی ہے ہمسے وطن ہمارا   کوئی نہیں جو پوچھے رنج و محن ہمارا
دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

مشہور تھے جہاں میں ہم آن بان والے   جھکتے تھے آستاں پر عرش آستان والے
زیر نگیں تھے سارے نام و نشان والے   دب کر رہے ہمیشہ تاب و توان والے
رفعت نشاں تھا ہی ہر جا علم ہمارا
خورشید تمکنت تھا دست کرم ہمارا

مخفی نہیں کسی سے خلق حسن ہمارا   تہذیب مسلمونکی سب پر ہے آشکارا
ظلم و ستم کسی پر کب ہے ہمیں گوارا   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا
کرتے رہے ہیں احساں ہم اپنے مدعی سے
جھگڑا نہیں کیا ہی ناحق کبھی کسی سے

بیجا مخالفت پر ہم سے ہے کیوں زمانہ   بھولے ہیں کیوں سلاطیں آئین خسروانہ
کرتا ہے خون جگر کو تبریز کا فسانہ   نشتر ہے زخم دل کو حافظ کا یہ ترانہ
شہریست پر حریفاں از ہر طرف نگارے
یاران صلائے عشق است گر میکنید کارے

دنیا میں ہو چکے ہیں گو انقلاب اکثر   تازہ ستم کیا ہے اے چرخ تو نے ہم پر
مسلم کے خون سے کافر کرتا ہے سرخ خنجر   بیداد او ستمگر - بیداد او ستم گر

ہاتھوں سے کفر کے ہی اسلام کی تباہی
فریاد یا الٰہی ! فریاد یا الٰہی

افسوس کیا کہوں میں تھا عشرۂ محرم		دل کو ہلا رہا تھا اہل وطن کا ماتم۔
نظارہ وہ الم کا ہے روبرو جو ہر دم		برسا رہی ہیں آنکھیں قطرے لہو کے پیہم
اسلام کے مشائخ ماری ستا ستا کر
سر۔ دار پر چڑھائی ہمکو دکھا دکھا کر

کوئی ہمیں بتادے دنیا میں بن کے عادل		کیا ہم ہی رہ گئے تھے ایسی جفا کے قابل
اسوقت وہ نہیں ہیں وزجزا کے قائل		جا کر کہاں چھپیں گے ہنگام حشر قاتل
چہرہ ہی سرخ خوں سی خورشید خاوری کا
نزدیک آگیا ہی دوران داوری کا

ارشد بس اب زباں کو تاب بیاں کہاں ہے		مونس نہیں ہی کوئی۔ دشمن تراجہاں ہی۔
فرصت کا وقت کم ہی پر درد داستاں ہے		کر خاتمہ دعا پر اللہ مہرباں ہے
پہونچادے جلد یا رب ہمکو حضور مہدیؑ
ہیں منتظر نگاہیں۔ دکھلا ظہور مہدیؑ

آغا غلام حسین ارشد

عصمت جسطرح یہ امر مسلم الثبوت ہی کہ قوم کی ترقی کا انحصار تعلیم النسواں پر ہی اسیطرح اس میں بھی کلام نہیں کہ رسالۂ عصمت لڑکیوں کے واسطے ایک بیش بہا نعمت ہی جس میں خانہ داری تعلیم و تربیت مذہب وغیرہ پر منتخب اہل قلم کے مضامین نکل رہی ہیں عصمت کنواری لڑکیوں کو فرمانبردار بیویاں اور بیویوں کو سلیقہ شعار گھر والیاں اور گھرانیں بنانے کے واسطے ایک لاجواب چیز ہے۔
جو بیش قیمت کاغذ اعلیٰ درجہ کی لکھائی چھپائی رنگین ٹائٹل سنہری بیل اور تصویر سے مزین ہو کر ہر مہینے شائع ہوتا ہی قیمت سالانہ (عہ) مینیجر عصمت تمدن دہلی سے طلب کیجئے۔

مسلمانوں کے دسترخوان پر ایک ناخواندہ مہمان

بروسے سے دو تین میل ادھر اس مقام پر جہاں کوہ اولمپس کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں قریۃ الیہود ہے جس میں زیادہ تر یہودی آباد ہیں قسطنطنیہ یہاں سے کچھ بہت دور نہیں مگر ان لوگوں کا طرز معاشرت ترکوں سے بالکل علیحدہ ہے سنگین محلوں یا دو منزلوں سہ منزلوں کے بجائے ان کے مکان کچی مٹی اور چھوٹی چھوٹی دیواروں کے ہیں جن میں صاف ستھری ہوا آزادی سے آتی جاتی رہتی ہے زیتون کے خوبصورت باغ اور کھجوروں کے اونچے اونچے درخت چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور یہی ان غریبوں کی جائداد اور اثاثہ ہے۔

بستی کا بڑا حصہ یہودی ہے لیکن کچھ مسلمان اور عیسائی بھی ہیں مدائنہ چونکہ یہاں سے قریب ہے اس لیے ضرورت کی چیزیں مہیا کرنے کے واسطے انکو اکثر شہر میں جانیکا اتفاق ہوتا ہے مگر یہ اپنی حالت میں ایسے مگن ہیں کہ شہری زندگی کو رشک وحسد سے نہیں دیکھتے اور سلطان کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں جس کے عہد سلطنت میں بےفکری سے اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں +

ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کی ابتدائی تاریخوں میں جس کو آج سے تقریباً دس سال ہوئے قریۃ الیہود کا رئیس الدہیہ موسیٰ اپنے گھر میں مغموم و متفکر بیٹھا ہے۔ اسکے ساتھ پر اس کی بیوی خاموش ہے اور سامنے ایک چودہ برس کی مہ جبین لڑکی ضعیف العمر والدین کے لیئے قہوہ

تیار کر رہی ہے. موسم کھلا ہوا ہے اور گو اس نازنین کے گلے میں ایک میلی سی قمیص ہے مگر قدرت نے اس کو حسن کے سانچہ میں ڈھال کر اس طرح دنیا میں بھیجا ہے کہ ایک زمانہ اس کی صورت پر فریفتہ ہو رہا ہے۔

زیور کا نام نشان تک نہیں مگر چاندنی اس کے پاؤں میں لوٹ رہی ہے رات کا پہلا پہر ختم کے قریب ہے مگر چشم کا فر نیند سے آشنا نہیں البتہ افعی کی طرح لہراتے ہوئے سیاہ بال آنا پتہ دے رہے ہیں کہ چمکتا دمکتا چاند اس افعی کو ڈسنے میں پوری پوری مدد دیگا

موسیٰ جو عالم خیال میں ایک ضروری مسئلہ کے حل کرنے میں مستغرق تھا دفعتہً چونک اٹھا اور بیوی سے کہا۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ کی دیکھا دیکھی آزادی نسواں کی گھٹا ٹرکی پر بھی چھا گئی قسطنطنیہ کے بازار قسم کھا سکتے ہیں کہ پچھلی صدی میں سوا کسی خاص ضرورت کے وہ کبھی کسی جوان یا حسین عورت کے قدموں سے آشنا نہ ہوئے مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ اثر بجلی کی طرح تمام ملک میں سرایت کر گیا اور برقع کی آڑ برائے نام رہ گئی۔ خیر ہمیں اس سے زیادہ بحث نہیں سلطنت اس کی ذمہ دار ہے اور اس کے حسن و قبح پر غور کرنا مسلمانوں کا کام ہے لیکن کوئی چیز ہم کو مجبور نہیں کر سکتی کہ ہم اپنے جیتے جی شادی کے فیصلہ کا اختیار مریم کو دیں اس کو اس معاملہ میں رائے دینے کا مطلق حق نہیں۔ تم کو مجھ سے اتفاق کر لینا چاہیئے۔ میری طرف سے مسلمان اور عیسائی دونوں یکساں ہیں۔ لیکن ایسی حالت میں کہ قریتہ الیہود کے کسی خاندان میں کوئی یہودی لڑکا ایسا نظر نہیں آتا جو پیاری مریم کی آیندہ زندگی کو خوشحال بنانے کی اُمید

دلائل کے میں عمل کے مقابلہ میں ادہم کو ترجیح دیتا ہوں۔

(۲)

آرمنی گورستان کے عظیم الشان اور خوبصورت کتبے اُن مٹنے والی روحوں کے نام یاد دلا رہے تھے جو اپنی زندگیاں فلاح قوم پر قربان کر گئے دو پہر کا سناٹا وقت ہے اور کھجور کے تناور درخت ان بیخبری کی نیند سونے والوں کا پہرہ دے رہے ہیں۔ ایسے قیامت خیز وقت میں کہ آفتاب عالمتاب نے کائنات کے ہر ذرہ کو جھلسا رکھا تھا مریم ایک زیتون کے درخت کی آڑ میں خاموش کھڑی تھی لباس کی سادگی نہ صرف اس کے کوارپنہ کا ملکی نشان تھا بلکہ فلسفۂ حسن کا مسئلہ کھلے ہوئے الفاظ میں حل کر رہا تھا پسینہ کے قطرے نرم و نازک رخسار و سپر پیشانی کی طرف سے بہتے ہوئے آرہے تھے اور موتی بن بن کر آب و تاب سے چمک رہے تھے نگاہ شوق انتظار کی تکلیف میں مصروف تھی کہ ہوا کے گرم جھونکے نے زیتون کا ایک پتہ گندھے ہوئے بالوں پر پھینکا یا سموم کی یہ چھیڑ چھاڑ مریم کو اچھی نہ معلوم ہوئی اور وہ نگاہ جو جنگل بیابان کیطرف ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی ہٹ کر درخت پر پہونچی ابھی درخت سے واپس نہ ہوئی تھی کہ ایک نوجوان ترک مریم کے پہلو میں کھڑا تھا جس کے قدموں کی آہٹ نے اس نازنین کی خشم آلود نظر کو بالجبر اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ چونک کر پیچھے ہٹی

ترک " کیوں ؟ مریم ! اس طرح جھجک کر پیچھے کیوں ہٹیں ! کیا ڈر گئیں "!

مریم " یہ تم کب سے گھر سے تھے آیئے خیر سے سپاہی بننے کا بھی شوق ہو

ترک " شوق ہے ہی نہیں بلکہ پورا بھی ہو گیا۔ پیاری مریم تم یہ سنکر خوش ہو گی کہ تمھارا ادہم آج عثمانی فوج میں شامل ہو گیا "!

مریم۔ بیشک بیشک، انسان وہی ہے جس کی زندگی ملک اور قوم کے کام آئے۔
ادہم۔ میرے دل و جان کی مالک مریم کس منہ سے شکریہ ادا کروں غضب کے وقت کہ زیتون کے پتے تک تپ رہے ہیں اور یہ نازک جسم لو کے تھپیڑوں کی برداشت کر رہا ہے اے گلبدن وہ کونسا مبارک وقت ہوگا جب ادہم اپنی جان مریم پر سے قربان کر دے۔
مریم۔ ان فضول باتوں سے کیا حاصل! اب میں جاتی ہوں۔
ادہم۔ اتنی اجازت دو کہ میں یہ نازک پاؤں جو اس قدر تکلیف اٹھا چکے ہیں اپنی آنکھوں سے لگاؤں۔
مریم۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تم شرع موسوی کے بموجب ایسے ہی نامحرم ہو جیسے کوئی اسلئے میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکتے مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو۔
ادہم۔ یہ تو بتاؤ کیا طے ہوا؟
مریم۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا ہوا اور کیا ہوگا بظاہر والد تمھاری طرف مائل ہیں اور والدہ محل کی طرف۔ اچھا خدا حافظ!

(۳)

وہی قریۂ الیہود اور موسیٰ کا گھر۔ صبح کا سہانا وقت ہے طائران خوش الحان چہک چہک کر روز روشن کا استقبال کر رہے ہیں موسیٰ منہ اندھیرے کسی ضرورت سے بروسہ چلا گیا، حسین مریم چھت پر کھڑی نظام عالم کے کارنمایاں دیکھ رہی تھی باد صبا اس کی سیاہ زلفوں سے سرگوشیاں کرتی تھی اور ہٹ جاتی تھی پرند اس کے حسن خداداد پر درود پڑھتے تھے اور اڑ جاتے تھے زمین اس کے پائے نازک کے بوسے لیتی تھی اور لوٹ جاتی

آفتاب جو اولیبیس کی چوٹیوں سے جھانک جھانک کر مریم کو تاک رہا تھا بتیا بانہ آگے بڑھا اور اس کے ساتھ ہی ایک عیسائی جوان نیچے کے گھر میں داخل ہوا۔

مریم کی ما اسکی صورت دیکھتے ہی تعظیم کو اٹھی اور اندر دالان میں لاکر بٹھا مریم کو اوپر سے بلایا اور ان دونوں کو ایک جگہ بٹھا کر باہر چلی گئی

مریم:۔ مسٹر مجل آپ کا مزاج ؟

مجل۔ ! بہ ظاہر تندرست ہوں مگر کوئی رات کوئی دن بلکہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ اس صورت کا خیال دل سے دور ہوتا ہو میڈم واقعات پر غور کرو اور یقین کرو کہ مسلمان سے کبھی نیکی کی توقع نہ کرنا تکثیر از دواج ان کے ایمان کا ادنی ثبوت ہے

مریم۔ مسٹر مجل ! مجھے اس معاملہ میں رائے دینے کا کوئی حق نہیں والدین اس کے مجاز ہیں وہ جو مناسب سمجھیں کریں۔

مجل۔ آپ کی والدہ میری درخواست کو منظور کرتی ہیں آپ کو علم ہو کہ اس وقت ایک لاکھ ڈالر کی جائداد میرے قبضہ میں ہے میں نہایت خوشی سے اسکو آپکے نام منتقل کرسکتا ہوں

مریم۔ اچھا میں اس معاملہ میں غور کروں گی۔

مریم کا فقرہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ موسیٰ گھر میں داخل ہوا اور مجل سلام کرکے مریم کی ما سے کچہ کانا پھوسی کرنے کے بعد رخصت ہوا۔

(۴)

بروسہ میں بارش اول تو یوں ہی برائے نام ہوتی تھی مگر ۱۹۰۲ء کے دونوں سال تو ایسے ظالم نکلے کہ قریۃ الیہود پانی کے نام کو ترس گیا زمین آسمان کا منہ تکتی رہی مگر اس سنگدل کا دل نہ پسیجا ہری بھری لہلہاتی ہوئی کھیتیاں جل جل کر خشک ہوگئیں اور قریۃ الیہود پر ایسی قحط کی بلا نمودار ہوئی کہ موسیٰ کو کئی ہزار درہم کا باغ جو باپ دادا کی نشانی اور موروثی جائداد تھی کوڑیوں کے مول علٰحدہ کرنا پڑا۔ چند ہی روز میں

افلاس کے ڈیرے آ جاگئے اور موسیٰ کے گھر میں سوا اس دولت کے جو قدرت نے حسن کی صورت میں موسیٰ کے گھر پر نازل کی تھی کچھ باقی نہ رہا محل کے واسطے اس سے بہتر کامیابی کا موقع کیا ہوتا اس نے غریب موسیٰ کو قرضہ اور اس کے احسان میں اتنا دبایا کہ سر اٹھانے کی جگہ نہ رہی اور ضرورت نے اسکو مریم کی شادی میں متفق ہونے پر مجبور کر دیا۔

ذی الحجہ کی وسطی تاریکیوں میں ایک رات جبکہ چاند اپنی پوری آب و تاب سے سطح آسمان پر جلوہ گر تھا اور چادر ماہتاب در و دیوار پر پھیلی ہوئی تھی مریم تن تنہا بالاخانہ کی چھت پر بیٹھی مختلف معاملات پر غور کر رہی تھی چشم آہو کو شکست دینے والی آنکھیں جو ہندوستان کے سرمہ اور کاجل سے مبرا تھیں چاند پر گڑ گئیں ریشمین سرخ بلاؤس نے اس وقت مریم کو گل لالہ بنا دیا تھا،

کانوں میں آویزے بالوں میں سیس ہاتھ میں رومال کندھے پہ شال۔

جوانی کا سن مرادوں کے دن گلابی رخسار نشۂ محبت میں سرشار لب لعلیں گل ناشگفتہ تل سیاہ در ناسفتہ۔ موسیٰ کی جان حسن کی کان المختصر لکیر کی فقیر مریم مہ جبین زلیخا کی دوسری تصویر عالم استغراق میں محو تھی ہوا نے ان لبوں کے جو گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ نازک تھے متواتر بوسے لئے مگر وہ اپنے خیال سے نہ چونکی چاندنی کھجور کے درختوں سے چھن چھن کر گری اور جھنجوڑا لیکن تخیل کے اس سرسبز چمنستان نے جس میں ادہم کی محبت کا پھول کھلا ہوا تھا اس کو باہر نہ نکلنے دیا۔ ماں کی اس آواز نے کہ مریم یہاں آؤ اس کے بنے بنائے گلدستوں کو اُجاڑ دیا اور وہ حیران و مایوس ماں باپ کے سامنے آ بیٹھی۔

موسیٰ:- بیٹی مریم گو میرا دلی آرزو یہی تھی کہ تمھاری شادی ادہم سے ہو مگر تم دیکھ رہی ہو کہ محل کا قرضہ ہزاروں تک پہونچ گیا اور قحط نے جان پر بنا دی ہم نے کئی کئی وقت کے فاقے کئے مگر کب تک کرتے جب کوئی صورت

گذارہ کی نہ دکھائی دی تو اسکی طرف رخ کیا اب میں چونکہ قول دے چکا ہوں اور وہ متقاضی ہے آیندہ اتوار کو میں یہ رسم ادا کرتا ہوں اور میری دعا ہے کہ تم اپنی آیندہ زندگی مجل کے ساتھ بہ خیر و خوبی بسر کرو۔

(۵)

جامع ایا صوفیہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں پندرہ بیس ترک شاش بشاش سلطان عبدالحمید کے دوران حکومت پر مختلف رائیں دے رہے ہیں عصر کی نماز ہو چکی ہے اور آفتاب اپنے فرض منصبی کو انجام دیتا ہوا مغرب کی طرف جھکا جا رہا ہے دفعۃً ادہم اپنی محبوبہ مریم کو ساتھ لیے مسجد میں داخل ہوا مریم اس وقت عروسی پوشاک میں تھی اور دولہانی لباس غضب ڈھا رہا تھا اس کے اندر آتے ہی ایک سفید ریش بزرگ آگے بڑھے اور کلمہ طیبہ پڑھا کر مشرف باسلام کیا جسپر تمام حاضرین نے آفرین و مرحبا کے نعرے لگائے اور اس کے بعد مریم کا نکاح ادہم سے شرع اسلام کے بموجب پڑھا دیا گیا اور وہ بجائے والدین کے خدا کے گھر سے سسرال سدھاری مریم نے اب اپنے شوہر ادہم کے ساتھ قسطنطنیہ میں زندگی بسر کرنی شروع کی مگر اس واقعہ نے موسیٰ اور مجل کے دلمیں تہلکہ ڈالدیا مجل کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسنے بڈھے موسیٰ کو پچیس روپیہ کے عوض جیلخانہ بھجوایا اور موسیٰ کے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہ تھی کہ اسنے ادہم پر اغوا کا دعویٰ دائر کیا۔

مجل گو اپنی امیدوں سے مایوس ہو چکا تھا مگر ادہم کو سزا دلانیکو اسکی دولت تھی مگر یہ طرح موسیٰ کو یہ ثابت ہونے پر کہ مریم سن بلوغ کو پہونچ گئی دعویٰ خارج ہوا مگر مجل نے قسم کھائی کہ موسیٰ چاہے جیلخانہ میں سڑ کر مر جائے مگر وہ اپنے مطالبہ سے دست بردار نہ ہوگا۔

(۶)

ان باتوں کو برسوں گذر گئے عبدالحمید خاں معزول ہو کر سالونیکا پہونچے انجمن اتحاد

ترقی کا دعدعدعہ ہوگیا غازی انور بے کے گیت گائے جانے لگے قسطنطنیہ کی حالت میں میں آسمان و زمین کا فرق ہوگیا۔

ایک دن جبکہ موسلادھار بارش ہورہی تھی اور کالی کالی گھنگور گھٹائیں آسمان پر چھائی ہوئی تھیں بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی اور بادل تھم تھم کر گرج رہے تھے رات کا پہلا پہر تھا مگر ہوا کی سائیں سائیں آدھی رات کا سماں بنا رہی تھی مریم جو اس وقت زندگی کے دو پھولوں کی مالک تھی گود کے بچے کو لوری دے رہی تھی زبان ترکی تھی مگر مضمون قریب قریب یہ ہی سا تھا۔ جا ہی پڑو گے دنیا کے دھندے کت پالنا۔ کت نیند۔ سویرے ہوئے تو سویرے بھلے۔ ہماری آنکھوں میں نیند بچہ سوگیا تھا لوری ختم نہ ہوئی تھی مینہ اسی زور شور سے پڑ رہا تھا کڑک اور چمک کا دو دورہ ہی تھا کہ کوئی شخص مریم کے کمرہ میں داخل ہوا جسکی صورت دیکھتے ہی مریم یہ کہتی ہوئی بیتابانہ دوڑی "میری محترم والدہ"۔

ما۔ مریم! خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگائیو! شقی القلب بیٹی تیرا وجود ہمارے واسطے باعث عذاب ہوا! خواہش نفسانی کی مغلوب بیٹی تیری اور محض تیری بدولت ہمارا بڑھاپا برباد ہوگیا تو اور تیرے افعال یقیناً اس قابل نہیں کہ انسانیت کا اطلاق تجھپر ہوسکے! اگر ہم برداشت کرسکتے تجھسے بدرجہا بہتر ہیں جو محسن کشی کے الزام سے محفوظ ہیں! ابسے بہتر تھی موت ایسی زندگی سے جو تجھ جیسی ناہنجار بیٹی کے بعد قدرت نے مجھکو دی! تو نے صرف قریۃ الیہود کو بدنام کیا بلکہ تمام خاندان کی ناک جڑ سے کاٹ دی۔ اے جفا شعار بیٹی سنگدل مریم تجھے دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے ایسی حالت میں کہ تیرا بڑھا باپ محض تیری وجہ سے جیلخانہ میں پڑا ہے مرجا! مرجا! اے مریم مرجا! زمین شق ہو اور تو سما جا۔"

"تمکیث جس کا ہمارا چولی دامن کا ساتھ تھا، تو نے اسکو چھوڑا اور ساتھ دیا

ایک ایسے شخص کا جس سے لغو اور فضول مذہب دنیا میں کوئی نہیں جس ماں کی گود سے علیکر
اور بڑھ کر آج تو اس قابل ہوگئی کہ اپنی بچہ کو لوری دے رہی ہے یقین کر اور یاد رکھ کہ اس کا دودھ
تجھ پر حرام ہے اس وقت تک جب تک کہ تو اپنے اس باپ کو جو صرف تیرے کارن جیل میں مصیبت
رہا ہے رہا نہ کروا دے جیل اس بات پہ آمادہ ہے کہ اگر تو ایک دفعہ اس کے پاس چل کر معافی مانگ لے
تو مریم! تیرا باپ قید کی مصیبتوں سے نجات پائے جیل آج پندرہ روز کے واسطے اپنے حقیقی
ماموں کے پاس سلطنت اطالیہ کا وزیر جنگ ہو کر روم روانہ ہوگیا اور تو یاد رکھ کہ اگر اب بھی
تو اپنے افعال سے تائب نہ ہوئی تو بہت قریب ہے وہ وقت کہ اٹلی تیری ساتھ تمام ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے

(۷)

ستمبر ۱۹۱۱ء ختم ہو رہا ہے اٹلی کے خونخوار حملہ نے طرابلس کے مسلمانوں کو غارت اور برباد کر دیا
قسطنطنیہ میں بچہ بچہ کی زبان پر یہی چرچا ہے آبنائے باسفورس کے کنارہ شام کے قریب ادہم اپنی
محبوبہ مریم کو ساتھ لئے غروب ہونے والے آفتاب کا لطف اٹھا رہا ہے۔ ہوا کی رفتار
دھیمی تھی اور پانی اطمینان سے بہہ رہا تھا دونوں میاں بیوی آبنائے کے کنارے کنارے
اس طرف نکل گئے جہاں چند کھجور کے درختوں کے سوا اور کوئی نہ تھا مریم نے رخ نازک سے
برقع اٹھا کر ادہم کو دیکھا اور کہا۔

کیسی خوشگوار ہوا ہے؟

ادہم۔ گزری قریب ہے اس کی کہ ان سیاہ بالوں کے ساتھ جو صرف مجھ سے کھیلنے کے لئے
بنائی گئے ہیں چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے۔

مریم۔ تم کو ہر وقت ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔ ہاں بتاؤ؟ تم نے طرابلس کے متعلق
کیا فیصلہ کیا حمیت اسلام تم سے کیا کہتی ہے اور ایسی حالت میں کہ ظالم اطالیہ
تمہارے بہن بھائیوں پر ایسے ستم توڑ رہی ہے تم اپنی زندگی کی پروا کرتے ہو اس وقت
کو یاد کرو جب سنہ ۶۶۹ء میں حضرت ایوب انصاری علمبردار اور چند بادیہ نشین عرب

دارالخلافہ قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے اور بہ حالت ناکامی انکی زبانوں سے یہ لفظ نکلے کہ ہمارے خون کا ہر قطرہ جو اس سرزمین پر گرا ہے ضائع نہ جائیگا ہم بیج بو چلے ہیں اور وقت قریب آرہا ہے وہ وقت کہ اس خون سے سرسبز و شاداب پھول کھلینگے اور چمنستان اسلام اس سرزمین پر لہلہا رہا ہوگا ہمارے رسول (صلعم) کا ارشاد پورا ہوگا اور آیا سمجھو وہ وقت کہ مسلمان اس ملک کے مالک ہوں گے۔

ادہم! پیارے ادہم! آخیر میرے نہیں تمہارے باہمت شجاع سلطان محمد ثانی کی تلوار آٹھ سو برس کے بعد ۱۴۵۳ء میں اس سرزمین پر چمکی حسن و اعتقاد کے دریا اسکی دلیں لہریں لے رہے تھے۔ اور حدیث نبوی کی تکمیل اس کا یقین کامل تھا اسکو جو کچھ کرنا تھا وہ کر گیا اور اب تمہارا فرض ہے کہ اسلام کی لاج رکھو اور اس سے پہلے کہ ایطالیہ طرابلس پر متصرف ہو تم اپنی ملک اور قوم پر سے قربان ہو جاؤ۔

مریم کی یہ گفتگو تیر کی طرح ادہم کے کلیجہ میں گڑ گئی مگر ساتھ ہی اسکی بدگمانی نے اس کا حوصلہ پست کر دیا اور اسے یقین ہو گیا کہ مجھکو طرابلس بھیجنے کے بعد مریم محل سے معافی مانگنے کے لیے قریۃ الیہود جانا چاہتی ہے وہ خاموش ہو گیا اور کچھ جواب نہ دیا

(۸)

۲۸- اکتوبر ۱۹۱۱ء کی وہ تاریخ جس میں ایطالیہ نے طرابلس میں قتل عام کیا ہے ٹھیک وہی بندرھواں دن تھا جب محل کے واپس آنیکی خبر تھی قسطنطنیہ کے در و دیوار اپنے بیکس اور بے بس بھائیوں کے خون کے آنسوؤں سے رو رہے تھے اور شجاعان عرب تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے ہوئے چاروں طرف غصہ میں جھومتے پھرتے تھے گو طوفان خیز سمندر بیچ میں حائل تھا مگر ایطالیہ کے مظالم انکی آنکھ کے سامنے تھے واللہ پانی اپنے حرام تھا ہر چند کوشش کرتے تھے کہ میدان جنگ میں پہنچ جائیں مگر کوئی رستہ نظر نہ آتا تھا۔ مغرب کی نماز سے فراغت پاکر ادہم ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں گھر کیطرف لوٹا آخری فیصلہ جو اس نے اپنے دل میں کیا یہ تھا کہ اگر مریم چند روز

کے واسطے تیار ہو جاتے تو میں نہایت خوشی سے میدان جنگ میں پہونچ جاؤں یہ فیصلہ چونکہ مریم کی مرضی کے عین مطابق تھا وہ شادان و فرحاں گھر میں داخل ہوا مگر دیکھتا کیا ہے کہ مریم اور بڑا بچہ محمود دونوں غائب ہیں البتہ مریم کی یادگار اور گیارہ برس کی محبت کا آخری ثمر معصوم شیر خوار بچہ تنہا دودھ کے واسطے تڑپ رہا ہے۔

ادہم کی آنکھوں میں یہ دیکھ کر دنیا اندھیر ہو گئی بچہ کو گود میں اٹھایا بہلانے کی ہر چند کوشش کی مگر معصوم کی زبان کون سمجھ سکتا تھا ہمسایوں کی بہتیری کوششیں کیں دودھ پلانا چاہا لیکن ماں کی گود کا فرق ایک مسلم تھا جو نہ مٹ سکتا تھا تارے ابھری لیکن ادہم کے سر پر تھی اور ہوا کا ہر جھونکا مریم کی بیوفائی قرینۃ الیہود کی بدذاتی کی صدا اٹھ رہا تھا آخر جیتے میں غریب باپ کی گود میں تھا کہ ایک ہچکی آئی اور گیارہ مہینہ کا لال باپ کی گود میں دودھ کو ترستا اور باپ کا منہ تکتا دنیا سے رخصت ہوا۔

قرینۃ الیہود کی خاک چھانی قسطنطنیہ کی گلیاں اور کوچے دیکھے ممکن کوششیں کر ڈالیں اور مریم کی تلاش میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا مگر جدھر پہونچتا تھا ناکام اور جہاں جاتا تھا مایوس مریم جیسی محبوبہ کی دغا ادہم کی زندگی پر ایسی بجلی گری جس نے خرمن ہستی کو جلا کر خاک کر دیا اب بقیہ زندگی زہر معلوم ہونے لگی اور بالآخر دل نے صلاح دی کہ اس دنیا کو سلام اور اس کے تعلقات کو الوداع مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ خودکشی حرام موت ہے طرابلس پہونچ کر شہادت کا درجہ حاصل کروں اور ملک و قوم پر سے فدا ہو جاؤں اس خیال کی تکمیل میں اب کیا چیز سد راہ تھی یعنی اسی دن مصر کی راہ لی اور مشرقی طرابلس میں نخلستان جا پہونچا۔

(۹)

اللہ اللہ پچیس تیس ہزار خانماں برباد ناواقف و معمولی عربوں اور ترکوں کے مقابلہ میں ایک لاکھ مسلح فوج آمادہ پیکار ہے جس کے آرام و آسایش کی ذمہ دار سلطنت اٹالیہ ہے غازی انور بے جس کا نام اس وقت تک جبکہ عالم فانی کی بنیاد قائم رہے اپنے اعمال و افعال کی بنا پر مسلمانوں کے سینوں میں حشر تک منقوش رہیگا چہار دہم کی طرح صفحہ تاریخ پر چمکیگا ان نصیب غریبوں کو جن کے بھائی

اٹالیہ کے ہاتھوں موت کی چاشنی چکھ چکا اور جنکی عمریں کاشتکاری میں بسر ہوئیں ادھر ادھر سے جمع کر رہا ہے اور انسے کہہ رہا ہے کہ شجاعان عرب تمہاری رگوں میں آجتک ہاشمی خون دوڑ رہا ہے اٹالیہ نے جس بیرحمی اور سنگدلی سے تمہارے گھر اجاڑے ہیں اس کا جواب دو۔ مارو یا مر جاؤ۔

۲۵ دسمبر ۱۹۱۱ء کو جب تمام مسیحی دنیا رنگرلیاں منا رہی تھی ریاہ جرنل کینوا کے حکم سے اٹالیہ کی ایک پلٹن طرابلس کے اندرونی حصہ میں روانہ ہوئی اور چند بڈھوں اندھوں ضعیفوں یا بچوں معصوموں اور عورتوں کو پابجولاں مردوداں کے حضور میں لائی۔ مریض جسمانی تکالیف سے کراہ رہے تھے اور عصمت کی دیویاں اللہ کہہ کہہ کر ہاتھ باندھے ہوئے تھیں اپنے منہ نعلوں میں چھپا رہی تھیں۔ مرد ضعیف ستم کئے گئے بچوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں اور عورتیں برہنہ کی گئیں۔ طرابلس کی سرزمین کا ہر ذرہ اپنے ہموطنوں پر خون رو رہا تھا کہ گولیوں کی باڑ نے ان مظلوموں کو شربت شہادت پلا دیا

(۱۰)

شہسوار مشرق جس نے اپنی ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے انیس سو گیارہ سال ختم کرنیکے بعد بارہ سو برس کا پیغام لایا ہے غازی انور بے تین ہزار کے قریب عرب اور ترکوں کو ساتھ لیکر اٹالیہ کے اس مورچہ پر ٹوٹ پڑا جسکی حفاظت کے واسطے اٹھارہ ہزار مسلح لشکر موجود تھا ساحل کی جنگی توپیں مدینی آگ برسا رہی تھیں اور ایک نوعمر ترک مشکی گھوڑی پر سوار باواز بلند پکار رہا تھا۔ بہادرو! کلمہ طیبہ کی حفاظت میں گھر سے اپنی سر و نیز کو اور سنگین اپنی کلیجو نیز عمر فاروق علی مرتضیٰ خالد ابن ولید کے جانشین آج تم ہو قدم پیچھے نہ ہٹے بزدل اٹالیوں کے چھکے چھوٹ چکے ہیں آگے بڑھو بچ گئے تو طرابلس کے مالک کیا تم آئے تو درجہ شہادت۔ چلو چلو کلمہ پڑھو اور بڑھ چلو اٹالیہ نے بھی اس موقعہ پر غیر معمولی شجاعت دکھائی دونوں طرف سے توپخانہ اپنا کام کر رہا تھا اور جری ترک بھار کی طرح بھن رہے تھے کہ دفعتہً سانپ بکلا اندر دیئے نوجوان گھوڑی کو مہمیز کرتا توپچی کیطرف چلا غضبناک گو دے برس رہی تھی مگر اسکا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا ناگاہ بہادر توپچی کے سر پر تھا اور بیاسی تلوار اسکی گردن پر اور اسی طرف کی گولہ باری

بند ہوتے ہی مجاہدین اللہ اکبر کے نعرے لگاتے آگے بڑھے مورچے پر جا پہونچے اور ہزاروں اطالیوں کو تہ تیغ کر ڈالا سہ پہر کو یہ وہ فتح تھی جو یکم نومبر کو ترکوں کے لشکر فیروز ظفر کو حاصل ہوئی مگر فتح کے بعد وہ چند لمحہ نہایت دردانگیز تھے جب نائب کمانڈر ایک لاش کو خاص اہتمام سے دفن کر رہا تھا۔

غازی انور بولے "یہ آپ کا کوئی عزیز ہے؟"

نائب کمانڈر "جی ہاں! یہ میرا شوہر ادہم ہے"

انور بولے "شوہر؟"

نائب کمانڈر "جی ہاں! میں قریۃ الیہود کے مشہور رئیس موسی کی بیٹی مریم ہوں جو اسلام پر ایمان لائی اور ادہم سے نکاح کیا ۲۸ اکتوبر کے خونریز واقعہ کی خبر مجھکو قسطنطنیہ میں پہونچی اور میں بلا اطلاع ادھر روانہ ہوگئی بڑا بچہ میرے ساتھ ہے اسی جنگ میں ایک ہے لیکن چھوٹا بچہ چونکہ شیر خوار تھا اسکو وہیں چھوڑ آئی ادہم میرے لیے باعث شرکت جنگ میری خواہش تھی ہمیں مل کر یہاں آیا افسوس ہے اس سے صرف اسوقت مل سکی جب وہ دم توڑ رہا تھا اور مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ احمد جسکو میں گھر میں چھوڑ آئی تھی اسی رات مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا"

مریم کی تقریر سے تمام لشکر میں ایک سناٹا چھا گیا عرب اور ترک اس کے پاؤں آنکھوں سے لگا رہے تھے اور اب مریم اپنے بڑے بچے محمود کو ڈھونڈھنے نکلی مگر جب وہ زندہ نظر نہ آیا تو لاشوں کی طرف گئی اور ایک لاش کو دیکھکر ٹھٹھکی۔ یہ اسکا لخت جگر محمود تھا۔

میدان جنگ سے جو خط مریم نے اپنے حقیقی بھائی کاظم آفندی کو لکھا ہے ہم اسکی نقل درج کر کے بالفعل اس کہانی کو ختم کرتے ہیں۔ (۱۱)

کاظم آفندی! تم لوگ سمجھ رہے ہوگے کہ مکار بہن دغا دیگئی، آخر یہودن تھی، دھوکہ باز نکلی، مگر! تمہیں تعجب ہوگا یہ سنکر کہ بہن اس نمک کا حق ادا کر رہی ہے جو اس نے مسلمان خاندان کا کھایا تھا اور اس فرض کو پورا کر رہی ہے جو کلمہ توحید نے اس پر اسوقت مقرر کیا جب وہ خانہ خدا میں اسلام لائی، احمد کی موت کانوں سے سنی، ادہم اور محمود آنکھوں کے

سامنے شہید ہوئی، عمر بھر کی کمائی چشم زدن میں برباد اور گیارہ برس کا ساتھ ایک آن واحد میں ہمیشہ کو چھوٹ گیا بھری گود خالی اور پُر لطف زندگی اجاڑ ہو گئی قسطنطنیہ کے عالی شان مکانوں میں آرام کرنے کے بجائے آج نخلستان کے درختوں میں بسیرے لے رہی ہیں، ہوا کے طوفان آسمانی اولے اور مینہ کی جھڑیاں ہمارے سر پر ہیں گھوڑوں کا دانہ ہماری خوراک ہے اور جنگل کی گھاس پھوس ہمارا اوڑھنا بچھونا، آنکھیں اس کی صورت کو اور کان پیارے بچوں کی آواز کو ترس گئے، مگر دل اس نبی برحق کی محبت میں چور ہو رہا ہے جس کے دندان مبارک شہید ہوئے اور جس کی پاک رگ سے خون کی ندیاں بہیں۔ کاظم آفندی تم اور تمہارے وہ بھائی جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں کس دل سے آجکل پیٹ بھر کے کھا رہے ہیں۔ جبکہ ہم کو کئی کئی وقت کے بعد مٹھی مٹھی بھر دانے میسر آتے ہیں کاظم آفندی ایک بیوہ دن کے دودھ سے پلنے والی عورت جس نے تمہارے اسلام پر اپنے لال نثار کئے شوہر کی قربانی چڑھائی باواز بلند کہتی ہے کہ تمہارا کھانا تمکو حرام ہے جبتک تم اپنے دسترخوان سے ایک روٹی ہاتھ اٹھا کر ان خانماں برباد تک نہ پہنچا دو جو اپنی کلیجوں کے ٹکڑے برابر کے بھائی بڈھی ماں باپ کو کھو کر صرف لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حفاظت کر رہے ہیں! کیوں! کاظم آفندی کیا وہ لوگ تمہاری ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں جو اپنی خون بہا کر طرابلس کی مسجدوں کو اسوقت ایسے بچا رہی ہیں کہ انمیں اللہ اکبر کے بدلے تثلیث کی آوازیں گونجیں کاظم آفندی! جب تمہارے دسترخوان انواع اقسام کے کھانوں سے چنے ہوں تو ان مصیبت ماروں کو یاد کرو جو کڑا کے فاقوں میں اس سچے پیغمبر کے دین کی حمایت کر رہی ہیں جس کا کلمہ تم بھی پڑھتی ہو، یہ وہ بدنصیب ہیں جن کے گھر لٹ گئے جن کے پیارے چھٹ گئے جوان جوان بیٹے انکی آنکھوں کے سامنے سو گئے اور ہ رہی ہیں کہ عصمت کی دیویاں انکے ساتھ شہید ہو رہی ہیں کیوں کاظم آفندی کیا ان بھائی بہنوں کا اتنا حق بھی نہیں ہے کہ روئے زمین کے مسلمان اپنے دسترخوان سے ایک ایک روٹی کی قیمت انکو بھیجدیں۔

ناظرین تمدن اپنا چندہ اخبار زمیندار لاہور کی معرفت روانہ کرسکتے ہیں ایڈیٹر

جلد ۔ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء نمبر (۱)

تمدن

معاشرتی، تمدنی، ادبی، فلسفی، اخلاقی، تاریخی اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر ۔ شیخ محمد اکرام ۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

[illegible] پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۔ قیمت فی پرچہ [illegible]

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسلّم ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی صلاح و بہبودی ملحوظ ہے لڑکی لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق ہستی عصمت سے بہتر ناصح مصلح کا ملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں ان کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف با اطمینان بسر کرانے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عصمت ہے عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آدمی کو وہ بے فکر خوش و خرم کر رہی ہیں وہ کس محنت و شفقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں ان کی ذمہ داریاں ان پر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتلائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا +

نہایت تیز کی آب و تاب سنہری جلد درجہ اعلیٰ کا کاغذ صاف ملون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا فرصت میں کہانیاں سنانیوالا مذہب کی وقعت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ہر مہینہ ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں قیمت سالانہ (۳؎)

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)



مولوی محمد عزیز مرزا بی۔اے

تمدّن

مسئلہ حدوث وقِدم عالم

عالم اجسام جن ذرات سے بنا ہے ہم اُن کو اجزائے فردہ کہتے ہیں سمجھ لو کہ یہ فیصلہ ابھی نہیں ہوا کہ یہ ذرات اجزائے لایتجزی ہیں یا دیمقراطیسی ان اجزا کے چھوٹے ہونے کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی۔ ہوا میں جو ذرے پریشان ہو رہے ہیں کہ یوں تو نہیں دکھائی دیتے لیکن کسی تاریکی میں روزن سے شعاع آرہی ہو تو مختلف الالوان ریزے اُن میں سے دکھائی دینے لگتے ہیں اجزائے فردہ کے ساتھ ان ریزوں کو وہی نسبت ہے جو پہاڑوں کو رائی کے دانہ سے۔ اگلے زمانہ کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اجسام کے ٹکڑے ریزے سے پیدا ہوئے ہیں لیکن تحقیق یہ ہے کہ ریزوں سے اجسام پیدا ہوئے ہیں اور بدلائل ثابت ہے کہ ان اجزائے فردہ میں باہم دگر تماس نہیں ہے شیخ الرئیس وغیرہ نے جو ابطال جزء پر دلیل تماس لکھی ہے وہ یہاں نہیں

چل سکتی۔ اور باوجود تماس نہونے کے علاوہ ایسا قوی ہے کہ ہر عنصر کے اجزائے فردہ کبھی اتنے قریب ہوجاتے ہیں کہ وہ منجمد ہوجاتا ہے کبھی اتنے بعید ہوجاتے ہیں کہ وہ ہوا بن جاتا ہے کبھی قرب وبعد میں حالت متوسطہ ایسی پیدا ہوتی ہے کہ وہ عنصر سیال ہوجاتا ہے۔ اس پر بھی عنصر کی حقیقۃ میں تغیر نہیں ہوتا۔ مثلاً برف اور پانی اور بھاپ تینوں ایک ہی چیز ہیں گو یہ عنصر نہیں ہے مگر یہی قیاس ہر عنصر میں جاری ہے جس کے امتحانات ہوچکے ہیں۔ قرب وبعد کی پیدا کرنے والی چیز حرارۃ ہے زمین پر آفتاب کی اتنی ہی حرارۃ پہنچتی ہے کہ فولاد منجمد رہے اور ہیڈروجن بخار کی صورت میں رہے۔ ایک ذوذنب ستارہ میں یہ ممکن ہے کہ آفتاب سے اتنا دور ہوجائے کہ عنصر ہیڈروجن بھی اس میں منجمد یا سیال ہوجائے۔

اسی بنا پر ستارہ ہالی کے متعلق جو مضمون میں نے لکھا تھا اس میں یہ فقرہ لکھا تھا کہ اس میں ہیڈروجن کے پہاڑ اور سمندر ہیں جو آفتاب کے قریب آکر منجمد وسیال نہیں رہ سکتے۔ بخار بن جاتے ہیں اور مشتعل ہوجاتے ہیں اور مشتعل ہونے کے بعد اسپکٹرم میں صاف دکھائی دینے لگتے ہیں تمام حرکات اُن اجزائے فردہ کے جو ہیدروجن میں ہیں۔ اشتعال کی کنہ سمجھنے کے لیے یہ خیال کرو کہ حرارۃ ایک زور ہے جو اجزائے فردہ کے درمیان فاصلہ بڑھا کر منجمد کو سیال اور سیال کو بخار بنا دیتا ہے مگر اشتداد حرارۃ کی صورت میں اجزائے فردہ میں ایسی تھرتھری پڑجاتی ہے کہ اس کے سبب سے ملأ اثیری میں اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ اضطراب اثیری پردہ چشم میں نفوذ کرکے روشنی بن جاتا ہے اور اجسام غیر مشف میں حرارۃ بن جاتا ہے۔ یہ آفتاب کے اجزائے فردہ کی تھرتھراہٹ ہے جس نے

جس نے ایتھر میں ایسا ارتعاش پیدا کر دیا ہے جس کو ہماری آنکھ شعاع سمجھتی یہ شعاع آتشی شیشہ میں سمٹ کر ایسی قوی ہو جاتی ہے کہ روئی کو جلا دیتی ہے اور شیشہ گرم بھی نہیں ہوتا۔ یورپ کے طبقہ محصلین نے ایک عجیب امتحان کیا کہ برف کے ٹکڑے کو آتشی شیشہ کی طرح محدب تراش کر شعاع آفتاب کو اس پر لیا دیکھا کہ برف ذرا نہیں پگھلی اور روئی جل اٹھی۔ یہ ان کا ایک کھیل تھا جس سے یہ راز معلوم ہوا کہ اجزائے فردہ کی تھرتھراہٹ جسے ہم حرارۃ سمجھتے ہیں ایتھر میں سرایت کر کے شعاع بن جاتی ہے یعنی ہمارے جسم کے اجزائے فردہ پر عرق اتصال کا ایک زور پڑتا ہے جس کا نام ہم نے حرارۃ رکھا ہے۔ اور شعاع جب تک ایتھر میں یا جسم مشف میں ہے شعاع ہے حرارۃ نہیں جسم غیر مشف کے لیے وہ حرارۃ ہے شعاع نہیں۔ مشف و غیر مشف ہونا بھی اجزائے فردہ کی چادروں کی تطبیق و عدم تطبیق کے سبب سے ہے یکنیشیا کا گلاس حسب علاوہ شفاف ہوا کرتا ہے اوس سے ایک طالب علم نے بہت جلدی سے سرد کر دیا تو وہ سنگ مرمر سفید کی طرح غیر مشف ہو گیا۔ اور پسا ہوا شیشہ غیر مشف ہو جاتا ہے جسم شفاف میں ارتعاش اثیر منقلب بہ ارتعاش اجزائے فردہ نہیں ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ شیشہ کی قلم کا ایک سرا ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا لیمپ کے شعلہ سے پگھل پگھل کر ٹپک رہا ہے شیشہ کے اجزائے فردہ ارتعاش حرارۃ کے قبول کرنے میں عاصی ہیں ورنہ ہاتھ جلنے لگتا لیمپ کی چمنی کا آدھا ٹکڑا ٹوٹ کر بالشت دو بالشت کے فاصلہ پر میں نے گرتے دیکھا معلوم ہوا کہ شفاف و نازک ہونے کی وجہ سے حرارۃ کے زور کو نہ روک سکا نہ راہ دے سکا۔ اجزائے فردہ کائنات کا تخم ہیں اور اوس کی حرکت دنیا کا اعجاز ہے

جس طرح مختلف اجسام پر چوٹ پڑنے سے مختلف صدائیں نکلتی ہیں یعنے جیسا ارتعاش اُس جسم کے اجزاے فردہ میں پیدا ہوتا ہے ویسا ہی نغمہ اُس سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر عنصر مشتعل کے اجزائے فردہ کے ارتعاش سے ایک خاص مقدار کی موج اثیر میں پیدا ہوتی ہے اُس میں اُس عنصر کا مخصوص رنگ ہوتا ہے۔ ہم اصوات کو سنکر سمجھ سکتے ہیں اور اسپکٹرم کی دھاری دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ اجزائے فردہ میں کس طرح کی تھرتھراہٹ ہے۔ فرق یہ ہے کہ نغمہ وہ صدمہ ہے جو کسی جسم کے اجزاے فردہ میں سے ہوا۔ کے اجزا میں سرایت کرگیا ہے اور شعاع وہ صدمہ ہے جو اثیر میں ہے

سر الیور لاج لکھتے ہیں کہ جس طرح ادراک صوت دلیل بیّن ہے اس بات کی کہ مادہ کے لیے وجود خارجی ہے اسی طرح ادراک شعاع دلیل ہے اس امر کی کہ ملاء اثیری بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ حس سمع کے سوا دوسرا حس ہم نہ رکھتے تو فقط ادراک صوت اس بات کی دلیل تھی کہ ہم سے خارج میں مادہ موجود ہے اور حس لمس ہمارا اگر اور قوی ہوتا تو فقط آفتاب کی خصوصیت نہ رہتی بلکہ تمام کواکب کی شعاع کا بغیر آنکھ کے دیکھے ہم ادراک کرسکتے ہیں جو وجود اثیر کی شاہد ہے یعنی جس طرح اندھا یہ سمجھ سکتا ہے کہ مجھ پر دھوپ آگئی اگر لامسہ قوی ہوتا تو یہ بھی وہ سمجھتا کہ میں چاندنی میں بیٹھا ہوں یا اندھیرے میں ہوں۔

غرض کہ اجزائے فردہ سے تکوین عناصر ہوئی اور اختلاط عناصر سے آفتاب وکواکب پیدا ہوئے اس سے ظاہر ہے کہ اجزائے فردہ کا وجود آفتاب وکواکب سے بیشتر ہے۔ کلارک میکسویل وغیرہ کا قول ہے کہ ہم نے پانی میں سے عنصر ہیدروجن کو جدا کرکے اُس کا اسپکٹرم لیا۔ کولا جو

جو ہزاروں برس زمین میں مدفون رہا اُس میں سے ہیدروجن نکالا اور اسکا اسپکٹرم لیا اُس کی دہاریوں میں ایک ہی طرح کا ارتعاش پایا۔ آفتاب کے اسپکٹرم میں جو عناصر کی دہاریاں ہیں اور ثوابت میں سے شعری یمانیہ وسماک سامح وغیرہ کے اسپکٹرم میں جو عناصر کی دہاریاں اور رنگ ہیں ان میں ذرا فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ان اجزائے فردہ کا ارتعاش جیسا کرۂ زمین کے عناصر میں پایا جاتا ہے ویسا ہی آفتاب میں بھی ہے ویسا ہی ثوابت میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ لاکھوں برس کی کھنگی نے ان میں ذرا بھی تغیر نہیں کیا اور یہ عالم کے تغیرات سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ان کا وجود بد و فطرۃ میں واقع ہوا ہے جب نہ آفتاب تھا نہ کواکب تھے اور ان ستاروں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی یہ اپنی حالت پر باقی رہیں گے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قدیم ازلی اور ابدی و سرمدی ہیں۔ ان کی قومیتہ زوال و حدوث سے محفوظ و مصئون ہے۔ اس کے برخلاف حکیم ہرشل اجزائے فردہ کو ایک کارخانہ کی بنی ہوئی اور ایک سانچہ کی ڈھلی ہوئی چیزوں سے شابہتہ دیتا ہے اور اس سے ان کے مخلوق و مصنوع ہونے کا قیاس کرتا ہے دوسری دلیل اُس کی یہ ہے کہ تعدد قدما کو مطلقاً عقل باور نہیں کر سکتی نہ کہ اتنی لاتعد و لاتحصی چیزوں کے قدیم و ازلی ہونے کو انسان تسلیم کرے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ اجزا قدیم ہوتے تو سب کی ایک ہی سی کیفیت نہ ہوتی حکمائے عصر کا فیصلہ ہے کہ عالم کی حیات حرارۃ آفتاب کے سبب سے ہے اور جتنی حرارۃ اُس کی شعاع بن بن کر فضائے نامتناہی میں تلف ہو رہی ہے یقیناً وہ پھر واپس نہیں آتی۔ دلیل اس پر یہ ہے کہ اگر

یہ نکلی ہوئی حرارت پھر واپس آتی تو راہ میں اُس کی کرہ ارض بھی واقع تھا۔ چاہیے تھا کہ جتنی حرارۃ دن کو آفتاب سے زمین کو ملتی ہے اوتنی ہی رات کو وہ اپنی حرارۃ کے وقت حاصل ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور یہ دلیل بیّن ہے کہ حرارۃ آفتاب سے نکل کر واپس نہیں آتی۔ آفتاب کی حرارۃ کا تلف ہونا ایسا ہے گویا عالم کی جان نکلی چلی جارہی ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک زمانہ میں عالم اس قابل نہ رہے گا کہ اس میں زندگی کا قیام رہ سکے۔ ٹامسن نے انہیں مقدمات سے یہ نتیجہ نکالا کہ عالم کے لیئے ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی اس کارخانہ میں ازلیۃ وابدیۃ کی علامتیں نہیں پائی جاتیں۔ اجزاے ذرہ کے حالات وحرکات دریافت کرکے حکماے وقت نے اسرار کائنات اکثر سمجھ لیے لیکن اثیر کیا چیز ہے یہ مسئلہ ایک عقدہ معقودہ ہے۔ برکلی ایک حکیم الٰہی کا قول میرے دلمیں چبھتا ہے کہ مادہ ارادہ الٰہی کی ایک صورت ہے جو ہمارے مشاعر و مدارک میں پائی جاتی ہے +

علی حیدر طباطبائی

تأسف

ستم برپا کیا پھر اے دلِ ناشاد ماں تو نے
کہ چھیڑی عہدِ ماضی کی غم افزا داستاں تو نے

تری غفلت پرستی نے رکھا محوِ طرب تجھکو
سنی گو بارہا بانگِ درائے کارواں تو نے

تری نفسِ ہیچ دم بھر کی ترا سرمایۂ عشرت تھا
نہ پایا بے خبر ذوقِ نشاطِ جاوداں تو نے

نہ سمجھا معنیٔ نفع و ضرر بازارِ ہستی میں
ہوائے سود میں دیکھا فقط سود و زیاں تو نے

تری لائی ہوئی تھی جو بلا ٹوٹی ترے سر پہ
عبث چھیڑا ہے یہ ذکرِ جفائے آسماں تو نے

کوئی ہمدم بھی دیکھا کوئی غمخوار بھی پایا؟
سبھوں کو تو سنائی درد و غم کی داستاں تو نے

زبانِ آفرینِ خلق سے کچھ کام بھی نکلا؟
دکھائیں تو زمانے کو بہت رنگینیاں تو نے

نہ دیکھی کیا کوئی خوبی بہارِ لالہ و گل میں
کہ گلشن سے اڑایا جا کے بس رنگِ خزاں تو نے

مصیبت کیا پڑی تجھ پر کہ گویا دست و پا توڑے
دکھائی اپنی کمزوری بوقتِ امتحاں تو نے

ابھرنے کی کوئی صورت نہیں بحرِ معاصی سے
ڈبویا لا کے مجھکو اے خرد دشمن کہاں تو نے

یہی ہوگا کہ آلودہ کرے اس خاکِ اقدس کو
اگر پیدا کیا شوقِ سجودِ آستاں تو نے

مجھے تو خود نظر آتا ہے تو اک خاک کا تودہ
گرائی کس پہ برقِ نالۂ آذر فشاں تم نے

تری فریاد نے کھینچا دلِ شیخ و برہمن کو
طلسمِ تازہ باندھا وحشت جادو بیاں تو نے

رضا علی وحشت

زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ

محبت، ـ وہ پری جس کے عالم شمول بازوؤں کے سائے کے نیچے، میں بھی زندگی بسر کرتا ہوں۔ شکر ہے مجھے قاہرہ تک تو لے آئی۔ اس کی تفصیل اب آپ نہ سنیئے کہ آیا میں سینہ پرسکوں لیکر آیا تھا اور متہیج لے کے نکلا یا متہیج لے کر آیا تھا اور پرسکوں لے کر نکلا۔ بازارِ مصر میں تنہا میں ہی اک پرشوق مگر بے مایہ خریدار نہیں آیا ہوں۔ اک سوت کی انٹی والی مجھ سے پہلے بھی گذر چکی ہے۔ بازار میں برقی روشنی ہو رہی تھی، اور ازبکیہ یہ اس حصہ شہر کا نام ہے جہاں میں ٹھیرا تھا۔ ایک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ وہ ادیب شہیر و استاد محترم شبلی جس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے، اپنی علمی صحبتوں میں جو ان کے ساتھ ہی علی گڈھ سے خدا جانے کہاں شاید لکھنؤ چلی گئیں اپنے شاگردوں کو اپنا اور قدیم اُستادوں کا کلام سنا سنا کر طلبہ میں مذاق سخن پیدا کرتے تھے۔ میں بازارِ مصر میں آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں بار بار بازارِ مصر بازار قاہرہ کی بجائے صرف ایک لفظی رعایت کی وجہ سے کہتا ہوں، اہل مصر شہر قاہرہ کو مصر کہتے ہیں۔ نکلتے ہی ایک مصرعہ میری زبان پر بے ساختہ آگیا! ـ ڈانڈا ملا دیا ہے حبش سے تتار کا۔ وہیں مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ یہ مصرعہ مولانا شبلی کے زبان سے سنا تھا مصرع تھا یا پورا شعر، جو انہوں نے فرمایا تھا یہ یاد نہیں مگر میں اسے بار بار دہراتا رہا۔ یہاں کی حالت پر وہ بلفظہٖ صادق آرہا تھا۔ ہمارے شعرا کی سحر و شام کا اجتماع جیسا میں نے یہاں دیکھا اور کہیں

نظر آیا جس قہوہ خانے میں گھس جائیے ، جس ٹرام پر سوار ہو جیے ، اک حبشی نژاد شب رنگ کے پہلو میں ایک ترک سمن بر بیٹھا ہوا ہے . شب دیجور اور صبح صادق ایک ہی میز پر کھانا کھا رہی ہیں یا چائے پی رہی ہیں . (معلوم ہوتا ہے ابھی تہذیب میں مصر نے بالکل ترقی نہیں کی اور السوال سے اور ہندوستان کی کمیٹیوں سے چند درس گویان مدنیت وہاں بھیجدینے چاہیں)

کھانیکا وقت تھا ، اور میں بھوکا بھی تھا . ایک کھانے کے ہوٹل میں - یا یہاں کی اصلاح میں لوکنطہ میں - میں بھی جا بیٹھا . میں جب کبھی ہندوستان سے باہر آیا ، ہندوستان کی ایک خصوصیت کا خیال بہت شدت کے ساتھ دماغ میں آیا . مصر بہت سی باتوں میں ہندوستان سے مشابہ ہے . موسم ملتا جلتا ہے ، پیداوار قریب قریب یکساں ہے .

باشندوں میں اختلاف مذاہب بھی ہندوستان کی طرح ہی شدید ہے ، نئی اور پرانی تہذیبیں دونوں یہاں بھی ہندوستان کی طرح جلوہ گر ہیں ، ہندوستان کی مانند یہاں بھی طرز قدیم اپنی ہستی قائم رکھنے کے لیئے مدافعانہ کوشش میں مصروف ہے ، اور طرز جدید حملہ کناں ہے . سیاسیات میں ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے مخاصمانہ تعلقات کا چربہ مصر میں قبطی اور مسلمانوں کے تعلقات نے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی اتارا ہے . یہ سب کچھ ہے مگر طرز معاشرت میں وہ یکسانیت ہے جسے آنکھیں ہندوستان میں حسرت سے ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں ، یکسانیت ہی نہیں اشتراک بھی ہے . اخبارات کو دیکھئے تو آپ کو یہ خیال ہو کہ قبطی اور مسلمان ایک دوسرے کو کھا جائیں گے ، مگر ہوٹلوں میں ، تناول خانوں میں ، اور گھروں میں جائیے تو دیکھئے گا کہ ایک دوسرے کو نہیں ، ایک دوسرے کے ساتھ کھاتا ہے . سیاسی اور پولیٹکل سب و ستم مصر

میں بھی ایک فن لطیف ہوگیا ہے؛ مگر دونوں جانب کے استادان فن عربی ہی میں اپنا کمال دکھاتے ہیں: اور میرے خیال میں دلجلی کے لیے یہ لازم بھی ہے شاعر کہتا ہے۔

سر بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں مزا لینے والے مزا لے رہے ہیں

ہمنے فرض کیا کہ سر بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں۔ اور یہ بیحد جائے مسرت و خوشی ہے۔ لیکن مزا لینے والے تو مزا اسی وقت لے سکتے ہیں جب وہ ان گالیوں کو سمجھیں۔ یہاں یہ کوشش ہے کہ گالیاں تو ضرور دی جائیں، بغیر اس کے زندگی ایک بار گراں ہو جائے گی، مگر ہم ہندی میں گالیاں دیں گے تم اردو میں۔ اور یہی نہیں بلکہ ہمارا اور تمھارا ہر چیز میں تیل پانی کا ساتھ ہونا ظاہر کیا جائے۔ ہم دہوتی پہنیں گے تم پاجامہ پہنو اور ہاں دیکھنا کہیں کھانا ایک جگہہ نہو۔ تنہا خوری الی الابد تنہا خوری!

مصر میں دوسرا ہی منظر پیش نظر ہوتا ہے۔ مصر میں کیا ان تمام ممالک میں ایک ہوٹل میں آپ کھانا کھانے کے لئے تشریف لیجاتے ہیں۔ تمام خدام یا اٹیالین ہیں، یا یونانی یا ارمنی حسین، سرخ و سفید لڑکے اعلیٰ درجے کا سیاہ کھانیکا سوٹ پہنے ہوئے، نہایت صاف ستھرا کالر لگائے ہوئے، صاف شفاف قمیص جس کے کف اور فرنٹ (سامنے کا حصہ) روشنی میں چمک رہے ہیں زیب بر کیئے آپ کی پذیرائی کے لیے کھڑے ہیں۔ یہ سب "صاحب لوگ" ہیں۔ اس بات کو آپ ہرگز نہ بھولیئے گا کہ اگر آپ کی ملاقات کلکتہ میں، یا بمبئی میں انہیں سے کسی سے ہوگی تو یہ آپ سے بات کرنی بھی ہتک عزت سمجھیں گے۔ ہندوستان پہونچکر ارمنی بھی اپنے تئیں فاتحان ہند میں سے شمار کرنے لگتے ہیں اور یونانی بھی۔

آپ داخل ہوئے اور یہ غلامان پری تمثال دوڑ کر آئے اور آپ کو گھیر لیا؛ ایک کہتا ہے "اہلاً و سہلاً" ایک کہتا ہے "تفضل" ایک آپکا ہیٹ اور کوٹ اتارنے میں مدد دیتا ہے، ایک سلیت اور بید آپ کے ہاتھ سے چھڑی لیتا ہے، ایک میز کے پاس ایک کرسی کو آپکے لیے گھسیٹتا ہے؛ اور فوراً کھانے کی فہرست آپ کے سامنے لاکر پیش کرتا ہے۔ آپنے کھانا انتخاب کر کے اُسے لانے کو کہا۔ وہ آپسے استفسار کے طور پر پوچھتا ہے "نعم یا سیدی؟" آپ چونک اٹھتے ہیں۔ ان لبوں سے "یس سر" کی توقع ہوتی ہے، اور کہتے ہیں وہ "نعم یا سیدی" ایکدم آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ آپ مصر میں ہیں۔ کھانا لایا جاتا ہے۔ طریقہ انگریزی ہے، لانے والے یور دپین ہیں! آپکے دماغ سے پھر یہ واقعہ نکل سا جاتا ہے کہ آپ پارس میں یا روما میں نہیں ہیں کہ اتنے میں عین آپ کے سامنے، مقابل کی کرسی پر، الف لیلہ کے صفحات میں سے ایک تصویر نکل کر آبیٹھتی ہے اور نہایت بے تکلفانہ اور بے دھڑک طریقہ سے، ٹمن جاب کے لیے حکم دیتی ہے۔ وہی الف لیلہ کا عبا ہے، وہی ہارون الرشید کے زمانہ کا قبا ہے، وہی عمامہ ہے اور جمال رُخ روشن ہے وہی۔ امان! یہ مولوی صاحب اس صفائی سے بیٹھے ہوئے ٹمن چاپ اُڑا رہے ہیں! پاس والی میز پر دو اور حضرات، ایک قبا سے عربیت میں، ایک رخست مدنیت میں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آکر بیٹھتے ہیں۔ آپ دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف بھی دیکھتے ہیں اور اپنے دل ہی میں حیران ہوتے ہیں کہ یہ کون ہیں۔ قبا سے عربی آمرانہ لہجے میں کھانے کو حکم دیتا ہے۔ غلمان جنت کے زمرے کا ایک غلام، ان کے لیے بھی کھانا لاتا ہے۔ یہ منظر اب آپ کے لیے معمولی ہو گیا ہے؛ آپکے سامنے پہلے ہی سے ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے ٹمن چاپ خوری کر رہے تھے،

مگر یا بوالعجب! یہ کیا؟ قبا ئے عربی کے سامنے گلاس اور بوتل لاکر رکھی جاتی ہے
اور وہ کاگ کھول کر ایک گلاس اُس عرق کا جس کا تیز بھپکا آپ کی ناک سے
گزر کر دماغ کو ٹکرا کر یہ کہتا ہے، میں شراب ناب ہوں۔ کچھ اور نہ سمجھئے گا۔"
اپنے رفیق کوٹ پتلون کو دیتا ہے۔ اور پھر ایک گلاس اپنے لئے بھی بھر
کر، نہایت اطمینان سے تلچھٹ تک پی جاتا ہے! یہ دُرد آشام آپکے
رہے سہے حواس باختہ کر دیتا ہے۔ یہ جامۂ تقویٰ، یہ لباس مشروع اسلام
اور علنًا مصاحبت صراحی و جام! محتسب کہاں ہے؟ عسس کدھر ہے؟ مگر
تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مسلم صورت، بس بصورت مسلم ہے؛
یہ اور اس کے، آباو اجداد اسلام سے اسیقدر دور رہے ہیں جس قدر مثلاً
ریورنڈ زویمر حضرت نصرانی ہیں؛ اور پکّے متعصب دشمنِ اسلام نصرانی۔ انہیں
اس پر فخر ہے کہ ہمارا خاندان شیوعِ اسلام سے پہلے عیسائی تھا اور اب تک
عیسائی ہے۔ یہ قبطی ہیں۔ نیل مبارک اسلام نے تمام مصر کو سیراب کیا، مگر قبطی
بادیۂ خشک ہی رہا۔ اور اب تو اس بادیہ سے وہ جھکڑ چل رہے ہیں؛ اس
شدت کی بادِ سموم اُٹھ رہی ہے کہ مصر کی مذہبی شادابی معرضِ خطر میں ہے۔
مگر میں اخفای حقیقت کا مجرم ہونگا اگر میرے اس قدر لکھنے سے آپکے
دل پر یہ اثر ہو کہ مصر کے ہوٹلوں میں اسلامی لباس پہنے جو لوگ جام بکف
نظر آتے ہیں، وہ سب قبطی نصرانی ہیں؛ یہ صحیح نہیں۔ وہ سب قبطی نہیں؛
انمیں سے بعض قبطی ہیں لیکن اکثر اور بیشتر مسلمانانِ مصر ہیں یا کلمہ گویانِ شام!
یہ اُن لوگوں کا حال ہے جو اپنا پُرانا قومی لباس پہنے نظر آتے ہیں۔
رہا نوجوانِ مصر، جو اپنے کپڑے پیرس سے سلوا کے منگواتا ہے؛ جو مراقِ فیشن
میں انگریزی رنگیلے رسیلے فوجی لفٹننٹ سے بھی کئی منزل آگے نکل گیا ہے؛

یہ نوجوان مصر یا بقول خود آنکی اصطلاح کے،
"مصر الفتاۃ" اسکی نہ پوچھیئے ۔ انکی زندگی عجیب زندگی ہے ۔ اول تو یہ دن بھر سیر سپاٹے میں بسر کرتے ہیں، اور شام کو گھر آتے ہیں، آرام لینے اور سونے کی غرض سے نہیں، کیونکہ ان وظیفہ شناساں فرض عشرت کے قسمت میں گھر پر بیٹھنا اور آرام لینا کہاں لکھا ہے ۔ انہیں تو گھر پر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا، یہ صبح کے نکلے شام کو گھر آتے ہیں صرف کپڑے بدلنے کے لیئے؛ پیرس کے کسی صنعت کار کے ہاتھ کا (جو درزی گری کو بھی شاعری اور مصوری کے ہمراہ فنون لطیفہ میں شامل کیئے جانیکا بجا مدعی ہے) سلاہوا سوٹ پہنکر مصر الفتاۃ باہر نکلتا ہے ۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے ۔ مگر وہ ہر شب گھر سے بھوکا ہی نکلتا ہے اور کسی رسٹاران (تناول خانہ) میں جاکر کھانا کھاتا ہے ۔ رسٹاران میں، میں نے غلط کہا اسٹاران کے باہر سڑک پر کھانا کھاتا ہے ۔ قاہرہ کے فیشن ایبل بازاروں میں جایئے ۔ دور تک سڑک کے دونوں طرف دکانوں کے سامنے پٹڑیوں پر قطار در قطار چھوٹی میزیں لگی ہوئی ہیں، گرد دو دو چار چار کرسیاں پڑی ہیں ۔ میز پر سفید شفاف چادر بچھی ہوئی ہے ۔ دلدادگان فیشن، ان پٹڑیوں پر لگی ہوئی میزوں پر جاکر کھانا کھاتے ہیں خلقت جوق جوق گذر رہی ہے یہ عالم گذران کا تماشہ بھی کرتے ہیں اور کھانا بھی کھاتے ہیں ۔ اور حق تو یہ ہے کہ میں اپنے دل میں انہیں قابل مواخذہ نہیں سمجھتا ۔ مصر کے اس صاف نیلگوں چادر کے نیچے، اس قدرتی مکوکب شامیانے کے تلے، رہنے کو جس کی چھت میں جڑے ہوے موتی اور ہیرے ایسی دلاویزی سے چمکتے ہیں، یوں کیوں نہ کہوں ساکنان ملاء اعلیٰ جہاں سے شرارت سے

یوں کنان خطۂ خاک کی طرف آنکھ مارتے ہیں) انسان کا دل اس طرح بے اختیار ہو کر چاہتا ہے کہ مصر کی بناہائے محتشم جن کی بنانے میں فراعنۂ قدیم، اور مغرب سے آئے ہوئے فراعنۂ حال نے اپنی ہمتیں صرف کی ہیں، اپنی طرف بلاتی ہی رہ جاتی ہیں۔

آسمان، ہمارے ہندوستان کا بھی صاف ہے، اور دلکش، مگر کم ایسا ہوتا ہے کہ اس گنبد اخضری میں کہیں سفید پلاسٹر سے مرمت نہ کی گئی ہو۔ آسمان مصر اپنے پورے معنوں میں گنبد اخضری ہے۔ آپ دوربین لگا کر بھی دیکھیں تو آپکو کہیں لکۂ ابر نظر نہ آئے گا۔

اور اس وقت آپ کو شاعر کا قول نہایت درست معلوم ہوگا:

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(یلدرم)

اخلاق عزیزی یا مارکس اوف سنیکا - مولوی محمد عبدالعزیز صاحب کورٹ انسپکٹر لکھنؤ نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے تمام ملک پر احسان کیا ہے جس کے مطالعہ سے اخلاق پر خاص اثر پڑتا ہے نوجوان طلباء کے واسطے یہ کتاب خصوصیت سے مفید ثابت ہوگی اور ٹکسٹ بک کمیٹی کا اس کتاب کو پسند فرمانا قابل مصنف کی حوصلہ افزائی ہے جو یقیناً حق بجانب ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہم مولانا کو خلوص سے اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

قیمت حصۂ اول ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ/۱) حصۂ دوم - بارہ آنہ (۱۲/)

صاحب مصنف سے مل سکتی ہے

کلام شاد

سید الشعراء خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاؔد عظیم آبادی عم فیوضہٗ

(رباعیات)

کیا مفت لگا زاہدوں نے الزام لیا ۔۔۔ تسبیح کے دانوں سے عبث کام لیا
یہ نام وہ تھا جسے بے گنتی لیتے ۔۔۔ کیا لطف جو گن گن کے ترا نام لیا

کھلنے کے لیے جہاں میں کیا کیا نہ کھلا ۔۔۔ تقدیر کا راز اب تک اصلا نہ کھلا
کیا علم کہ کیا لکھا ہے پیشانی میں ۔۔۔ افسوس اسی خط کا لفافہ نہ کھلا

دنیا میں جو ہیں بھی تو نہ ہونے کی طرح ۔۔۔ جاگے بھی کبھی کبھی تو سونے کی طرح
ہنسنا تو بھلا ہم کو بہت مشکل تھا ۔۔۔ روتے ہیں کہ روئے بھی نہ رونے کی طرح

دل مورد ایذا و بلا ہوتا ہے ۔۔۔ پاداش عمل میں سب بجا ہوتا ہے
جو قرض کہ خوش ہو کے لیا تھا میں نے ۔۔۔ وہ سود سمیت اب ادا ہوتا ہے

ہوں مثل حباب کیا ٹھکانا میرا ۔۔۔ کٹ جائے گا ایک دم میں زمانا میرا
گر سانس نہ ہو تو کام سب ہیں برہم ۔۔۔ چلتا ہے ہوا پہ کارخانہ میرا

غزل

کچھ کہے جاتا تھا شوق اپنے ہی افسانے میں تھا ۔۔۔ مرتے مرتے ہوش باقی ترے دیوانے میں تھا
ہائے پروانے کا وہ جلنا وہ رونا شمع کا! ۔۔۔ میں نے روکا۔ ورنہ کیا آنسو نکل آنے میں تھا؟

حارث

(۱)

میں کیا تھا؟

مجو درستیٔ عہد از جہان سست نہاد
کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

آپ جانتے ہیں مفلسی کیا چیز ہے؟ ـــ وہ مفلسی نہیں جس کی شکایت کوئی ڈپٹی کلکٹر یا منصف کرتا ہے، وہ مفلسی نہیں جس کا نام لے لیکر ہمارے رؤسا اکثر اوقات خواہ مخواہ غل مچایا کرتے ہیں! نہیں وہ نہیں۔ بلکہ وہ مفلسی جو تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے تک کی اجازت نہیں دیتی جو ہمچشموں کے سامنے گردن اٹھا کر چلنے سے روکتی ہے، جو ہموطنوں سے نظر چار کرنے سے مانع آتی ہے، اور؟۔ اور جو اشرف المخلوقات کو ارذل المخلوقات بنا کر بھی نہیں چھوڑتی! ایسی مفلسی سے میرا مطلب ہے اور ایسی مفلسی کو آپ بھی جانتے ہیں کیا چیز ہے؟۔ آہ۔ یہ ایک چکی ہے۔ احتیاج اور ناداری کے پاٹوں سے ملکر بننے والی چکی ہے۔ جو تمام شریفانہ جذبات اور جائز انسانی خواہشات کو پیستے پیستے سرمہ بنا دیتی ہے! یہ ایک لعنت ہے۔ ناقابل برداشت اور لاعلاج لعنت ہے جس کا ہر وقت قائم رہنے والا اثر بیباکی کے ساتھ بات کرنے اور آنکھ ملانے تک سے روکتا ہے! یہ ایک کیڑا ہے ـ نظر نہ آنے والا اور مردم خوار کیڑا ہے۔ جو دل و دماغ کے اندر ہی اندر ہمت و استقلال کو کھا جاتا ہے، جرأت و خودداری کو چاٹ جاتا ہے، اور بدقسمت انسان کو تباہ کر دیتا ہے، افعالِ

کر دیتا ہے، فنا کر دیتا ہے!

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج احتیاج ست، احتیاج ست، احتیاج

جس وقت اُسے نظر آتا ہے کہ سوسائٹی کی منظور نظر۔ گوشت کی تھیلی، چکنائی اور چربائی ہوئی۔ جوان عورت اپنے سرخ سرخ رخسارے دکھاتی، موٹر میں پانوں پھیلائے پڑی ہوئی، اُس کے پاس سے ہوا کیطرح گذر گئی؛ جس وقت وہ دیکھتا ہے کہ تمول کا پتلا فیشن ایبل جنٹلمین۔ اعلیٰ درجہ کی تمباکو کے دُہوئیں اُڑاتا، نہایت غرور کے ساتھ پارک کا نظر فریب سبزہ روندتا پھرتا ہے؛ اُس وقت۔ اور خصوصاً اُس وقت مفلس آدمی کا خون ایک ایک رگ میں عشتر کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے، دماغ چکراتا ہے، دل بیٹھتا ہے اور روح انسانی۔ زندانِ خاکی میں قید ہونے والی پری آزادی حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پانوں مارتے ہوئے چیخ اُٹھتی ہے کہ "یہ اندھا دُھند! یہ بیوجہہ طرفداری! کیوں ایک شخص۔ تمول کی زرین جھول والا حیوانِ ناطق محض ورثہ کی اتفاقی وجہہ سے بغیر کسی ذاتی قابلیت کے تمام دنیا کے لذائذ اور عیش و آرام کے مزے لوٹتا ہے؟ اور کیوں میں۔ غریب، مسکین، مصیبت زدہ انسان۔ تمام دن جدوجہد اور انتہائی کوشش کے بعد، رات کو بھی خوش ذائقہ کھانا حاصل نہیں کر سکتا اور پانوں پھیلا کر آرام سے سو نہیں سکتا؟ کیا جوہر آفرینش کے لحاظ سے وہ کسی اعلیٰ درجہ کی مٹی کا پتلا ہے؟ کیا خلق خدا اور ملکِ خدا پر اُسے کوئی خاص حق حاصل ہے؟ اور اگر نہیں:۔ تو پھر یہ ظلم کیوں؟ یہ بے انصافی کیوں؟" ــــ واقعی یہ نا قابل فہم راز کیوں نظر آتا ہے؟ بنانے والے کے منصف اور عادل ہونے پر بھی

ایسی صریح بے انصافی: اور اس قدر زیادتی کے ساتھ: آخر کیوں؟ زیادہ غور کے ساتھ سوچنے والا۔ بار بار تنگدستی کی وجہ سے اکتا کر سوچنے والا۔ ایک نہ ایک مرتبہ اس نتیجہ پر بھی پہنچتا ہے کہ اس تمام کائنات کا وجود بالکل اتفاق ہی اتفاق پر۔ مادہ کی خودرائی اور خودمختاری پر۔ مبنی ہے! کوئی علیم، دانا، اور خصوصاً عادل اس کا خالق نہیں! یہ ہی وجہ ہے کہ تموّل کے بدولت جس کسی کو متموّل ہونے کا موقع نیکی یا بدی کے ذریعہ سے مل جائے۔ تمام عیش اور حکومت کے لطف اڑاتا ہے، ایک ایک چیز کو محض اپنی ہستی کے لیے موجود سمجھتا ہے اور نشۂ دولت میں مست ہو کر برگزیدہ اخلاق کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیتا ہے! آج سے دس سال پیشتر میں بھی یہ ہی سمجھتا تھا، اور غالباً برابر سمجھتا رہتا اگر میری "اپنی بیتی" خوفناک تعجب انگیز مگر سچی سرگذشت۔ میری غلطی مجھے نہ سمجھا دیتی۔ ان ہی آنکھوں سے نہ دکھا دیتی! الامان! وہ خوفناک، ہیبت ناک، تغیّر پذیر ہستی۔ جس کو میرے استاد یا ادیب رہنے کا موقع ملا۔ کیا چیز تھی؟ میں کانپ جاتا ہوں، میں تھرا جاتا ہوں، میں لرز جاتا ہوں! جب میں دیکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ بنی آدم اسی مکتب میں تعلیم پا رہے ہیں، اسی ناقابل تشبیہ استاد سے سبق لے رہے ہیں جس کی زیرنگرانی میں بھی ایک عرصہ تک رہ چکا ہوں! آہ! کیا اچھا ہوتا کہ میں آج سے دس سال پیشتر ہر ایک چیز کو ان ہی آنکھوں سے دیکھتا جن سے اب دیکھتا ہوں، یا ہر ایک بات کو اسی طرح سمجھتا جس طرح کہ اب سمجھتا ہوں، اور اس خاص راز کی اصلیت سے۔ تموّل اور افلاس کی گتھی سے۔ ایسا ہی واقف ہوتا جیسا کہ اب ہوں! کیوں؟ اس لیے کہ وہی چیز جس کو میں ناانصافی سمجھتا تھا اب عین انصاف بالکل مساوات کے اصول کے موافق نظر آتی ہے! یہ تو ناممکن ہے کہ جو اعتقاد میں نے تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل کیا ہے اس کو محض عقلی دلائل سے آپ کے دلنشین

کر سکوں، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں وہی حیرت انگیز "آپ بیتی" بلے کم و کاست آپ کے
سامنے پیش کر دوں، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تہذیب یافتہ دنیا کے بہت کم حضرات
اس سرگذشت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہونگے! تاہم، میری دلی تمنا ہے کہ
میرے عزیز بھائی بھی اپنی ترقی یافتہ دنیا کو۔ ظاہر و باطن میں زمین و آسمان
کا فرق رکھنے والی دنیا کو۔ اس کی تہ تک پہنچ سکیں، اسکی اصلیت معلوم کر سکیں
اور اس بھیڑ کی کھال اوڑھنے والے بھیڑیے کو اچھی طرح پہچان سکیں!!

معاف کیجئے اگر میں "اس آپ بیتی" سے پہلے کچھ اپنی نسبت نہایت مختصر طور پر
بیان کروں، کیونکہ میری پوری حالت کا اندازہ کیے بغیر آپ اس نادر سرگذشت کا
لطف مشکل سے حاصل کر سکتے ہیں! میں صفر کے مہینے میں پنجشنبہ کے دن، رات کے
ٹھیک بارہ بجے پیدا ہوا؛ ایسے ٹھیک بارہ بجے، کہ ادھر تو طاق میں رکھے ہوئے گھنٹے
نے بارہ بجانے شروع کیے اور ادھر میں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلی آواز نکالتے
ہوئے بلک بلک کر رونا شروع کیا! گھنٹے کا بجنا اور میرا رونا، یہ دونوں باتیں
اس قدر ساتھ ساتھ ہوئیں کہ میرے محلہ کی اکثر بوڑھیوں کو۔ جو میری پیدائش کے
وقت موجود تھیں۔ ابتک اچھی طرح اور تعجب کے ساتھ یاد ہیں! میری پیدائش
کے مہینے، دن، اور وقت کے لحاظ سے۔ اس وقت کے توہمات کے موافق
اکثر عورتوں نے رائے لگا دی تھی کہ میں بدقسمت ہو کر جیوں گا اور زیادہ تر بھوت
پلید کے خلل میں مبتلا رہونگا! پیشین گوئی کا پہلا حصہ۔ میرا بدقسمت ہونا نہایت
صاف طور پر سچا ثابت ہوا! سب سے پہلی بدقسمتی۔ اور غالباً سب سے بڑی نحوست۔
یہ تھی کہ میں نے ماتا جیسی نایاب اور بے مثل رحمت کا لطف نہیں اٹھایا اور آغوش مادر
میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے۔ ان محبت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر
مسکرانے کا پاک مزہ حاصل نہیں کیا! کیونکہ جس وقت میری آنکھیں اس ناپاک دنیا میں

پہلی مرتبہ کھلیں اس کے پورے دس گھنٹے بعد میری ماں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں! میں ایک جاہل انا کی آغوش میں دیدیا گیا۔ پلا اور بڑھا۔ مگر مجھے خوب یاد ہے کہ جب کبھی مجھے اس خشمناک انا سے چھٹکارا ملتا، میں لڑکھڑاتا اپنی مرحوم ماں کی قبر پر۔ جو مجھ منحوس کی پیدائش پر سے قربان ہوئی اور جس کی قبر میرے گھر کے احاطہ میں ہی تھی۔ جا پڑتا تھا؛ اور یقین کیجئے کہ اس قبر کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھر مجھے اس قدر اچھے معلوم ہوتے تھے اور وہاں مجھے اس قدر آرام آتا تھا کہ میں قبر کے تعویذ سے لپٹ کر نہایت چین کے ساتھ سو جایا کرتا تھا! یہ ایک فطرتی کشش تھی، یہ ایک ناقابل بیان قدرتی جذبہ تھا، جس کا احساس مجھے اس وقت قطعی نہیں تھا! مختصر یہ کہ پیشین گوئی کا پہلا جزو سچا ثابت ہوا! رہا آخری حصہ اس کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا! مجھے یاد نہیں کہ میں ایک مرتبہ بھی سایہ سکہ کی وجہ سے بیمار پڑا ہوں؛ ہاں صرف ایک بات کا مجھے خیال ہے کہ میں اسکول میں ابتدائی جماعتوں کے زمانہ میں اکثر اوقات پٹتے وقت استاد کو لپٹ جایا کرتا تھا، اور اگر موقع لگ جاتا تھا۔ جیسا کہ کئی مرتبہ ہوا۔ تو استاد کا ہاتھ یا انگلیاں چبا ڈالتا تھا! اسے آپ بھوت پلید کا اثر سمجھیں یا دماغی جنون بہرحال میں اپنے بچپن میں اکثر اوقات اپنے آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا! میں پٹتا تھا، میں کٹتا تھا میں چار چوٹ کی مار کھاتا تھا، لیکن کیا ممکن جو ایک دن بھی مدرسہ سے بھاگ سکتا! کیونکہ ماستا کی مضبوط آڑ اور آغوش مادر کی فطرتی حمایت میرے لیے نہ تھی، اور رعب پدری ایک دن بھی مجھے مدرسے سے غیر حاضر ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا! میں پڑھے گیا، اور پڑھے گیا؛ یہاں تک کہ میں نے مڈل پاس کیا، انٹرنس پاس کیا، ایف۔ اے۔ پاس کیا، بی۔ اے۔ پاس کیا، اور اب میں ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا کہ یکایک میرے والد نے میرے اکیلے سرپرست نے ہیضہ کیا، اور باوجود میری بیحد دوڑ

دھوپ اور سول سرجن کی انتہائی کوشش کے صرف ایک دن اور ایک رات میں چٹ پٹ ہو گئے! اِس کو میری دوسری بدقسمتی سمجھ لیجئے! اس جانکاہ غم کی حالت میں مَیں امتحان میں شامل ہوا اور ڈگری حاصل کرتے ہی تعلیم کے سلسلہ سے مجبوری کے ساتھ ہاتھ دھو بیٹھا! دو تین مہینہ کے اندر ہی اندر اُس تمام جائداد پر جس کو میں ترکہ پدری میں پانیکا اکیلا مستحق تھا، ایک دو تین کی بولی بولدی گئی اور گھر کے مکان تک پر ڈونڈی پٹ گئی! میرے والد مرحوم کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی سخاوت نے، خدا اُن کی روح نہ شرمائے، قرضہ کا انبار لگا دیا تھا! اور اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی قرضخواہوں نے۔ دھوتی باندھنے والی بنیوں نے منقولہ وغیر منقولہ تمام جائداد نیلام کرا کر چھوڑی! اب میں تھا اور تنہائی، عالم بیکسی تھا اور پریشانی، بھری پُری دنیا تھی اور محض میری ذاتی کوشش! یہ میری تیسری بدقسمتی کہی جا سکتی ہے! میری لیاقت اچھی تھی، میرے خاندانی حقوق کافی تھے، مگر میرے پاس سفارش کا گولا بارود قطعی نہ تھا، اور اسی لیے میں گورنمنٹ سروس حاصل نہ کر سکا! ضرورت برابر مجبور کر رہی تھی اور ساتھ ہی میری طبیعت کا قدرتی لگاؤ بھی اسی طرف تھا، میں نے ایک اخبار کی اڈیٹری منظور کر لی! اس ملازمت کا سلسلہ مشکل سے ایک سال قایم رہا! کیونکہ میں نے اُس اخبار میں ایک مرتبہ ایسے مصنف کی تعریف کی جو میری رائے میں نہایت لایق اور طباع شخص تھا، مگر مالک اخبار کی مذہبی آنکھوں میں نیچری تھا! غرض اُس خطا پر مجھے مارا کر خطا وار نہ تھا، اُس نیچری کی تعریف شائع کرنے پر میں برخاست کر دیا گیا! اب میرے لیے سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ مختلف مضامین لکھوں اور اپنی دماغی محنت کو پیٹ پالنے کے لیے کوڑیوں کے مول مختلف اڈیٹروں کے ہاتھ فروخت کر دوں، اور اسی قلیل آمدنی پر کسی نہ کسی طرح بسر اوقات کروں!

اللہ اللہ و خیر صلاح: نئی روٹی ٹلا شور بہ! یہ میری پہلی..... دوسری..... تیسری ہاں، چوتھی بدقسمتی تھی!

اب آپ سمجھیے یہ میری زندگی کا مختصر سا خاکہ! میں مضمون نگاری پر زندگی بسر کر رہا تھا! بمشکل اپنا پیٹ بھر رہا تھا! شتم پشتم گزر اوقات ہو رہی تھی کہ دفعتاً میں افلاس کے انتہائی کنارے پر جا لگا! یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ میں نے اپنی موروثی جائداد کے نیلام ہوتے ہی وطن کو خیرباد کہہ دیا تھا، اور تلاش معاش کے لیے بمبئی کو اپنا مسکن۔ گمنام اور خاموش مسکن بنا لیا تھا! کھیتواڑی کی پشت والی گلی میرا پوشیدہ مسکن تھا، اور چال نمبر..... مالا نمبر..... میرا وحشت بھرا آشیانہ تھا! دراصل اس مالے میں ایک زردوز کا کارخانہ تھا جس نے بغل کا چھوٹا کمرہ اپنے طور پر بیس روپے ماہوار پر مجھے دے رکھا تھا! مجھ تنہائی پسند کے لیے وہ کمرہ۔ تنگ و تاریک کمرہ۔ کافی سے بھی زیادہ تھا، اور اس زردوز کا محبت آمیز برتاؤ۔ کیونکہ کئی کئی مہینے وہ مجھ سے کرایہ نہ مانگتا۔ افلاس کی مصیبت میں بزرگوں کی شفقت سے کم نظر نہ آتا تھا! تاہم افلاس۔ فلاکت اور بدقسمتی کا سیاہ بادل۔ میری خاموش زندگی پر چھاتا جاتا تھا، اور میرے دماغ و طبیعت کو علمی قابلیت کے روشن آفتاب کو رفتہ رفتہ اپنی گھٹا ٹوپ سیاہی میں چھپاتا جاتا تھا! نوبت بہ اینجا رسید کہ ایک روز میں۔ ایم اے۔ اور کالج کا ایم اے فقر و فاقہ کے دست بدست اور روبرو تھا!!

آپ یقین کیجیے کہ دسمبر ۱۹۰۸ء کی تیسری تاریخ میرے لیے ایک منحوس ترین دن تھا! میں دن بھر تلاش رزق میں مارا مارا پھرا، پھر بھی شام کو میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی! اسی زمانہ میں، میں نے ایک ناول نہایت دماغ سوزی اور جانکاہی کے ساتھ لکھا تھا! لکھا تھا اور ارادہ کیا تھا کہ کسی طرح اپنی آمدنی

میں بہت تھوڑا بہت بچا کر پیٹ کاٹ کر اُسے خود چھپواتا: مگر ناداری کا بُرا نہ ہو، وہ گھٹنے کے عیوض میں بڑھتی ہی رہی اور آخر کار بھوک نے۔ ناقابلِ تسکین شعلہ جہنم نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُس تصنیف کو بھی۔ اُس اپنی تنہا ملکیت کو بھی۔ آتش جوع کے نذر کر دوں اُسی کو لے کر میں مختلف ایڈیٹروں کے پاس گیا، لیکن بلا مبالغہ ہر ایک نے لینے سے انکار کر دیا! جو اڈیٹر صاحب ملاحظہ کرتے۔ اندھا دھند ورق اُلٹ کر کہیں کہیں سے پڑھتے۔ وہ عجیب ہمہ دانی اور لیاقت کا چہرہ بنا کر فرما دیتے کہ مسٹر جواں بخت! آپ نے محنت تو واقعی بہت کی ہے، مگر سوسائٹی پر نکتہ چینی سے کیا فائدہ؟ یہ بہت پرانا رنگ ہے آپ کو زمانہ اور ترقی کے ساتھ چلنا چاہیئے! اور۔ اور غالباً آپ کی یہ اُردو بھی ٹھیک نہیں، آپ کاروبار کی اُردو لکھیں، بالکل ٹھیٹ بازاری بول چال۔ علمی زبان محض لغو سمجھی جاتی ہے! غالب اور ذوق کی اُردو اب سوسائٹی پسند نہیں کرتی!!" واقعی میں سوسائٹی کے عیوب ایک ایک کر کے گناتا تھا، میں غالب اور ذوق کی سی اُردو لکھنے کی کوشش کرتا تھا! میں تسلیم کرتا ہوں اگر یہ دونوں باتیں عیب سمجھی جائیں۔ تو مجھ میں تھیں اور اچھی طرح تھیں! وہ میرے رنگ میں بیٹھ گئی تھیں، میری فطرت میں ڈوب گئی تھیں، اور اُن کے خلاف لکھتے ہوئے میرا کانشنس مجھے ملامت کرتا تھا! میں دن بھر پھرا، بیسیوں دروازے جھانکے، بہت سی گلیاں چھانیں، مگر شام کے آٹھ بجے جب واپس آیا تو "بیک بینی و دو گوش" ایک بار انکار و الم لیکر واپس آیا! اپنے تنگ و تاریک کمرے میں گھستے ہی میں نے لیمپ جلایا اور ایک عجیب جذبہ کے ساتھ غصّہ، نفرت، بیکسی اور مجبوری کے ساتھ۔ میں اپنی بیچارہ تصنیف کو زمین پر پھینکتے ہوئے کرسی پر گر پڑا، گر پڑا، اور بیدم ہو گیا، بیدم ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر آنکھیں بند کر لیں!!

آہ! اے کبھی نہ ماننے والی پیٹ کی آگ، تجھے آگ لگے! آہ! اے بغیر کھانے نہ بجھنے والے شعلۂ جوع، تو غارت ہو! رات کے کھانے کا خیال، بیہودہ خیال! جوئندہ یابندہ کا مقولہ، لغو مقولہ! مجھ سے زیادہ کون جوئندہ کا لقب حاصل کرسکتا ہے؟ مگر آہ! مجھ سے زیادہ کون یابندہ کی حالت سے کوسوں دور ہے؟ آ اے برابر بڑھنے والی بھوک کی آگ! میری ہڈیوں کو جلا دے، جلا دے اور چربی نکال لے، نکال لے اور اُسی کو معدہ میں عمیق غار جہنم میں۔ ڈال دے! کیا رزق میرے لیے آسمان سے برسے گا؟.... مگر آسمان تو محض ایک حد نظر ہے! تو پھر کیا خدائے رحیم....؟ مگر کسی خالق کا وجود تو محض ایک ڈھکوسلا۔ لغو اور مہمل ڈھکوسلا ہے! اُف! کوئی صورت نہیں: کوئی جائے پناہ نہیں: کوئی نقطہ اس افلاس کی کشمکش سے بچانے والا نقطۂ سکون نہیں۔ کہیں نہیں! خود مختار مادّے کی رنگ برنگ کی شکلیں نئی نئی دلفریبی کے ساتھ جلوہ افروز ہیں! حرکت کا زبردست انجن برابر مادّے کی صورتوں کو پلٹ رہا ہے؛ آب و آتش باد و خاک، ہستی کا اسٹیم پیدا کرکے نظام عالم کو لازوال رنگ میں حرکت دیئے جارہے ہیں؛ اور تمول کا عظیم الشان پہیہ اتفاق یا ایکسیڈنٹ کے بدولت کبھی نہ ختم ہونیوالی گردش میں مشغول ہے! آہ! کیا میری باری کبھی نہ آئے گی؟ کیا ہر وقت حرکت کرنیوالا تمول کا پہیہ مجھے اس فلاکت سے اوپر نہ اُٹھائیگا؟ اُٹھائیگا اور ضرور اُٹھائیگا! ٹھہر، اے سوسائٹی کے نور نظر، گوری چمڑی والے نوجوان ٹھہر! اُسوقت تک ٹھہر جب تک کہ میں اسی زیست کے تلاطم میں، اسی دولت کے بھنور میں، اسی مالداری کی مشین میں، دیکھتے دیکھتے اونچا ہو جاؤں اور اس بے مروت، اس سیاہ قلب، اس سیہ درون، سوسائٹی کو اس برتاؤ کا اچھی طرح جواب دے سکوں!!!

ہوا لکا ایک تیز و تند جھونکا، گولی کھائے ہوئے ہرن کی طرح ادہر سے کواڑ کھڑکتا ہوا اندر گھسا، اور میرے ہوشیار ہوتے ہوتے لیمپ کو گل کرتا ہوا غائب ہوگیا! اندھیرے نے مجھے گھبرا دیا۔ طبیعت اور زیادہ گھٹی، اور میں نے دیاسلائی کا بکس جیب سے نکالکر ٹٹول ٹٹول کر میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کیا!! اب طبیعت کسی قدر ساکت تھی، بھوک کا شعلہ تو بڑھ رہا تھا مگر دماغی الجھن کم ہوگئی تھی: افلاس کی منحوس شکل تو برابر منڈلا رہی تھی مگر بد حواسی بہت کچھ فرد ہو چکی تھی! لیمپ جلانے کے ساتھ ہی اول مرتبہ تین خط مجھے میز پر پڑے ہوئے نظر آئے، جن کو غالباً ڈاکیہ میری عدم موجودگی میں حسب معمول رکھ گیا ہوگیا! ان میں سے ایک خط لمبے لفافہ میں تھا جو بظاہر کوئی سرکاری حکم نظر آتا تھا، دوسرا خط نہایت خوبصورت مونوگرام لئے ہوئے نیلے رنگ کا تھا، اور تیسرے خط کے معمولی لفافہ پر بیروت کی مہر تھی! یہ آخری خط میں جانتا تھا کہ میرے اسکول کے زمانہ کے ایک ہم جماعت کا تھا! میں اور وہ معین الدین - انٹرنس میں ہم جماعت تھے، جس کے بعد وہ بیروت چلا گیا اور وہاں تجارت کی بدولت خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوگیا! دو مہینے گذرے کہ میں نے اسے ایک خط لکھا تھا۔ اپنی تنگدستی کی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے اس سے کچھ مدد قرض دستگرداں کے طور پر چاہی تھی۔ اور غالباً یہ اسی کا جواب تھا! سب سے پہلے میں نے یہ ہی خط اٹھایا، اور پڑھنے سے بیشتر اس کا وزن جانچنا شروع کیا اس نے میری درخواست پوری کی ہوگی؟ کیا اسے وہ مجسٹ بھرا آزادی کا زمانہ یاد ہوگا جبکہ چاندنی رات میں ہم دونوں سٹریچی ہال کے سامنے ٹہلا کرتے تھے!

آہ! کالج کی زندگی اور خصوصاً ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی زندگی! ناممکن ہے کہ کوئی بھول جائے! مگر پھر بھی امداد کی امید مجھے مطلق نہ تھی! میں خوب جانتا تھا کہ اور بیسیوں دوستوں کی طرح معین نے بھی کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑا ہوگا! اور کچھ نہیں تو مجبوری کا اظہار۔ پہلوتہی کرنے کے لیے آسان سا ٹکا ہے! تاہم میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اوروں کی طرح اس نے بھی صرف مجبوری ظاہر کرتے ہوئے افسوس کیا تھا یا کوئی نیا عذر تراشا تھا! میں نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا! معین نے اپنی غلط سلط انگریزی میں لکھا تھا:۔

"ڈیر ہیکیٹ! مجھے افسوس ہے کہ تم جیسا لایق شخص بھی زمانہ کے ظلم سے محفوظ نہ رہا! میں ڈھائی سو روپے کے تین نوٹ اسی خط کے ساتھ ملفوف کرکے بھیج رہا ہوں! تاخیر محض برٹش گورنمنٹ کے نوٹ حاصل کرنے کی وجہ سے ہوئی! میری دلی دعا ہے کہ میں جلد تمھیں کامیاب اور مقصدور دیکھوں! میں ایک شخص کو تمھاری سرپرستی کے لیے آمادہ کرتا ہوں۔ وہ بمبئی آرہا ہے اُس کا نام پرنس حارث کمنسی ہے! یہ شخص بے حد متموّل ہے اور چونکہ نہایت وسیع معلومات کا شخص ہے اس لیے لایق وطباع آدمی کی جان و دل سے مدد کرتا ہے! تم اس سے بہت فائدہ حاصل کرسکتے ہو اگر اس کی رائے پر کاربند رہو! وہ تم سے مل کر ظاہر سے تمھاری امداد کرے گا۔ مجھے اس وقت فرصت بہت کم ہے اس لیے فی الحال رخصت! میری رقم واپس کرنے میں جلدی نہ کرنا، اور بلاتکلف ضرورت کے وقت یاد کرکے حق دوستی ادا کرنے کا موقع دینا!" —— میں ہوں تمھارا صادق —— "بغیلو"

خط ختم کرتے ہی میں نے تینوں نوٹوں کو اچھی طرح دیکھا، اور لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا! اب میں قطعی مطمئن تھا! بکٹ اور ٹفیلو ایک عرصۂ دراز کے بعد میری نظر سے گذرے تھے! کالج کی متبرک زندگی نے مجھے بکٹ کا اور معین کو ٹفیلو کا خطاب عنایت فرمایا تھا! مگر آہ، ظالم معین تو نے کالج کی یاد کو پھر تازہ کر دیا! تو نے مردہ دل میں پھر بجلی دوڑا دی! تو نے اُس مبارک یونین کلب کا نظارہ پھر یاد دلا دیا! کیسی متبرک تھی وہ بے فکری کی زندگی، کیسی سچی محبت پیدا کرنے والی تھی اُس کی تعلیم!! میں - جواں بخت نہیں - وہی جان بکٹ! اور تو معین نہیں - وہی بھولا بھالا، گداز جسم والا ٹفیلو! پیارے ٹفیلو! ڈیر ٹفیلو! معاف کرنا، میں سمجھتا تھا کہ تم بھی اپنے دور افتادہ مفلس بکٹ کو بھول گئے ہوگے!!

سلطان حیدر جوش (علیگ)

مرحوم مولوی محمد عزیز میرزا صاحب بی۔ اے۔ کی موت نے جن کی تصویر ہدیۂ ناظرین ہے جو نقصان قوم کو پہنچایا ہے اسکی تلافی کا بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا مغفور محمڈن کالج کے اُن طلبا میں سے اور قوم کے اُن افسرا میں سے تھے جن پر کالج اور قوم دونوں کو ناز تھا ملازمت سے قطع تعلق کرنے کے بعد مرحوم نے اپنی عمر قومی خدمات کے واسطے وقف کر دی تھی اور قوم کی بہت سی اُمیدیں مرحوم سے وابستہ تھیں جو موت نے پوری نہ ہونے دیں خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ اور پس ماندگان کو صبر دے۔

اِنقلاب

اب کہاں پہلی سی وہ مستی جوشِ شباب　　　ہے گرفتارِ خمارِ عیش مدہوشِ شباب
تلخکامی کے سوا آخر نہ کچھ حاصل ہُوا　　　نیش ہے۔ کہتا ہے اک عالم جسے نوشِ شباب
صحبتِ دوشینہ کے اب ذکر سے کیا فائدہ　　　کیوں بنے منت کشِ گفتار خاموشِ شباب
رات کے جاتے ہی وہ باتیں بھی سب جاتی رہیں　　　سعی لاحاصل ہے اب کرنا غمِ دوشِ شباب

یادِ عہدِ نوجوانی لاکھ نشتر زن رہے
کچھ غمِ فردائے پیری بھی دلِ پرفن رہے

شانِ برنائی کہاں وہ آہ رعنائی کہاں!　　　حُسنِ صورت اب کہاں وہ طورِ زیبائی کہاں!
اب جوانی کی کہاں پُرلطف وہ کیفیتیں　　　وہ لبِ لعلیں میں پہلی سی شکرخائی کہاں
جوششِ دیوانگی اب کاش پیچھا چھوڑ دے　　　جذبۂ الفت کہاں اب اے دلِ سودائی کہاں
حسرت و ارمان اب گھیرے ہوئے ہیں کیوں مجھے　　　کنجِ تنہائی میں شوقِ بزم آرائی کہاں

ولولے سب اب گئے تو شورش افزا کون ہو
خارزارِ زندگی میں گام فرسائی کہاں

سرگذشتِ نوجوانی اک فسانہ ہوگیا　　　منقلب یعنی نصیبوں سے زمانہ ہوگیا
خواہشیں دل میں جو تھیں پیری میں سب جاتی رہیں　　　صبح ہوتے قافلہ سارا روانہ ہوگیا
آرزوہائے مسلسل میں پڑا ہے تفرقہ　　　کیا گھڑی آئی کہ برہم کارخانہ ہوگیا
ان علائق کا نہ آسانی سے دامن چھوٹتا　　　ترکِ دنیا کا مگر اچھا بہانہ ہوگیا

غم نہیں پیری اگر صبر آزما ہونے کو ہے
رندِ عشرت کوش بھی اب باخدا ہونیکو ہے

سید محمد شفیق

لکھنؤ کے قدیم نظارے

شاہان اودھ اگرچہ ایک چھوٹی سی سلطنت کے مالک تھے لیکن شوکت پسندی اور اظہار جاہ وحشمت میں شاہان مغلیہ کے قدم بقدم چلتے رہے ان کے دربار کی شان وشوکت، ان کی سواریوں کا تزک احتشام، ان کے محلوں کی رفعت، ان کی تفریح گاہوں کی نفاست، ان کے جلسوں کی کیفیت، اور روزانہ زندگی کے واقعات بجائے خود ایک دلچسپ افسانہ ہیں جن کا ذکر موجودہ نسلوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دینے کو کافی ہے۔ ایسٹ انڈین کمپنی سے گہرے تعلقات قائم ہونے کی وجہ سے لکھنؤ ہمیشہ افسرانِ کمپنی کی جولاں گاہ بنا رہتا تھا اور ہر اعلی افسر کی آمد پر اظہار شان وشوکت کی حد ہو جاتی تھی۔ خصوصاً گورنر جنرل، کمانڈر انچیف اور نئے رزیڈنٹ کا داخلہ نہایت شاندار ہوتا تھا اور استقبالی رسم اس شان وشوکت سے ادا کی جاتی تھی کہ ان سادہ مزاج اہل مغرب کو دریائے حیرت میں غرق کر دیتی تھی۔

استقبال جو بادشاہ یا ولیعہد سلطنت کرتا تھا اور اس کے بعد شاہی دعوت ہوتی تھی جس میں روشنی اور آتش بازی کے منظر نہایت تابناک ہوتے تھے۔

مارکوئیس آف ہیسٹنگز ایک منظر کا ذکر حسب ذیل کرتے ہیں:-

"قسطنطنیہ (جنرل مارٹین کی کوٹھی) کے ایک پھاٹک سے ہم نے اس "سڑک پر نظر ڈالی جو شاہی محل کی طرف گئی تھی۔ اس کے دونوں جانب "لکڑی کے ستون قائم کیے گئے تھے اور ہر ستون پر ہشیار گلاس روشن تھی "جب ہم آگے بڑھے تو روشنی کے بلند پھاٹک (ترپولیے) نظر آئے جو

"جو بانس کے ٹھاٹھروں پر کپڑا منڈھ کے کھڑے کئے گئے تھے اور جو"
"سر سے پانوں تک روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کے"
"ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں دونوں جانب نہایت صاف و شفاف"
"عارضی بازار لگے ہوئے تھے ہندوؤں اور چینیوں کے قومی بانوں کی"
"حیرت انگیز تصویریں دکھائی گئی تھیں۔ اس کے بعد ہم ایک کوشک یا"
"گرمائی محل کے قریب پہونچے جو نہایت پرتکلف طریقے سے آراستہ"
"تھا لیکن یہ تمام منور اور تابناک نظارے اس قلعہ نما احاطے میں پہونچکر"
"ماند پڑ گئے جو دعوت خانہ کے محاذی واقع تھا جس کی کھڑکیاں اس"
"احاطے کی طرف کھلی ہوئی تھیں۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا جس کی وسعت"
"انگلستان کے متوسط میدان کے برابر تھی۔ سارا احاطہ خوشرنگ پھولوں کی"
"کثرت سے باغ ارم معلوم ہوتا تھا۔ روشن گلاسوں اور قندیلوں کی تعداد جن سے"
"اس موقع پر زمین ڈھک دی گئی تھی بے انتہا تھی اور ان کے مختلف رنگوں"
"کی ترتیب نہایت خوش آیند تھی۔ ...... یہ روشنی فی الحقیقت اپنی"
"قسم کی سب سے بہتر روشنی تھی جو میں نے دوسرے مقامات پر نہیں دیکھی۔"

دریائے گومتی پر روشنی اور آتش بازی کے منظر اس سے زیادہ دلچسپ ہوتے تھے۔ اس قسم کے ایک منظر کے متعلق مسٹر ننڈی حسب ذیل رقمطراز ہیں :-

"جو منظر یہاں (دریائے گومتی پر) میری نظر سے گذرا وہ کلیتہً دلکش اور"
"خالص مشرقی طرز پر مبنی تھا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا گویا الف لیلہ کے کسی"
"تابناک سین کو واقعی طور پر پیش نظر کر دیا گیا ہے۔ رات اگرچہ تاریک"
"تھی لیکن آسمان بالکل شفاف تھا جس برآمدے پر ہم کھڑے ہوئے"
"تھے وہ لب دریا واقع تھا جس کے نیچے موجیں اپنی روانی کا لطف"

"دکھا رہی تھیں اور متعدد ساخت کی کشتیوں اور بجروں سے سارا دریا بھرا"
"ہوا تھا۔ دریا کے بیچوں بیچ میں ایک آراستہ کشتی پر ناچ ہو رہا تھا"
"جس میں ناچنے اور گانے والی طوائفوں کا ایک پورا گروپ تھا۔ تمام"
"منظر بجلی قندیلوں سے منور کیا گیا تھا جو اس ترکیب سے برآمدے"
"میں لگائی گئی تھیں کہ ان کی ٹھنڈی اور پر اسرار روشنی بغیر آنکھوں"
"کو تکلیف پہونچانے کے تمام سین پر چھائی ہوئی تھی۔ دریا کے دوسرے"
"کنارے پر جو اس کے محاذی واقع تھا اس سرے سے اُس سرے تک"
"آتش بازی کی قطار تھی جو مختلف قسم کی تھی اور بہت بڑی گوناگونی پر مبنی"
"تھی، اور دریا کی سطح پر کشتیوں میں بھی اس کا انتظام تھا۔ تھوڑے"
"تھوڑے وقفے پر غبارے اُڑائے جاتے تھے جو ایک شاندار"
"انداز سے ہوا میں بلند ہو کے باری باری سے کبھی کسی خوبصورت"
"محل کا کبھی کسی مندر یا مسجد کا نقشہ دکھاتے تھے جس کے طلائی"
"مینار ایک لمحہ کے لیے نہایت چمکدار سے روشن ہوتے اور بعد ازاں"
"تاریک ہو کر غائب ہو جاتے تھے۔"

دریا میں روشنی ہندوستان کا ایک نہایت قدیم طریقہ ہے جو گنگا وغیرہ کے بڑے بڑے میلوں میں اب تک نظر آتا ہے۔ ہندی میں اسے "جل بہار" کہتے ہیں۔ زندہ دلان لکھنؤ نے جل بہار کو ایک خاص سالانہ میلے کے طور پر اختیار کیا تھا جس کی مٹی ہوئی نشانی اب تک باقی ہے۔ اس موقع پر دریا میں دور تک آراستہ کشتیاں چھوڑی جاتی تھیں جن پر زرتار شامیانے کھنچے ہوتے تھے اور تھا، کنول، وغیرہ کی روشنی میں ناچ ہوتا تھا۔ دریا کے دونوں جانب کی عمارتیں اور پل، اور گھاٹ روشنی سے جگمگاتے تھے جن کی چھوٹ میلوں تک پہونچتی تھی

لیکن روشنی کے سبب سے زیادہ تابناک نظارے محرم کے ایام میں نظر آتے تھے۔ جب سارا شہر ایک بقعۂ نور معلوم ہوتا تھا۔ ہر گلی کوچہ امام باڑوں کی کثرت سے روشنی کا ایک خاص مرکز ہوتا تھا اور شاہی امام باڑوں کی تیاریاں بے پایاں تھیں جن کی تفصیل کو ایک دفتر درکار ہے جسین آباد اور شاہ نجف کی روشنی اگرچہ اب نصف سے بھی کم رہ گئی ہے۔ تاہم نو وارد لوگوں کے لیے وہ ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ اس موقع پر یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں ہے کہ محرم کی تاریک راتیں اپنی جگمگاہٹ سے روز روشن کو شرماتی تھیں۔

اسیطرح آتش بازی بھی لکھنؤ کی ایک خاص صنعت تھی جس پر اب تک دنیا کا کوئی شہر سبقت نہیں لے گیا۔ آجکل لوگ امریکہ کی آتشبازی پر مٹے ہوئے ہیں جس کی ہوائیوں سے پریاں نکل کر ناچنے لگتی ہیں۔ راقم کو بھی کئی مرتبہ اس آتشبازی کے نظارے کا فخر حاصل ہوا ہے، اور اُسے دیکھ کر اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ یہ اسی قدیم صنعت کی غیر مکمل نقل ہے جو عہد شاہی کے سیاحان لکھنؤ کی تحریروں سے اخذ کی گئی ہے۔ جس طرح ہندوستان کی دوسری صنعتیں ولایتی آب وہوا میں پہونچکر مقامی رنگ میں جلوہ گر ہوئی ہیں، اُسی طرح لکھنؤ کی یہ صنعت بھی امریکن فضا میں پہونچکر سائنٹفک لباس میں نمودار ہوئی۔ امریکن آتش بازی میں سائنس کے خواہ کیسے ہی غیر معمولی کرشمے کیوں نظر نہ آئیں لیکن اس میں اُس صنعت کو مطلق دخل نہیں جس پر لکھنؤ عرصے تک ناز کرتا رہے گا۔ یہاں کی آتش بازی کے قلعے بجائے خود ایک تھیٹر ہوتے تھے جنہیں آگ دیتے ہی ایک اصلی جنگ کا نظارہ پیش نظر ہوجاتا تھا۔ طرفین کے سپاہی اور گولہ باری صاف نظر آتی تھی اور قلعے کے برج اور فصیلیں اور دوسری عمارتیں بالکل تھیٹر کی طرح روشن ہوجاتی تھیں۔ اسی طرح ہاتھیوں، ملنڈھوں اور دوسرے

جانوروں کی لڑائیوں کے منظر نمایاں کیے جاتے تھے۔ غبارے، ہوائیاں، مہتابیں، اور دوسری قسم کی آتش بازیاں بھی خاص کیفیت رکھتی تھیں۔ لیکن اس فن کا سب سے بڑا کمال فرشی آتشبازی تھی جس کے شعلے سفید و شفاف فرش پر گرتے تھے لیکن اُس میں دھبہ تک نہیں پڑتا تھا۔ شاید آجکل کے لوگوں کے خیال میں بھی یہ بات نہ آسکے گی کہ کنگھی، سرسوں اور الائچی کے دانوں میں بارود بھر کے اُن سے آتشبازی کا کام کس طرح لیا جاتا ہوگا۔ لیکن اب سے چہارم صدی پیشتر تک نواب میرزا علی خاں صاحب جو حسین آباد کی پشت پر رہتے تھے۔ ایک سالانہ میلے کے طور پر اس قسم کی فرشی آتشبازی چھوڑا کرتے تھے جس میں اہل شہر کے علاوہ بعض جلیل القدر انگریز اور میمیں بھی آتی تھیں۔ اُن کے کمال کی شہرت صرف لکھنؤ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ "پکچوریسک لکھنؤ" کے انگریز مصنف نے بھی اُن کا مجمل ذکر کیا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی بے حقیقت آتشبازیوں کی حقیقت اُس وقت ظاہر ہوتی تھی جب اُن میں سے مختلف رنگ کے پھول پھل، پتے اور کلیاں نکل کر آتش بازی کا ایک مسلم درخت دکھا دیتی تھیں۔ لطف یہ کہ ان میں نہ دھواں ہوتا تھا نہ گندھک کی بدبو آتی تھی۔ اس مختصر نظیر سے رؤسائے لکھنؤ کی نفاست پسندی کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

ان شاہانہ مدارات اور دھوم دھامی جلسوں کے بعد گورنر جنرل یا دیگر اعلیٰ افسران کمپنی کے ساتھ ایک تخلیے کی صحبت بھی ہوتی تھی جس میں گورنر جنرل یا دیگر حکام کمپنی اور بادشاہ اودھ کے مابین امور سلطنت پر گفتگو ہوتی تھی اس موقع پر بادشاہ کو انتظامی معاملات کے متعلق ہدایتیں کی جاتی تھیں اور تمام امور قابل اطمینان طور پر طے ہوجاتے تھے۔ یہ صحبت بادشاہ، اور انگریزی ریزیڈنٹ میں بھی ہفتہ وار ہوا کرتی تھی جسے عموماً چائے پانی کی

صحبت کہتے ہیں اس کا انعقاد باری باری سے کبھی شاہی محل میں ہوتا تھا اور کبھی رزیڈنسی کی عمارت میں۔ اس "چاء پانی" کے اخراجات میں تین ہزار ماہوار تھے جو شاہی خزانے سے دیے جاتے تھے +

شاہان اودھ اگرچہ تمام امکانی امور میں مغل شاہنشاہوں کی تقلید کرتے تھے لیکن اُن کی طرح کبھی روزانہ دربار کے پابند نہیں ہوئے۔ ان کے یہاں "دربار عام" "دربار خاص" کا کوئی طریقہ نہ تہا اور وزیر اعظم یا دیگر اعلی افسران سلطنت صرف شاہی محل میں باریابی حاصل کر کے امور سلطنت کے متعلق گفت و شنید کرتے تھے۔ محل میں بادشاہ ایک طلائی پلنگڑی پر جلوہ افروز ہوتے تھے جو بہت قیمتی جواہرات سے مرصع ہوتی تھی۔ پلنگڑی کے چار کونوں پر چار بڑی تھیلیاں رکھی رہتی تھیں جن میں سے ایک میں روپیہ بہرا ہوتا تھا، دوسری میں اشرفیاں، تیسری میں جواہرات، اور چوتھی تھیلی میں سونے کے کڑے جب بادشاہ کسی پر مہربان ہوتے تہے تو ان تھیلیوں میں سے جن کے مُنہ کھلے ہوتے تہے مٹھی بھر کے روپیہ، اشرفی، یا جواہرات وید یتے تھے۔ سونے کے کڑے صرف خدمت گاروں کے لیے تھے جو ذرا ذراسی بات پر انعام پاتے تہے۔

تاہم سال میں چند مرتبہ بڑے بڑے دربار ہوتے تھے خصوصاً عید، بقرعید اور نوروز کو نہایت تزک و احتشام سے دربار ہوتا تھا محرم کے اختتام پر بھی ایک دربار لازمی تہا۔ خاص خاص تقریبات پر بہی عظیم الشان دربار ہوا کرتے تھے۔ لیکن تخت نشینی کا دربار بالکل رسمی طور پر ہوتا تہا جس میں رزیڈنٹ اور خاص خاص اعیان دولت شریک ہوتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تہی کہ ہر بادشاہ کے انتقال پر چند دعویدار سلطنت اٹھ کھڑے ہوتے تہے، لہذا جسے بادشاہ بنانا منظور ہوتا تہا اُسے بہ عجلت تخت پر بٹھا کر نذریں دیدیجاتی تہیں

اور توپوں کی سلامی شہر میں اعلان کر دیتی تھی کہ بادشاہ تخت نشین ہوگیا۔ ایک عجیب
سادہ دربار کی یہ بھی تھی کہ شاہ متوفی کی لاش اُس وقت تک محل میں موجود رہتی
تھی اور اس کی موجودگی میں زیادہ وہوم دھام خلاف تہذیب تھی۔ جب نیا
بادشاہ تخت نشین ہو لیتا تھا تو وزرا و امرا دست بستہ عرض کرتے تھے "ایک
غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہوگیا ہے، جہاں پناہ اس کی تجہیز و
تکفین میں امداد فرمائیں" اس پر بادشاہ خزانۂ عامرہ سے ایک خاص رقم
دلواتا تھا اور شاہ متوفی کی لاش محل کے چور دروازے نکالی جاتی تھی۔

بہرکیف شاہان اودھ میں نواب غازی الدین حیدر کے سوا کسی کی تخت نشینی
کی رسم غیر معمولی تزک و احتشام سے نہیں ادا ہوئی۔ خاندان اودھ میں یہ پہلے شخص
تھے جنھیں وزارت یا صوبہ داری کے درجہ سے بادشاہ کے مرتبے پر پہونچا دیا
گیا تھا۔ چونکہ یہ ایک غیر معمولی عزت تھی جو اس خاندان کو پہلی مرتبہ حاصل ہوئی
تھی لہذا اس موقع پر شاہانہ تزک و احتشام کی کوئی انتہا نہ تھی۔ خزانہ اس بیشمار دولت
سے لبریز تھا جو نواب سعادت علیخاں اپنی کفایت شعاری سے جمع کر گئے تھے
اور جس میں بائیس کرور روپیہ نقد تھا۔ زر و جواہر کے انبار اس کے علاوہ تھے۔ بادشاہ
کے لیے نیا تاج و تخت تیار کیا گیا تھا جو مکلل اور مرصع تھا۔ تمام سامان جلوس
کی تیاری میں ایک کرور روپیہ صرف ہوا تھا۔ تمام شہر میں آئینہ بندی کی گئی
تھی اور شاہی عمارات تکلف سے آراستہ ہوئی تھیں خصوصاً تخت گاہ (لال
بارہ دری) کی آراستگی نہایت زور پر تھی جہاں جلوس کا دربار ہوا تھا۔ بادشاہ
کئی کرور کے جواہرات زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اہل دربار کی پوشاکیں نہایت
زرق برق تھیں۔ جان منٹن صاحب رزیڈنٹ بھی درباری لباس پہنے ہوئے
تھے اور جھالردار پالکی میں تشریف لائے تھے۔ یہ زربفت کا جامہ پہنے

ہوئے تھے اور سر پر شملہ مغرق مع جیغہ و سرپیچ و گوشوارہ تھا۔ ان کے خاص خاص انگریز مصاحب بھی پُر تکلف ہندوستانی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ تمام اقربائے شاہی وارکانِ دولت و اہلکارانِ رزیڈنسی کو خلعت فاخرہ عطا کیے گئے تھے۔ نواب معتمد الدولہ کو خلعت وزارت اور خطاب وزیر اعظم دیا گیا راجہ دیاکرشن کو دیوانی عطا ہوئی سبحان علیخاں نے سکۂ شاہی کا شعر پیش کیا۔ پانچہزار روپے بطور انعام عطا ہوئے۔

سکہ زد بر سیم و زر از فضلِ ربِ ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہِ زمن

دربار میں رزیڈنٹ کے سوا کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ تاجپوشی کے وقت مجتہد العصر نے تاج کو سونے کی کشتی سے اٹھا کر رزیڈنٹ کے حوالہ کیا اور انہوں نے بادشاہ کے فرق مبارک پر رکھ کے نذر دی۔ فوراً مبارک سلامت کے شور سے ساری عمارت گونج اٹھی شاہی توپخانے سے سلامیاں دغنے لگیں اور سارے شہر میں غلغلہ پڑگیا۔ بادشاہ کے فرق مبارک پر سے جواہرات تصدق کر کے حاضرینِ دربار پر پھینکے گئے اور خاندان شاہی وارکان دولت کی نذریں گذریں اس کے بعد شاہ برآمدے میں تشریف لائے۔ زیر محل خلقت کا انبوہ تھا۔ یہاں بھی روپے اشرفی کی بارش ہوئی۔ ارباب نشاط نے گانا شروع کیا اور طرح طرح کے تماشے ہونے لگے +

مسز ابرٹس نے اپنی دلچسپ تصنیف "سین اینڈ کیریکٹر" میں شاہ نصیر الدین حیدر کے ایک دربار کا نقشہ دکھایا ہے جو خالی از لطف نہیں :۔

" اورنگ شاہی ایک مربع تخت ہے جو زمین سے دو فیٹ بلند ہے، اور "
" جس کے تین جانب کٹہرے لگے ہوئے ہیں۔ اس کے اوپر ایک "تار"

" شامیانہ ہے جس کی چوبوں پر خالص سونے کے پتر منڈھے کہ نہایت بیش "
" قیمت جواہرات جڑے گئے ہیں۔ شامیانہ قرمزی رنگ کی کاشانی "
" مخمل کا ہے جس پر زردوزی کا نہایت نفیس کام ہے اور چاروں طرف "
" موتیوں کی بہت دبیز جھالر لگی ہوئی ہے۔ جس مسند پر بادشاہ رونق "
" افروز ہیں وہ بھی اسی قسم کی مخمل کی ہے اور اسپر بھی زردوزی کا نہایت "
" عمدہ اور بھاری کام بنایا گیا ہے۔ نیز چتر شاہی بھی اسی کا ہے اور اسکے "
" گرد بھی خوش آب موتیوں کی دبیز جھالر ہے۔ خود بادشاہ سلامت بھی "
" سر سے پانوں تک بیش بہا جواہرات میں غرق ہیں خصوصاً گردن "
" سے کمر تک الماس، یاقوت، اور زمرد وغیرہ کے مالے ہی مالے "
" نظر آتے ہیں۔ تاج شاہی بھی جواہرات کا تارا منڈل ہے جس کے "
" بالائی حصے میں بہشت کی چڑیا (ہما) کے پر لگے ہوئے ہیں تخت "
" کے دونوں جانب دو اعلیٰ عہدہ دار مور کے پروں کی مورچھلیں ہلا "
" رہے ہیں جن کے دستے طلائی ہیں۔ تخت کے داہنے جانب دو "
" طلائی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں جو رزیڈنٹ اور اُن کی بیوی کے "
" لیے مخصوص ہیں۔ ان کرسیوں کے عقب میں اُن انگریزوں کی "
" جگہ ہے جو رزیڈنسی سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کرسیوں کے "
" دونوں پہلوؤں میں رزیڈنسی کے شاہی ملازم استادہ ہیں جنکی "
" پوشاکیں نہایت زرق برق اور طلاکار ہیں تخت کے بائیں طرف "
" دیسی امرا اور اعیانِ دولت کی جگہ ہے جن کے درباری لباس نہایت "
" فوق البھڑک اور قیمتی ہیں۔"

"بادشاہ کے قدموں کے پاس وزیر اعظم کھڑا ہوا ہے جو نذریں پیش"

" کرتا ہے۔ نذروں کی تعداد اکیس اشرفیوں سے لیکر چند روپوں تک "
" محدود ہے اور یہ نذر دینے والے کی حیثیت اور مرتبے سے تعلق رکھتی "
" ہے۔ نذر پیش کرتے وقت لوگ تخت کی جانب بڑھتے ہیں اور ہر "
" زینے پر باقاعدہ آداب بجالاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بادشاہ کے قریب "
" پہونچکر اپنی نذر کو ایک تہ کیے ہوئے رومال پر رکھکے پیش کرتے "
" ہیں اور بادشاہ اُسے قبول کرنے کے انداز سے ہاتھ لگادیتے ہیں۔ "
" بعدازاں یہ رقم وزیراعظم کو دیدی جاتی ہے جو اُسے لیکر اُس ڈھیر "
" میں شامل کردیتا ہے جو اُس کے پہلو میں لگا ہوا ہے۔ اس تقریب "
" کے بعد بادشاہ اور رزیڈنٹ اُٹھہ کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہ ایک "
" شخص سے ہاتھہ سے جو اسی خدمت پر مامور ہوتا ہے گوٹے کے ہار "
" لیتا ہے اور خاص اپنے ہاتھہ سے رزیڈنٹ کے گلے میں ڈالتا "
" ہے۔ بعدازاں رزیڈنٹ بادشاہ سے رخصت ہوتا ہے اور بادشاہ "
" اس کے ساتھہ دروازے تک آتا ہے جہاں ایک مختصر جملہ خداحافظ "
" کہتا ہے اور تھوڑا عطر رزیڈنٹ کے ہاتھہ پر انڈیل دیتا ہے اگر "
" رزیڈنٹ سے زیادہ موافقت ہوتی ہے تو یہ رسم اُن انگریزوں کے "
" ساتھہ بھی ادا کیجاتی ہے جو شریک دربار ہوتے ہیں +

" اُن درباروں میں خلعت، انعامات، اور خطابات بھی عطا ہوتے "
" ہیں۔ انعامات میں بیشتر ہاتھی مع ہودج یا گھوڑا مع زین وساز، یا پالکی "
" جھالردار ہوتی ہے۔ اس موقع پر نذر انعامات کی مناسبت سے "
" پیش کیجاتی ہے حتیٰ کہ بڑے بڑے عہدے اور جاگیریں پانے "
" والوں کی نذر بعض اوقات ایک لاکھہ روپیہ سے کم نہیں ہوتی۔ "

"یہ رقم ریشم کی ایک سو تھیلیوں میں لیجائی جاتی ہے جن کے منہ نقرئی "
"ڈوریوں سے بند ہوتے ہیں۔"
اسی کتاب میں شاہی سواری کے ایک جلوس کی کیفیت حسب ذیل قلمبند کی گئی ہے جب شاہ موصوف بتقریب کے موقع پر عیدگاہ تشریف لے گئے تھے:۔
"شاہی جلوس کے آگے آگے پچاس ہاتھی تھے جو شاہی نشان اور"
"ماہی مراتب وغیرہ لیے ہوئے تھے۔ ہر ہاتھی پر ایک فیلبان اور"
"دو بندوقچی سوار تھے جن کی وردیاں سفید تھیں۔ اور پگڑیاں اور"
"کمر بند سرخ و سبز بانات کے تھے۔ ان کے بعد توپخانہ کی ایک"
"جماعت تھی جس کے گولندازوں کی وردی نیلی تھی۔ اس کے"
"بعد سواروں کے دو رسالے تھے جن کی وردیاں گلنار تھیں اور"
"سیاہ ٹوپیاں دیئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیدل فوج"
"کا ایک دستہ تھا جس کے ساتھ فوجی ڈنکا بجتا جاتا تھا۔ اس کے"
"سپاہی گھٹنوں تک کا پائجامہ اور اونچی اونچی سرخ کرتیاں پہنے"
"ہوئے تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں باندھے ہوئے تھے"
"جلوس کے سب سے زیادہ شاندار حصے میں بادشاہ کی فیل گاڑی تھی"
"جس کے آگے آگے نجیبوں کا ایک زبردست غول تھا۔ اس نقرۂ"
"گاڑی میں بادشاہ ایک فاتحانہ انداز سے تخت پر بیٹھے ہوئے"
"تھے جو ان کے دربار کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھی۔ گاڑی میں چار"
"ہاتھی جتے ہوئے تھے جو رنگ روپ اور قد و قامت میں بالکل"
"یکساں تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ندیمان شاہی اور ارکان دولت"
"کی گاڑیاں تھیں جن میں صرف دو دو ہاتھی جتے ہوئے تھے لیکن"

"سب کی سب طلائی و نقرئی پتروں سے منڈھی ہوئی تھیں۔ جو نمک"
"خوارانِ شاہی ان گاڑیوں میں سوار تھے وہ سر سے پانوں تک جواہرات"
"اور زربفت میں جگمگا رہے تھے۔ ان کے شملوں میں نہایت قیمتی"
"جواہرات کی کلغیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور بیش قیمت موتی اور جواہر"
"کے طرّے، بازوبند، بدھیاں اور انگوٹھیاں وغیرہ پہنے ہوئے"
"تھے۔ ان کے پاؤں میں گھیتلے جوتے تھے جو مرصع بجواہر تھے"
"اور زردوزی کپڑے یا قیمتی شال سے بنائے گئے تھے۔ ان گاڑیوں"
"کے اردگرد چوبداروں، خواصوں، ہرکاروں اور دیگر شاہی ملازموں"
"کے غول تھے، جن میں بعض ننگی تلواریں چمکاتے جاتے تھے،"
"بعض جنبوریاں ہلا رہے تھے۔ اور بعض بہ آواز بلند ان عالی مرتبت"
"اُمرا کے نام و خطاب پکارتے جاتے تھے جن کی سواریوں کے"
"وہ ہمراہ تھے۔ ان کے دونوں پہلوؤں میں بیقاعدہ سواروں کا"
ایک زبردست ہجوم تھا جو نیزہ بازی اور دوسرے فوجی کرتب"
"دکھا رہے تھے۔ ان کے بعد بادشاہ کے کوتل گھوڑوں کی قطار"
"تھی جو مرصع ساز و براق سے آراستہ تھے اور جن کے سائیسوں کی"
"وردیاں نہایت زرق برق تھیں۔ ان کے پیچھے شاہی پالکی اور"
"میانہ تھا۔ یہ دیسی سواریاں نہایت شاندار وضع رکھتی ہیں جو خالص"
"سونے کے پتروں سے منڈھی ہوئی تھیں۔ ان کے کہاروں کی"
"لمبی وردیاں گلنار تھیں جن پر سنہری کارچوب کا کام تھا اور"
"ان کی پگڑیوں میں طلائی مچھلیاں اور شاہی مار کے لگے ہوئے"
"تھے۔ جلوس کے اس حصے میں ایک انگریزی ساخت کی بگھی بھی"

"خاص شان رکھتی تھی جس میں مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے اور"
"جسے ایک یورپین کوچبان گلنار وردی پہنے ہوئے ہنکار رہا تھا"
"بادشاہ کے انگریز مصاحب بھی درباری لباس پہنے ہوئے ہاتھیوں"
"پر سوار تھے، اور اُن کے پیچھے دیسی اُمرا کے ہاتھیوں کی ایک"
"لمبی قطار تھی۔ سب سے آخر میں سوار اور پیدل سپاہیوں کے دستے تھے"
"ان میں جو پلٹنیں ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعلق رکھتی تھیں ان کے"
"قومی جھنڈے کھلے ہوئے تھے اور فوجی باجہ بجتا جاتا تھا۔ ان کے"
"علاوہ تمام جلوس میں ہزاروں کارچوبی بیرقیں اور جھنڈیاں ہر جگہ"
"ہوا میں لہرا رہی تھیں۔"
"باوجود اس کمی انتظام اور بے قاعدگی کے جو ایسے عظیم الشان اور بے پایاں"
"جلوس کے لیے لازمی ہے، تمام جلوس بغیر کسی خاص ہنگامے کے"
"جس میں فوجوں کی مسلح شوری نے بہت کچھ اضافہ کر دیا تھا، منزل"
"مقصود تک پہونچ گیا۔ اس موقع پر یوروپین باجوں کے لیے دیسی"
"قرنا اور ڈھول وغیرہ کے شور کی ہمسری بالکل فضول تھی۔ جلوس"
"کے عیدگاہ تک پہونچنے پر مجتہد العصر نے نماز وغیرہ مذہبی رسوم"
"ادا کیے اور بادشاہ کے ہاتھ میں ایک چھری دی جسے انہوں نے"
"کلمۂ تکبیر پڑھتے ہوئے ایک اونٹ کی گردن میں پیوست کر دیا جو"
"قربانی کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ توپخانے کے گولنداز اس وقت"
"کے منتظر تھے اور انہوں نے اشارہ پاتے ہی توپیں داغنا"
"شروع کر دیں جن کی گھن گرج آوازوں سے تمام شہر گونجنے"
"لگا اور سب کو اطلاع ہو گئی کہ بادشاہ قربانی کی رسم ادا کر چکے۔"

لکھنؤ کے پرانے سین دکھاتے ہوئے ہم ایک شادی کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے یہ نواب آصف الدولہ بہادر کے نام نہاد پسر اور ولیعہد سلطنت میرزا وزیر علیخاں کی شادی تھی جس کی نسبت مؤرخین کا بیان ہے کہ خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد سے ہندوستان کو پھر کبھی ایسی دھوم دھام دیکھنا نصیب نہیں ہوئی صاحب قیصر التواریخ لکھتے ہیں کہ: "سنہ ۱۲۰۸ھ مطابق سنہ ۱۷۹۴ء شادی میرزا وزیر علی خاں کی ہوئی جس میں تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ جتنے صاحبان عالیشان اور امرائے عالی قدر دور نزدیک کے تھے سب شریک ہوئے تھے۔ صحبت مجلس عیش باغ وچار باغ میں ہوئی۔ اس خاندان میں اس تکلف کی کسی کی شادی نہیں ہوئی اور نہ اس قدر روپیہ صرف ہوا۔ اب اس کا احوال مثل کہانی خیالی کے ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاہجہاں آباد میں بھی وشادیاں یادگار زمانہ ہوئیں۔ ایک نواب شجاع الدولہ بہادر کی دوسری جوگل کشور کی۔ میرزا وزیر علی خاں کی شادی کا شمہ یہ ہے کہ پانسو چوگھڑا فقط چاندی کا تھا۔ حضرت خلد منزل (آصف الدولہ) نے فرح بخش میں نہر کے دونوں طرف قصر فلک بنوایا تھا۔ ظفر الدولہ (داروغہ خزانہ) نے کوٹھے (خزانہ) سے بھی چاندی کے گھڑے دیے تھے"

اس شادی کی کسیقدر تفصیلی کیفیت مسٹر فوربس کی نفیس کتاب "مشرقی کہانیاں" میں درج ہے جو اس شادی میں بنفس نفیس شریک تھے اور جنکا بیان نسبتہً زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"آصف الدولہ نے شہر کے قریب ایک میدان میں اپنے "
"خیمے نصب کیے تھے۔ ان میں دو بہت عظیم الشان خیمے تھے "
"یہ بہت مضبوط سوتی کپڑے کے تھے جن میں اعلیٰ قسم کی گوٹ لگی"

"بانات کی رنگ برنگ کی دھاریاں دی گئی تھیں۔ ان کی ڈوریاں"
"بھی ریشمی تھیں۔ ان میں ہر خیمے کی لاگت ساٹھ ہزار پاونڈ اسٹرلنگ"
"کے قریب تھی۔ ان کی دیواروں کی قناتیں دس فیٹ اونچی تھیں"
"اور چلمنوں کے ذریعے سے دونوں خیموں میں الحاق قایم کیا گیا"
"تھا تاکہ پردہ نشین بیگمات محفل کا نظارہ کرسکیں۔ شادی کے"
"روز نواب آصف الدولہ دو ملین اسٹرلنگ کے قیمتی جواہرات"
"پہنے ہوئے تھے۔ محفل والے خیمے میں دو سو نفیس جھاڑ دو سو"
"ہانڈیاں اور کئی ہزار کنول روشن تھے۔ ایک سو طائفوں کا"
"ناچ تھا جن کی پشوازیں نہایت زرق برق تھیں اور جو ہندی"
"فارسی مخلوط زبان میں گاتے اور ناچتے تھے۔"
" دولھا جس کی عمر تیرہ سال کی تھی سر سے پانوں تک اس قدر"
"جواہرات میں لدا ہوا تھا کہ مشکل سے جنبش کرسکتا تھا۔ دلھن"
"کی عمر دس سال کی تھی اور وہ اسی طرح جواہر کے دریا میں غرق تھی"
"سات بجے شام کو دونوں جدا جدا ہاتھیوں پر ایک حیرت انگیز"
"باغ میں لائے گئے جو ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ برات"
"کے جلوس میں صرف بارہ سو ہاتھی تھے جو زربفت کی جھولوں"
"اور قیمتی زیورات سے آراستہ تھے۔ ان میں ایک سو ہاتھیوں پر"
"چاندی کے ہودے رکھے ہوئے تھے سب کے بیچ میں آصف الدولہ"
"کا ہاتھی تھا جس کا قد و قامت نہایت غیر معمولی تھا۔ اس پر"
"جو ہودہ رکھا ہوا تھا وہ خالص سونے کا تھا اور اس میں"
"بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کی جھول"

" مغرق تھی اور تمام زیورات نہایت بیش قیمت تھے۔ نواب کے "
" داہنے پہلو میں ہمارے رزیڈنٹ "مسٹر جانسٹن" بیٹھے ہوئے "
" تھے اور بائیں جانب دولھا متمکن تھا"

خیموں سے باغ تک سڑک کے دونوں جانب روشنی اور آتشبازی گڑی ہوئی تھی اور ہاتھی کے ہر قدم پر ہمارے سامنے کی زمین چمک اٹھتی تھی۔ ہزاروں ہوائیاں ہوا میں بلند ہو کر آسمان تک کو منور کر دیتی تھیں اور ان پر مہتابوں کی روشنی کے اضافہ سے تاریک رات روز روشن معلوم ہوتی تھی ہماری برات میں مشعلوں اور پنجشاخوں کے علاوہ صرف تین ہزار کنول روشن تھے جنھیں خدمت گار لیے ہوئے تھے اس شاہانہ تزک و احتشام سے ہم لوگ باغ تک پہنچے اور ہاتھیوں سے اتر کے اس میں داخل ہوئے باغ میں مختلف رنگ کی بیشمار قندیلیں روشن تھیں جو درختوں کی شاخوں میں آویزاں کی گئی تھیں۔ اس کے وسط میں ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کے زینے پر چڑھ کے ہم ایک وسیع مہمان خانہ میں داخل ہوئے جو نہایت نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا اسمیں انگریزی ساخت کے جھاڑ کنول لگے ہوئے تھے جن میں مومی شمعیں روشن تھیں یہاں ہمارے سامنے ولایتی اور دیسی قیمونیں نہایت نفاست کے ساتھ کھانا چنا گیا۔ ساتھ ہی تقریباً ایک سو طائفے اپنی سُریلی آوازوں میں گاتے اور اپنا دیسی ناچ دکھانے لگے صبح صادق تک یہی پر لطف جلسہ رہا۔ اس کے بعد ہم لوگ اپنے گھروں کو واپس ہوئے اس تقریب کے تمام اخراجات جسمیں تین راتوں تک متواتر ایسے ہی جلسے ہوتے رہے تین لاکھ پونڈ یعنی پینتالیس لاکھ روپیہ سے زائد تھی۔

بنت نزہت

عذر تقصیر

میں گنہگار ہوں بندہ ترا اے رب قدیر — جرم وہ میں نے کیے ہیں کہ نہیں جن کی نظیر
سوچتا ہوں تو نکلتی نہیں کوئی تدبیر — تاکہ ہو روز جزا کچھ نہ سزائے تقصیر

یوں تو ہے گرچہ بہت بیم قیامت سے مجھے
ناامیدی نہیں لیکن تری رحمت سے مجھے

صاف ظاہر ہے کہ میں عفو کے قابل ہی نہیں — عذر بے جا ہے مرے کچھ مجھے حاصل ہی نہیں
یہ تو کس طرح کہوں میں کہ تو عادل ہی نہیں — ہاں مگر رحم جو آجائے تو مشکل ہی نہیں

کام دشوار سے دشوار بھی آساں ہو جائے
یکقلم محو مرا دفتر عصیاں ہو جائے

تجھکو معلوم ہے کوئی بھی نہیں میرا کفیل — کم بضاعت ہوں میں سرمایۂ نیکی ہے قلیل
دل کو میرے ہے یہی فکر خداوند جلیل — کہیں محشر میں نہ ہو جاؤں میں رسوا و ذلیل

آبرو کا ہوں طلب گار وہ انساں ہوں میں
تجھسے اے بحر کرم فیض کا خواہاں ہوں میں

یوں تو دولت بھی زمانے میں عجب نعمت ہے — باعث عیش و نشاط و طرب و عشرت ہے
اس سے مفلس کو بھی زردار کو بھی الفت ہے — جمع کرنا مگر اس چیز کا اک آفت ہے

سبب جاہ و حشم کچھ زر و دولت ہی نہیں
آبرو جس کی نہیں اس کی کچھ عزت ہی نہیں

بس اگر ہے بھی تو یارب مجھے عزت کا خیال — دوسرا کوئی نہ اندیشہ نہ غم ہے نہ ملال۔
کون ہے تیرے سوا اور میرا واقف حال — تجھکو اے صاحب قدرت نہیں کچھ امر محال

میری جانب نظر شافع محشر ہو جائے
آبرو ذرہ کی خورشید سے بڑھکر ہو جائے

دستگیری کو مری جب بڑہیں محبوب خدا | اور فرمائیں کہ اے بندہ عاصی اٹھ آ۔
چل شفاعت کے لیے ہوتا ہوں ضامن تیرا | کیوں ہراساں ہے؟ محمدؐ سا جو ہے راہنما!

بحر عصیاں سے کہیں وہ۔ کہ نکالا ہیں سنے
تو یہ فرمائے کہ بخشا اسے بخشا ہیں سنے

جب کہیں وہ کہ تھی ہر چیز سے نفرت اس کو | تھی نہ دنیائے دنی سے بھی محبت اس کو
مجھسے تھی یا مری اولاد سے الفت اسکو | حکم صادر ہو ترا بخشدو جنت اس کو

جائے کوثر پہ۔ یہ ہے عاشق اولاد رسولؐ
عذر تقصیر کو ارشد کی کیا ہم نے قبول

آغا غلام حسین ارشد

غزل

بادہ کش الست ہوئے ہوشیار کب | قالو بلا کہے سے بھی م ترا خمار کب
تو ہی نہ ہو تا گل میں جو جلوہ نما تو پہر | یوں چیخ چیخ جان کو کھوتا ہزار کب
ہر ہر قدم پہ تیرے قیامت بپا ہوئی | فتنہ نے تیری چال سے پایا قرار کب
جنت میں اس کے ملنے کی ہوتی نہ گر امید | کرتے پسند مے کو بھلا بادہ خوار کب
ہو کرکے نیم بسمل تیر نگاہ شوخ | تڑپا نہ مثل مرغ دل بیقرار کب
یہ بیخودی شوق میں کیا ہو کے رہ گیا | دست خیال چھٹ گیا دامان یار کب

دن سات زلف و رخ کا چھٹا ان کے کب خیال
خورشید سے جنوں میں چھٹے غمگسار کب

خورشید

رسم و رواج اور انسان کی فطرت

اس امر سے شاید کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ بھلائی اور برائی کے جانچنے کا معیار خود انسان کی فطرت ہے۔ دنیا کی ہر شے ہماری ذات کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتی ہے۔ گو وہ تعلق عام طور پر ایک ساں نہیں ہوتا۔ بعض چیزوں کے ساتھ ایسا تعلق ہوتا ہے جسے ہم خوشگوار کہتے ہیں۔ اور بعضوں کے ساتھ ایسا جسے ناگوار سمجھتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ دراصل خوشگواری یا ناگواری کیا ہے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ گلاب کا پھول دیکھنے میں اچھا سا معلوم ہوتا ہے اور خوشبو بھی ہے۔ برعکس اس کے کسی بدبودار شے (فرض کیجئے ہینگ) سے ہمیں ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہوتی ہے اس کی بو سے ہمارا دم ناک میں آتا ہے۔ یہی خوشگوار یا ناگوار تعلق کا احساس جو ہمارے اور دنیا کی ہر شے کے ساتھ وابستہ ہے اس فطرت کا پتہ دیتا ہے جو صانع مطلق نے ہماری تخلیق میں ملحوظ رکھی ہے فطرت انسان کو محض ان محسوسات اور کیفیات سے تعلق ہے جو حواس ظاہری و باطنی کا نتیجہ ہیں ہم کسی چیز کو دیکھ کر یا سنکر سونگھ کر چھو کر یا چکھ کر کیوں محظوظ یا منغص ہوتے ہیں؟ صرف اس وجہ سے کہ ہمارے حواس خمسہ اوسی طور کی شہادت دیتے ہیں۔ دنیا میں ہر شے کے جانچنے کا آلہ یہی حواس خمسہ ہیں اور ہماری فطرت انہیں حواس خمسہ کی ماتحت ہے۔

ہمیں دنیا میں ایک خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لیے خود ہماری فطرت ایک بہترین رہنما ہے۔ نیچر کے سارے کارخانے ایک مستقل اصول کے پابند ہیں جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے۔ ہماری فطرت کا مقتضا بھی یہی ہے کہ

ہمارے سارے کام اسی اصول پر منضبط ہوں۔ اگر ہم اس غیبی ہنما یعنی فطرت کے نقش قدم پر چلتے چلیں تو کبھی راہ راست سے بھٹک نہیں سکتے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ ہم اس سچے راہ نما یعنے اصول فطرت کی مخالفت کرکے راہ سے گمراہ چلیں اور پھر منزل مقصود تک پہونچ ہی جائیں۔ ہم ہزار اس کی مخالفت کریں مگر اس پر کبھی فتح نہیں پا سکتے۔ ہم ہزار اس سے انحراف کریں مگر اس کی استحکام میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ قطب نما کی صداقت سے اگر ہم انحراف کریں تو خود منزل مقصود سے کوسوں بھٹک جائیں گے۔ لارڈ بیکن کا قول ہے کہ نیچر پر ہم کسی طرح فتح نہیں پا سکتے سوائے اس کے کہ ہم اس کی متابعت کریں۔ اور اسی مضمون کو لارڈ ٹینی سن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہم نیچر کی (قوتوں کی) متابعت کرکے اس پر حکمرانی کرتے ہیں۔ علاوہ ان حکمار کے حکیم علی الاطلاق خداوند جل شانہٗ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے "لا تبدیل لفطرت اللہ" یعنے فطرت نہیں بدلتی اور یہ بھی فرمایا ہے "فطرت اللہ فطرت الناس" یعنے یہ وہی فطرت ہے جس کے مطابق انسان کی تخلیق واقع ہوئی ہے۔ پس جب فطرت کے قوانین ایک ایسے مستحکم اصول پر ہیں کہ ان سے انحراف یا چشم پوشی یا بے پروائی کرکے سوائے تجلت یا پشیمانی یا ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہاتھ آتا اور نہ ہماری مخالفت سے اُن میں کوئی تغیر پیدا ہوسکتا ہے تو انحراف ہمارا (خواہ وہ ہماری معاشرت کے متعلق ہو یا ہمارے سوسائٹی یا قومی اور ملکی ضروریات یا زندگی کے اور کسی امور کے متعلق ہو) خود ہماری تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوگا۔ اور دشوار اور پیچیدہ مرحلوں میں پھنسا کر منزل مقصود سے ہمکو بہت دور بھٹکا دیگا اور اگر اسیکو مذہبی رُخ سے دیکھئے تو ایک گناہ بھی ہے۔ لہذا فطرت کی مطابقت کا حق یہ ہے کہ اسکی جو ہدایت جہاں پر ہو اُس پر کاربند ہو اور جہاں جس امر سے یہ روکے

اُس سے اجتناب کرے۔

جب یہ امر یقینی ہے کہ دُنیا میں رہ کر اصول فطرت سے انحراف کرنے والا ہمیشہ نادم و پشیمان ذلیل و خوار رہے گا۔ تو شاید ہی کوئی شخص ایسا جاہل ہوگا جو دانستہ منشار فطرت کی مخالفت کرکے اپنے تئیں مورد بلا بنانا پسند کرے گا۔

مگر افسوس اور ہزار افسوس اس امر کا ہے کہ بدقسمتی سے انسان میں خلاف فطرت و مضر صحت چند ایسے رسم و رواج جاری ہوگئے ہیں جو بالکل مقتضائے فطرت کے منافی ہیں عقل کا منشا اور ہادی فطرت کی ہدایت تو یہ تھی اور ہمیشہ رہے گی کہ رسم و رواج عین فطرت کے مطابق ہوتے مگر کسی نہ کسی وجہ سے اکثر اقوام میں ایسی ایسی رسمیں جاری ہوگئیں جو بالکل ناپسند اور خلاف عقل ہیں میں ان سب رسم و رواج کا یہاں پر نام لینا نہیں چاہتا۔ ان کہ وہ کون کون سے اور کہاں کہاں ہیں۔ فقط اس قدر دکھانا منظور ہے کہ اندھی تقلید میں انسان نے کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اگر مذہبی حیثیت سے بھی ہم دیکھیں تو ظاہر ہے کہ اصول فطرت کو ایک مستحکم بنیاد پر خدا ہی نے قایم کیا اور گویا اُس کی مخالفت عین خدا کی مخالفت ہے۔ کسی سچے دین کے احکام کبھی فطرت کے خلاف نہیں پائے جائیں گے۔ پھر کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ ہم بعض رسم و رواج کی اندھی تقلید کے پیچھے نہ حکم خدا پر نظر رکھتے ہیں اور نہ فطرت کے منشار پر غور کرتے ہیں اور گو اس کے بُرے نتیجے بھگتنے بھی پڑتے ہیں مگر ان رسم و رواج قبیح کو نہیں چھوڑتے۔

منشار فطرت کے خلاف عمل پیرا ہونے کی ایک عمدہ مثال رومن کیتھولک فرقہ کے عیسائیوں میں "مونک" اور "نن" بنانے کا دستور ہے۔ مونک ان پادریوں کو کہتے ہیں جو تمام عمر شادی نہیں کرتے۔ اسی طرح "نن" ان عورتوں کو کہتے ہیں

تمام عمر کنواری بیٹھی رہتی ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی ایک یہ رسم جاری ہے کہ جو لڑکیاں کمسنی میں بیوہ ہو جاتی ہیں اُن کا عقد ثانی نہیں کرتے اور خدا جانے کیونکہ وہ لوگ اپنی زندگیاں بسر کر لیتے ہیں۔

اب یہ امر قابل غور ہے کہ انسان فطرت کے تقاضوں سے منھ پھیر کر اور بے پروائی کر کے کہاں تک اور کب تک خوش اور کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور جو کچھ ناگوار نتائج اس قسم کے مخالفت فطرت سے پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ہمکو بھوک لگتی ہے تو کھانا کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ پیاس ہوتی ہے تو پانی پی لیتے ہیں۔ جاڑوں میں جسم کے استحفاظ کے لیے اور گرمیوں میں لو سے بچنے کے لیے سامان ضروری کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ان تقاضائے فطرت سے ہم بے پروائی کریں گے تو نتیجہ ہمارے ہی حق میں مضر اور تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ غرض باوجودیکہ ہم قانون فطرت کے نتایج کی نسبت عین الیقین رکھتے ہیں پھر بھی بعض رسم و رواج کے پیچھے اُن نتیجوں کو برداشت کرتے ہیں۔

ہم کو جاننا چاہیئے کہ فطرت کی متابعت ہی میں ہماری فتح ہے اور اُس سے جنگ کرنے میں خود ہماری شکست اور ہلاکت ہے نتیجہ اس بحث کا یہ ہے رسم و رواج جو اصول فطرت کے بالکل مطابق ہیں اور کسی طور سے مضر صحت و مخرب اخلاق نہیں ہیں وہی اخل معاشرت کرنے چاہیں۔ اور جو رسم و رواج فطرت کے خلاف ہیں اُن کا سوسائٹی سے بالکل خارج کر دینا لازم ہے۔ افسوس ہے کہ خیر خواہان قوم اس پر توجہ نہیں کرتے کہ کون کون سے رسم و رواج منشار فطرت کے خلاف ہم لوگوں میں جاری ہیں پس ایک یہی دھن ہے لاؤ چندہ لاؤ چندہ۔

من انچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہی از سخنم پند گیر خواہ ملال۔

مینہ راعہ حسن بیں

مدینہ کی ایک مغنیہ (عزۃ المیلا)

طویس مغنی

گذشتہ سے پیوستہ

کھانا کھاتے کھاتے بھی سمیہ ان مناظر کیطرف آنکھ اٹھا اٹھا کر دیکھتی جاتی تھی، کہ عزہ نے اُس سے پھر سوال کیا "کیوں سمیہ؟ تم نے مجھے ابتک اِس کا جواب نہ دیا کہ تم پر آج خاموشی کیوں چھاگئی ہے۔" اتنا کہہ کر عزہ منتظر جواب ہی کہ پھر سمیہ نے اِن مغربی مناظر کو دیکھا، تو حیرت سے اُس کی پتلیاں اُس طرف جم گئیں مُنہ کا لقمہ وہ چبانا بھول گئی، اور ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہا۔

عزہ نے پھر مکرر سوال کیا، اور حیرت کی وجہ پوچھی، اسپر وہ کھانے میں مشغول ہوکر بولی "مجھے یہ درخت متحرک سے معلوم ہورہے ہیں، خدا جانے کیوں؟ میری نظر ایسی غلطی کھا رہی ہے۔" اب عزہ نے بھی اُدھر دیکھا، اور ذرا آنکھ جما کر دیکھنے سے اُسے اس کی کنہ معلوم ہوگئی کہ درختوں کے نیچے دو شتر سوار جارہے ہیں، اور ان کی رفتار سے درختوں کے تنہ بھی متحرک نظر آتے ہیں، پھر اُس نے سمیہ کے شک کو اس خیال سے رفع کیا، سمیہ بھی مان گئی، اور اُس نے کہا، کہ اسیطرح دُو شتر سوار پانی کے اندر بھی نظر آتے ہیں، جس پر عزہ ہنسنے لگی۔ اور خوش فعلی کے انداز سے اُس کے گال پر آہستہ سے طمانچہ مار کر بولی "بھولی لڑکی پانی میں جو شتر سوار نظر آتے ہیں، وہ ان سوار دنکا جو تالاب کے کنارہ جارہے ہیں عکس ہے،

بلکہ ان کے پیچھے ایک ایک تیسرا سوار بھی وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل رہا ہے استنے میں وہ سوار درختوں کے سایہ میں پہونچکر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ عزہ نے سمیہ سے کہا فکر کی کوئی بات نہیں، اس راستہ سے دمشق کی آمد و رفت لگی ہی رہتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی کوئی دمشق ہی کے مسافر ہوں گے" لواب کھانا کھاؤ ہوا میں خنکی آچلی ہے، اس لیے یہاں اب زیادہ تر ٹھہرنا مناسب نہیں، ہاں! میں آج تمھیں ایک ایسی عمدہ خوش آیندہ راگنی سنانے والی ہوں، جس سے تم بہت محظوظ ہوگی، اور جسے میری شفیق معلمہ نے مجھے بڑی محنت سے بتایا تھا، اور میں نے بھی خون جگر پی پی کے اُسے سیکھا تھا"

اس کے بعد پھر دونوں کھانے میں مشغول ہوگئیں، ہنوز فراغت نہ ہوئی تھی کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے شمع خاموش کردی، عزہ نے فوراً دستک دی، اور نیچے سے ایک خوش قطع شخص صاف ستھرے لباس میں، اوپر آیا، جسے آتا ہوا دیکھکر سمیہ نے اپنا چہرہ نقاب سے چھپایا، عزہ کو اسپر ہنسی آگئی، اور کہنے لگی، سمیہ! کیا تم مخنث سے بھی پردہ کرتی ہو" بات یہ تھی کہ سمیہ تاریکی شب سے اس کی تمیز نہ کرسکی کہ یہ آنے والا شخص مرد ہے یا مخنث[۱]،

---

[۱] مدینہ میں ان مخنثوں کی ایک جماعت کثیرہ تھی، جو بے تکلف عورتوں میں آتے جاتے، اور اُن سے ملتے جلتے تھے۔ مشاطہ گری کا کام بھی زیادہ تر ان سے انجام پاتا تھا، جس کا طریقہ یہ تھا، کہ جب کوئی نوجوان شادی کرنا چاہتا، تو ان میں سے کسی ایک سے مشورہ کرتا، یہ خواتین کے اصلی اوصاف اور خوبیوں کا مرقع اپنی جادو بیانی تقریر سے اس کے سامنے کھینچ دیتے، جس سے انتخاب میں ایک گونہ سہولت ہوتی

یہ مخنث جب آکر سامنے کھڑا ہو گیا، تو عزہ نے اُس سے پوچھا،

عزہ :- طویس! کیوں آئے ہو؟

طویس کا نام سنکر سیرہ نے تعجب سے سوال کیا، کیا طویس یہی ہے؟ عزہ نے جواب دیا ہاں یہی ہے، اور اس کا ہمارے پاس اس وقت بلا اطلاع چلا آنا کوئی نئی بات نہیں، بلکہ یہ پہلے سے اس طرح بے تکلف آنے جانے کا عادی ہے"

طویس سے خطاب کرکے" اچھا طویس! باندی سے کہو شمع روشن کر جائے"

طویس :- میں ایک شرط سے بولوں گا،

عزہ :- کیا شرط ہے؟"

طویس :- اس شرط سے کہ مجھے ایک شعر ہزج[1] میں سناؤ،

عزہ - مجھ سے ہزج میں شعر سننا چاہتا ہے، حالانکہ تو خود اہزج الناس ہے ہاں اگر ثقیل یا رمل میں سننا ہو، تو میں سناؤں گی،

طویس - اچھا تمھاری جیسی خوشی ہو، مجھے تو شعر سننے سے مطلب ہے

عزہ - اچھا سناؤں گی، مگر مجھے تیری صورت سے اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کیونکہ تیری نحوست اور شوم زبان زد ہے،

بقیہ نوٹ صفحہ) انتخاب کے بعد اگر بحث مرحلہ بھی ان کے ذمہ کیا جاتا تو وہ اسے بھی بحسن اسلوب انجام دیتے - عزہ کے یہاں ان لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تر اس بنا پر تھی، کہ یہ اس کے پاس اپنا تقرب جاتے - اور وقتاً فوقتاً موسیقی کے کچھ نئے سُر اس سے حاصل کر جاتے، سب میں طویس عزہ کا زیادہ منہ چڑھا تھا - ۱۲

[1] یہ عربی بحروں کے نام ہیں، ۱۲-

طولیس: "مجھ سے بڑھکر شوم کون ہوگا، میں ماں کے پیٹ سے اُس روز پیدا ہوا جس روز نبی کریم (صلعم) نے وفات پائی، یعنی جو ذات باعثِ تخلیق عالم تھی اُس کے وجود کی تجلی اہلِ عالم کی نظر سے جس روز پوشیدہ ہوئی، میری دودھ بڑھائی اُس روز ہوئی جس روز صدیق اکبرؓ نے انتقال کیا، یعنی صحبت برار اور ہمنشینان رسول اللہ کے ایک فرد اعظم کے حادثۂ ارتحال سے دنیائے اسلام پر غم والم کی گھٹا چھائی تھی، پھر بلوغ کو میں اُس روز پہونچا، یعنی دستورِ دنیا کے مطابق اعتبار کا ایک جزو بھی مجھے قدرت سے اُس روز عطا ہوا، جس دن عمر ابن خطابؓ کی شہادت کا قیامت خیز واقعہ وقوع میں آیا، اسی طرح بیوی کے ساتھ میری خلوت کا روز وہ تھا جو شہادت عثمانؓ کا روز ہے اور میرے یہاں ولادتِ فرزند علی شیرِ خدا کے شہادت کے روز ہوئی۔"

عزہ اس صاف گوئی، اقرار نحوست، اور تطبیق واقعات پر متعجب ہوئی۔ اور اُس نے ہنسکر کہا "خدا کے لیے اپنی اس نحوست کو کہیں آج ہم پر ختم نہ کرنا تمھاری فرمایش بہر حال پوری کیجائے گی۔"

اجنبی مہمان شب

اس گفتگو کے بعد طویس نیچے اتر آیا، اور پھر چند لحظوں کے بعد عزہ اور سمیہ بھی نیچے آگئیں، اور مہمانوں کے کمرہ میں جا بیٹھیں، عزہ زانو پر تکیہ جما اُس سے سہارا دے کر صدر نشست میں بیٹھ گئی، اور سمیہ اُس کے بازو میں جا بیٹھی، اور اپنے خیالستان میں تخیل کی پرواز سے پہونچ گئی، طویس یہاں موجود تھا، ام ثما، اور جیبث سے دیوار و منبر جسیٹے ہوئے

آلات موسیقی، اور مزامیر میں سے ایک دُف لاکر عزہ کے سامنے رکھدیا، اور کہنے لگا اب کچھ چھیڑیئے"

عزہ" بندۂ خدا ذرا صبر کر، ابھی کھانا کھایا ہے، آرام بھی سے لینے دیگا،

یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ باغ کے قریب سے کچھ اونٹوں کی آواز معلوم ہوئی جسے سنکر عزہ نے کہا "طویس ذرا دیکھ تو اس رات میں کون آنے والا ہے، خدا خیر کرے تیرے قدم کی برکت کیا بلا نازل کرتی ہے" اتنے میں سمیہ بول اٹھی سمیہ" ہمیں کسی بات کا ڈر نہیں، ہم یہاں بالکل امن میں ہیں" اتنا کہکر پھر ذرا دھیمی آواز سے بولی" نہیں ہم یہ کیسے کہیں کہ ہم امن میں ہیں، جبکہ امیر وقت انواع و اقسام کے مصائب میں گرفتار ہے، اور واہ پانی اسپر بند ہے اچھا طویس جا کر خبر تو لا، کہ کون آیا ہے؟

طویس ایک عجیب انداز سے جوتہ پہن، اور اٹھکیلیاں کھاتا ہوا چلا، اور دروازہ پر پہونچکر ایک پٹ کھولا اور سر نکالکر دیکھا تو دو اونٹ باہر کھڑے تھے، جن کی مہاریں دو شخصوں کے ہاتھ میں تہیں، جس میں سے ایک طویل القامت تھا اور معزز معلوم ہوتا تھا، جس کا چہرہ چہرہ بند کوفیوں کی طرح چھپا ہوا تھا، اور عبا زیب بر تھی، دوسرا اس کی بہ نسبت کوتاہ قامت تھا اور قرینہ سے پہلے شخص کا خادم معلوم ہوتا تھا، طویس نے پوچھا، آپ کون ہیں اور کہاں سے اور کیوں تشریف لائے"؟ طویل نے آواز بنا کر جواب دیا، ہما اعلم غالبًا اس معاملہ میں ہمیں غلط ہدایت نہیں کرتا کہ یہ مکان عزۃ المیلاءؔ کا ہے"!

طویس" بے شک یہ عزہ کا مکان ہے، آپ کی غرض کیا ہے؟

طویل۔ میری غرض مکان میں آنے، اور صاحب مکان سے ملاقات

کرنی کی ہے،

طوبیس۔ کیا اپنی تعریف آپ مجھے بتائیں گے؟

طویل۔ نہیں، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں،

طوبیس،۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی اطلاع کردوں،

یہ کہہ کر طوبیس اندر چلا گیا، اور عزہ کو اس شخص کے آنے کی اطلاع کی، جس کے ساتھ ہی سمیہ نے کہا " مجھے تو اب اجازت دیجئے۔ کیونکہ مجھے آئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا، علی الخصوص ایسی حالت میں میرا ٹھہرنا یہاں اور بھی غیر مناسب ہے، جبکہ کچھ اجنبی مہمان یہاں آگئے ہیں"

عزہ۔ جیسی تمہاری خوشی، میں ایسے موقعہ پر روکنا بھی مناسب نہیں خیال کرتی

اس کے بعد سمیہ رخصت ہوئی، عزہ نے چند قدم اس کی مشایعت کی، اور ایک مخصوص پشت کے دروازہ سے اُسے رستہ بتا کر واپس ہوئی۔

واپس ہوئی تو عزہ نے طوبیس سے کہا کہ جاکر یا تو اُس آنے والے کا چہرہ دیکھ،" یا کچھ نام ونشان پوچھ کر آ۔

طوبیس گیا اور چند لمحہ کے بعد واپس آیا، اور کہا آنے والا شخص اہل باقہ سے ہے، اور محض آپ کے گانے کا شوق اُسے یہاں کھینچ لایا ہے، نام نہیں بتاتا مگر میرے اصرار پر اُس نے صرف اتنا پتہ دیا، کہ ان دو بیتوں کا قائل میں ہی ہوں"

وذی حاجۃٍ قلنا لہ لا تبح بھا[1] فلیس الیھا ما حییت سبیل

لنا صاحب لا ینبغی ان نخونہ[2] وانت لاخری صاحب وخلیل

[1] اور بہت سے خواہشمند ایسے ہیں جن سے کہا کہ نہ تحیہ سلام کرو اسکو کیونکہ اُس تک تحیہ کی رسائی ہی نہیں

[2] میرا ایک دوست ہے کہ جس کی امانت میں مجھے خیانت نہیں اور ایسے ہی تو دوسرے کا یار اور صحبت بردار ہے،

لیلی الاخیلیہ

عزہ نے طلیس سے جب یہ سنا، وہ اپنی جگہ پر خوشی سے اچھل پڑی، اور اگر اس کی فربہی اسے اجازت دیتی تو ضرور دروازہ تک اس مہمان کے استقبال کو جا پہونچتی۔ طویس نے اس کی اس بے اختیاری پر تعجب سے پوچھا "کیوں آپ ایسی خوش کیوں ہوئیں"

عزہ:۔ طویس کیا تجھے نہیں معلوم کہ آنے والا شخص کون ہے؟

طویس:۔ میں نہیں واقف ہوں۔

عزہ۔ اگر میں اس کی زبان سے کسی غیر کا کلام بھی سنتی، تو باتوں ہی باتوں میں اسے پہچان لیتی، کیا تو نے خیال نہیں کیا کہ اس نے حرف مضارع کو مکسور ادا کیا ہوگا مثل اہل بہرا کے،

طویس:۔ کچھ خیال تو مجھے پڑتا ہے کہ اس نے ایسا کیا، اگرچہ میں نے زیادہ توجہ اسپر نہ کی۔

عزہ۔ ہمارا مہمان شب لیلیٰ الاخیلیہ مشہور شاعرہ ہے، جس کے یہ شعر ہیں:

طویس:۔ (خوش ہو کر) عجب حسن اتفاق ہے، اب تو میرے ذوق سماعت کی بن آئی اس کی زبان سے شعر بھی سنوں گا اور اس کے ساتھ توبہ ابن حمیر کے عشق کا دلکش فسانہ بھی، اس موقع پر اس تذکرہ کی چھیڑ کچھ بے محل اور لیلی کے برخلاف مزاج تو نہ ہوگی،

عزہ:۔ ہرگز نہیں، لیلی کو تو یہاں نہایت بے تکلف پائے گا۔ باوجود اہل بادیہ ہونے کے جو بلا ضرورت آبادی میں آنا برا جانتے ہیں، وہ کبھی کبھی یہاں آجاتی ہے۔

اس کے بعد طوبیس اپنے بوڑھے غزہ دکھاتا ہوا پھر دروازہ پر پہونچا اور عزہ کی جانب سے تاخیر پر معذرت، اور عمدہ الفاظ میں مشتاقانہ خیر مقدم کیا۔ پھر تینوں باغ میں داخل ہوئے طوبیس لیلیٰ کے پیچھے تھا، اور اُس کی کشیدہ قامتی اور حسن رفتار کو حیرت سے دیکھتا جاتا تھا، کیونکہ عرب خواتین میں لیلیٰ کی طوالت صفت نادرہ تھی، اور اُس کا انداز خرام نرالا، مگر دلکش،

تھوڑی دور جاکر لیلیٰ نے خادم کو اشارہ کیا کہ اونٹوں کو وہ عرش و زخرف سے بنے ہوئے مسقف مقام میں لیجاتے۔ یہ حکم دے کر وہ چلی گئی، اور جونہی عزہ کے سامنے پہونچی، عزہ بڑے تپاک اور گرمجوشی، سے اُس کے استقبال کو یہ کہتی ہوئی بڑھی" مرحبا بلیلیٰ - اهلاً بك یا حبیبه - لقد بالغت فی الاختفاء حتے اسأنا معاملتك - واخرناك اور نہایت اعزاز و خلاص سے اُسے صدر میں تکیہ کے سامنے لیجاکر بٹھایا، لیلیٰ نے (بھاری اور مردانی آواز سے مشابہ آواز میں) جواب دیا،

کچھ مضائقہ نہیں، مری ہی غلطی تھی، میرا خیال تھا کہ لب و لہجہ اور آواز سے میں آسانی کے ساتھ پہچانی جا سکوں گی "

طوبیس دروازہ سے لگا ہوا اس اشتیاق میں کھڑا باتیں سُن رہا تھا کہ کاش! لیلیٰ چہرہ کھولدیتی، تو اُس کے رُخ زیبا کی زیارت بھی کرلیتا، لیلیٰ کے دل میں یہ تھا، کہ "یہ کمبخت یہاں سے ٹلتا، تو میں فراغت کے ساتھ سامان سفر اور اشیار تبدیل ہیئت سے ہلکی ہو کر عزہ سے کچھ باتیں کرتی، اتنے میں عزہ اُس کے دلی خیال کو تھوڑا تاڑ کر بول اُٹھی" پیاری لیلیٰ! یہ مخنث ہے، پردہ کی چیز نہیں، اور اس سے زیادہ اس کی تعریف یہ ہے، کہ طوبیس مغنی بھی ہے " لیلیٰ یہ سنکر ہنسنے لگی، اور چہرہ بند وغیرہ اُتار دیا، اور کہنے لگی"

وہی طویس جس کی نحوست اور شوم نے اُسے مشہور کر رکھا ہے؟ میں اسے دیکھکر بہت خوش ہوئی"!

مگر لیلیٰ کا چہرہ کھلتے ہی طویس اُس کے حسن سے مرعوب ہو گیا، اسکی چشم غزالاں نے جادو ڈالا، دانتوں کی آب و تاب بہار عقل کو لے اُڑی، چہرہ کی رونق اور شگفتگی نے (جو بادیہ نشینوں کے چہرہ سے خاصکر جھلکتی ہے)، ہوش و حواس لے لیے اور بیچارہ طویس صورت بت بنکر رہ گیا، مگر لیلےٰ کی باتوں میں جو اس نے بوئے اُنس پائی، تو خوشی سے پہل گیا، اور یہ کہتا ہوا بقصد قربت مسند کیطرف جسپر لیلیٰ اُٹھی تھی، بڑھا، مجھے آج اپنی خوش بختی اور یاوری طالع پر ناز کرنے کا بجا حق حاصل ہے کہ عرب کی قابل فخر شاعرہ بارعہ کی ملاقات مجھے نصیب ہوئی، اور اُس حسن قدرت کی تصویر مجسم نے لطف فرمائی سے ایک خادم کی ذرہ نوازی بھی فرمائی، تیرے عشق میں توبہ ابن حمیر کے گداز کا واقعہ اور اس کا پُر تاثیر کلام جب کوئی مجھے سناتا تھا، تو میں سے سنتا تھا، اور حیرت کرتا تھا، کہ تو ایک شوہر دار عورت ہے، بجبہ سے اُس کا شغف اُس کی صحت دماغ کا کرشمہ ہر گز نہیں کہا جا سکتا، مگر آج اس چہرہ نے جس میں صبح درخشاں کی چمک اور دلربائی کی صفت ہے میری اس حیرت کو زائل کر دیا،

اور حسن میں جو کان ملاحت اور رعنائی ہے، ضرور وہ کشش ہے جس نے توبہ ابن حمیر کو دیوانہ بنا رکھا ہے"!

لیلیٰ نے جب توبہ کا نام سنا تو اُس کے چہرہ پر ایک قسم کی سرخی دوڑ گئی اور انفعال سے اُس کی نظر نیچی ہو گئی پھر اُس نے نظر اُٹھا کر طویس سے کہا، کیا تم نے توبہ کے کچھ ایسے اشعار سنے ہیں؟

طویس :- ہاں میں نے اُس کا اکثر کلام، اس رنگ کا سنا ہے، جس میں سے آپ کو اس وقت چند شعر سناتا بھی ہوں، وَھُوَ ھٰذا

ولوان لیلی الاخیلیۃ سلمت علیّ ودونی جندل وصفائح
لسلمت تسلیم البشاشۃ اوزقی الیھا صدیٰ من جانب القبر صائح
واغبط من لیلیٰ بما لا انالہ الا کل ما قرت بہ العین صالح

اشعار سنتے سنتے لیلی کا چہرہ زرد ہوگیا۔ عزہ نے اسے محسوس کیا، اور بات کو ٹالنے کیلئے کہنے لگی "مناسب ہوگا کہ اب اٹھکر آپ غسل فرمائیں اس کے بعد ماحضر تناول کریں"۔ لیلی نے جواب دیا "ان امور کا آپ اہتمام نکریں، میں اسوقت محض آپ سے ملاقات کرنے آئی ہوں" اور کچھ خاص باتیں اور گانے وغیرہ کی صحبت کے بعد واپس جاؤں گی"۔

عزہ:۔ کیا آپ اسوقت شام سے آتی ہیں؟

لیلیٰ:۔ ہاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے مدینہ میں ہم داخل ہوئے، میرے ساتھ ایک رفیق سفر اور بھی ہے، جسے ایک دوسری جگہ ٹھہرا کر میں یہاں آئی ہوں، اور اسی وجہ سے جلد واپس جاؤنگی،

اسوقت عزہ کے دل میں خیال آیا، کہ کہیں وہ لوگ جو سمیہ کو اسوقت کنارۂ آب نظر آئے تھے یہی تو نہ تھے اور اس نے لیلی سے پوچھا "میں سمجھتی ہوں کہ بعد الغروب ہم نے درختوں کے پاس شام کے راستہ سے آتے ہوئے آپ ہی لوگوں کو دیکھا تھا"

لیلی نے کہا "ہم تین آدمی تھے۔ اور بیشک بعد الغروب ہم صواحی مدینہ میں اپنے اونٹوں پر سوار پہونچ گئے تھے"۔

"خالغالی"

لہ لیلی اخیلیہ اگر مجھے تحفۂ سلام بھیجے اگرچہ میرے اس کے درمیان ٹیلہ اور چٹانیں پاٹ حائل ہیں،

سلہ تو میں بھی اگر زندہ رہا تو اس کو دلی جوش کے ساتھ سلام بھیجوں گا، (اگر مر گیا تو) قبر سے میری صدا ایک چیخ کی صورت میں اس کے کانوں تک جائے گی۔

سلہ غبطہ کرتا ہوں میں لیلی کی ان باتوں پر جن کا تکلف مجھے نصیب نہیں، اور جن اداؤں کا نقشہ آنکھوں میں کھنچا ہے، ان کی دلفریبی کا کیا پوچھنا،

سرمستی آلام

میرا پہلو آہ وقف بستر غم ہو چلا قلب میرا آشنائے درد پیہم ہو چلا
زیر سر بالش مرا اشکوں سے پُر نم ہو چلا آنکھ اور لخت جگر سے ربط باہم ہو چلا
چھن گیا آرام سب الٹ گئی راحت مری
پھر ہوا مجھکو جنون پھر آگئی شامت مری

ہو گئے شبہائے فرقت کے فسانے اک خیال محو دل سے ہو چلا ہے لطف ایام وصال
اب تو یہ فرط تپش سے ہو گیا ہے اپنا حال بیٹھ جاؤں چین سے میں اک جگہ بالکل محال
کھائے جاتا ہے مجھے فرقت کا نالہ دل کا درد
حدت غم سے ہوئی جاتی ہیں نبضیں میری سرد

ہجر میں جس کے تڑپتا ہوں وہ مجھ سے دور ہے میں یہاں بے چین وہ عشرت میں اپنی چور ہے
کرب ہے یاں قلب اُس کا عیش سے معمور ہے کیا خبر اسکو کہ کیا حال دل رنجور ہے
ہو کے افتادہ ہیں ہم آغوش گرد راہ کے
کیا اٹھیں گے اب سہارے سے عصائے آہ کے

جب میں تھا نکہت ربائے زلف مشکین حبیب اوج پر طالع تھا جب میرا ترقی پر نصیب
پارۂ دل جگر کو پاس تھا اپنے طبیب میں قریب یار رہتا اور یار رہتا مجھ سے قریب
میں تو اس دم بھی حریص درد حسن و عشق تھا
تھا مسیحا پاس رہتا تھا مگر بیمار سا

شب گہ بے محابا میں لذت یاب تھا جب شعاع حسن سیمیں سے زبس سیراب تھا
دست نازک جب مرے سینہ پہ وجہ خواب تھا ہائے یہ کمبخت دل اسوقت بھی بیتاب تھا

حسن تھا میرے قریں لیکن مٹا جاتا تھا میں
آتشِ ہجراں نہ تھی لیکن پھنکا جاتا تھا میں

اب کہ میں ہجراں کش تسکینِ وصلِ یار ہوں　　اب کہ تیغِ تیزِ فرقت سے میں دل افگار ہوں
آتشِ دوریِ جاناں سے میں شعلہ بار ہوں　　ہے تپش اب بھی ہی ویسا ہی اب بھی زار ہوں

فرق اتنا ہے کہ جب تھا در د وصلِ حسنِ یار
تنگیِ فرقت میں اب ہے روحِ لرزاں کو فشار

کرب و بیچینی یہ مانا ہم نے، ہیں پیغامِ ہجر　　یہ مسلّم ہے، مٹا دیں گے ہمیں آلامِ ہجر
درد و غم کو ہم سمجھتے ہیں، کہ ہیں آرامِ ہجر　　یہ مگر ہوگا نہ ہم سے تجھکو سیں شامِ ہجر

رازِ دل میرا نہاں ہے تیرے خلوت خانے میں
جوش کھاتی ہے میری صہبا ترے پیمانے میں

ہمدمو آخر نتیجہ کیا مرے سمجھانے کا　　کیوں گلہ تمکو کسی سے ہو مرے تڑپانے کا
پہلے یہ سمجھو مجھے کیوں شوق ہے مٹ جانیکا　　کیا اگر تم جان لوگے مرتبہ دیوانے کا؟

میری کروٹ اضطرارِ شوق کی تصویر ہے
میری بیتابی کتابِ حسن کی تحریر ہے

دم ذرا لے لوں محبت میں مجھے فرصت کہاں　　سانس لینے کی جنابِ ہجر کو جسرات کہاں
دردِ پُر لذت کشِ تسکین کب، راحت کہاں　　واقفِ صبر و سکوں ہوں یہ میری قسمت کہاں

میں ربابِ زندگی کا نغمۂ پُر درد ہوں
کاروانِ حسن کے رفتار کی میں گرد ہوں

میرے غم کو دیکھکر عشرت نہ ہووے بدگماں　　گل فشاں ہے فی الحقیقت میری چشمِ خونچکاں
ہے تپش میری پر پروازِ حسنِ دلستاں　　بیقراری میں مگر ہے جلوۂ ہستی نہاں
ہے شکستِ رنگ میری پردہ سازِ عشق کا　　میری رسوائی ہے اک افسانہ رازِ عشق کا

ہیں نمودِ نظمِ ہستی عشق کی ناکامیاں ۔۔ خوابِ راحت ہوگئی ہیں بستر کی بیداریاں ۔۔ بے قرارِ قلبِ محزوں عشق کی بیتابیاں ۔۔ حسن کی دشواریاں مجھکو ہوئیں آسانیاں ۔۔ دردِ دل میرا گدازِ شمعِ ہستی ہوگیا
شعلۂ الفت کو کیفِ رقصِ مستی ہوگیا

تمدن کی پہلی سالگرہ اور بزم احباب

شکریہ قبول کر، فانی دنیا! ان زندہ آنکھوں کا، جو تیری ناپائدار بے طاہر رنگ برنگ کے جلوے دیکھ رہی ہیں، حوصلہ بڑھا رہی ہے تیری دورنگی ان تماشائیوں کا بھی جو اپنی کوششوں میں ناکام اور آرزوں میں مایوس ہو چکے، اس بے بسی اور بے کسی کے میدان میں جہاں ہر طرف تفکرات کے کانٹے بچھے ہوتے ہیں تو اس دیوی کا جلوہ دکھا کر دل موہ لیتی ہے جس کے سر پر امید کا تاج شاہی ارمانوں کے موتیوں سے جگمگا رہا ہے یہی گنگا جمنی سماں دیکھتے دیکھتے عمریں ختم ہو گئیں، زمانہ کہیں کا کہیں پونچا، جو کل بچے تھے وہ آج سیانے اور جو نئے تھے وہ اسوقت پرانے ہو گئے،

کل کی بات ہے کہ تمدن دنیائے ادب میں نمودار ہوا۔ اور آج کا پرچہ اس کا پہلا سال ختم کر رہا ہے جن ہاتھوں نے چند روز پہلے اس کا پروسپکٹس تیار کیا وہ اسوقت اس کے ابتدائی سال پر ریویو کر رہے ہیں جس دماغ میں اجرائے تمدن کی خواہشیں مارچ سنہ ۱۹۱۱ء میں زور شور سے پیدا ہوئی تھیں وہی دماغ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنی خواہشوں کے انجام پر نظر ڈال رہا ہے جو دل آج سے ایک سال پہلے بہت سی حسرتوں سے لبریز اور ارمانوں سے بھرا ہوا تھا اب یہ دیکھتا ہے کہ کتنے ارمان پورے ہوئے اور کتنی حسرتیں خاک میں مل گئیں۔ تمدن جو ایک چھوٹر دو دو دعوے ساتھ لیکر نکلا تھا اور جس کی بہت سی اُمیدیں دوسروں سے وابستہ تھیں اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ اور اس کی امیدیں کس حد تک پوری ہوئیں

جس طرح چشم بینا عمر کی منزلیں طے کرتی ہوئی کبھی بار آور درخت اور کھلے ہوئے پھولوں سے آشنا اور کبھی ان مرجھائی ہوئی کلیوں سے دوچار ہوکر جو باد سموم کے جھونکوں سے فنا ہوچکیں اس نتیجہ پر پہونچتی ہے کہ اے عنصر خاکی خیالات پریشان کو دماغ سے نکال پیوند زمین کر، سر اٹھا، آنکھ کھول، اور اپنے سامنے دیکھ! ملکۂ کامیابی کی شاہانہ سواری چلی آرہی ہے۔ اسی طرح یہ تین مہینے سے رود تمدن کے بسر ہوئے اہل وطن کی خوشی ہمیشہ حوصلے پست اور ہمتیں توڑتی رہی مگر ان احباب کی قدردانی نے جو خلوص کا سر لگائے محبت کی آنکھوں سے تمدن کو دیکھ رہے تھے اُمیدوں کو ہمیشہ کامیابی کے لباس میں پیش نظر رکھا اور یہی صورتیں آج مایوس دماغ اور افسردہ دل سے یہ چند سطریں لکھوا رہی ہیں وضع کے پابند آن پر جان دینے والے وہ اگلے لوگ جن کے نام آج فانی دنیا آنکھوں سے لگا رہی ہے مدتیں ہوئیں کہ مرکھپ گئے گو آسمان و زمین دونوں یقین کرچکے کہ اب تاریخ ان پاک ناموں سے محروم ہوچکی مگر تمدن نے بتا دیا کہ ابھی ایسی صورتیں دنیا میں موجود ہیں جو کونے کھدروں میں پڑے لوگوں کو بھی وقعت سے دیکھ رہی ہیں۔

رفتار زمانہ متقاضی تھی اور ضرورت کے فرشتے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ تعلقات کا دائرہ وسعت کا محتاج ہے۔ دوسروں کے نقش قدم پیش نظر ہیں مگر وہ دل وحشی جو عمر بھر قید تنہائی کا عادی رہا جسکو دربار کے دنوں میں بھی گھر سے نکلنا قسم تھا جس کی آنکھیں ویرانہ میں آبادی کا لطف دیکھ رہی ہیں اپنا رنگ تبدیل نہ کرسکا۔

کج خلقی جس کی جلیس بے مروتی جس کی انیس تنہائی جس کی محرم، وحشت جس کی ہمدم۔ اسکو حق کیا ہے کہ کسی کی بے اعتنائی کا شکوہ کرے

مگر ہاں تمدن کا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اُس نے اُردو علم ادب کو اُن جواہرات سے مالا مال کیا جو ضرورتِ زمانہ، ناقدری یا عدیم الفرصتی کی وجہ سے علیحدہ پڑے ہوئے تھے مگر اُن کی آب و تاب کا سکہ ملک اور قوم دونوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، اور جن کی چمک دمک تمدن کے سوا دوسری جگہ نظر آنی مشکل ہے کفران نعمت ہے اگر اس موقعہ پر تمدن شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی - سید سجاد حیدر صاحب بی - اے - میرزا محمد سعید صاحب ایم - اے مولوی سید اشرف حسین صاحب بی - اے - ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - مشتاق احمد صاحب زاہدی - بی - اے - جیسے حضرات کا جو لٹریچر کے واسطے مایۂ ناز ہیں ذکر نہ کرے

جو عقدہ کامل ایک سال تک الجھا رہا آج سلجھتا ہے - تمدن کے دسترخوان سے بعض مہمان ناقدری کا الزام لگا کر کھڑے ہو گئے اس کا فیصلہ ناظرین تمدن کریں گے کہ جن پردیسیوں کا تمدن کے سوا کوئی ٹھکانا نہ تھا اُن کے قدم سر آنکھوں پر لینے میں تمدن کس جرم کا مرتکب ہوا -

آنکھ کے سامنے ہیں، وہ مقدس صورتیں جنھوں نے محض اس وجہ سے تمدن کی مخالفت کی کہ حقوق نسواں کی بحث تضیع اوقات ہے مگر ا

عزیزو! دوستو! انصاف کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی نہ باندھو! زندگی بے ثبات اور حیات ناپائدار ہے، عمر عزیز کی کل کائنات ایک رات کی صحبت ہے - اس جلسے کے شریک دور دور سے تمھارا نام سنکر آئے ہیں وہ کام نہ کرو کہ صبح صادق کے وقت جب یہ پیاری صورتیں دھندلی سی تصویر رہ جائینگی، ماہتاب جس نے بارہ گھنٹے تمھارا ساتھ دیا پھیکا پڑ چکا ہوگا خوشرنگ پھول جو رات بھر مہکے مرجھا چکے ہونگے شمع کافوری دم توڑ رہی ہوگی، دنیا تمھارے

اعمال پر ٹھٹھے لگائے۔

دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا، بیٹیاں آگے بہنوں کے بھائی اور ماؤں کے بیٹے ہو، کیا قدرت نے انہیں اسی لیے بنایا تھا کہ یہ تمہاری خدمت کریں اور پیٹ میں ٹکڑا ڈال لیں۔

خیال بھی تھا توقع بھی تھی اور یقین بھی تھا کہ فرقۂ نسواں اور حامیان حقوق نسواں تمدن کی اس کوشش میں ہاتھ بٹائیں گے مگر الحمد اللہ خواتین میں سے بنت نذر الباقر صاحبہ۔ نواب نظیری بیگم صاحبہ۔ بیگم عطا اللہ صاحب۔ اے بیگم صاحبہ۔ دختر صاحبزادہ عبد المجید خاں صاحب بیگم منشی عزیز الدین صاحب۔ زرخ نش صاحبہ ان چار پانچ کے سوا کسی نے اس طرف خیال بھی نہ کیا البتہ لاہور کے ایک کرمفرما کی عنایت خصوصیت سے قابل ذکر ہے جنھوں نے اس شرط پر سو پرچے خریدنے کی درخواست کی کہ تمدن حقوق نسوان پر بحث نہ کرے۔

ظاہری ٹیپ ٹاپ جسمیں کثرت تصاویر بھی شامل ہے روپیہ کا کھیل تھا مگر ضمانت ہی تمدن کے واسطے ایسا کاری زخم تھا جس نے آجتک نہ پنپنے دیا اسپر قحط الرجال، یا حامیان حقوق نسوان کا کال رہی سہی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں لیکن اس یاس وناامیدی میں جہاں چند لعنت کے سوا کوئی مددگار نہ تھا یا دختی کشتی تمدن کو اوڑائے پھرتی تھی۔ چند ایسی صورتیں بھی کنارے پر نظر آئیں جو سلامتی کے واسطے دست بدعا تھیں ان کا خلوص اور سچی محبت دل و جان کو مسخر کر گئی افسوس اس کا ہے کہ انمیں سے بعض صورتیں دیکھنے سے پہلے آنکھیں ہمیشہ کو بند ہو جائینگی۔ مگر اسوقت کہ رات کے دو بج چکے ہیں تمدن یہ پیغام اُن پیاروں تک پونہچا دیگا جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں اور ترسیں گی۔

یادش بخیر لطیف الدین احمد نہیں فقط لطیف اورمیاں حامد حسن نہیں صرف حامد (عزیزوں معاف کرنا) ہمارا دی اور پور قاضی کی عزت جو کچھ بھی ہو خدا زیادہ کرے زندہ رہو اور خوش رہو مولوی نور احمد صاحب سید تصدیق احمد صاحب منشی عبدالرزاق صاحب بسمل شکریہ کے محتاج نہ ہوں مگر انکی عنایتیں فراموش نہیں ہوسکتیں،

سرزمین دکن جو قدر دانی وجوہر شناسی میں سدا مشہور رہی یلبرگہ سے خان عالی وسید سخاوت خاص حیدر آباد سے میر مہدی علی صاحب شہید نے جو کچھ کیا دل ابتک اس کے مزے لے رہا ہے۔

بھوپال کا خیال آتے ہی سید امر و منشی جمیل احمد کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی اور میاں ارشد کی یاد کہیں سے کہیں لے گئی، اچھا بھائی ایار زندہ صحبت باقی! کبھی تو ملو ہی گے،

کیسی اچھی محفل جمی ہوئی ہے! عالم خیال اسوقت وہ صورتیں دیکھ رہا ہے جنکی بدولت تمدن نے دلی کی لاج رکھ لی، آؤ، آؤ میرے محسنو، آؤ، تمھارے قدم سرآنکھوں پر، اجڑے ہوئے شاہجہاں آباد کی مقدس خاک کا ہر ذرہ تمھارے استقبال کو تیار ہے، تمھاری محبت بھرے دل اور بزرگوں کی وضعداری کا پتہ دینے والی آنکھیں اسی بستی میں رنگ برنگ کے تماشے دیکھیں گی رات آدھی سے زیادہ گذر چکی، چاند مدھم پڑا اور تارے چھٹکنے شروع ہوگئے یہ تمام بہار صبح صادق تک ہے پھر تم کہاں اور یہ تمدن کی محفل کہاں اذان کے ساتھ یہ سماں درہم برہم ہے مدتوں کے بچھڑے ایک جا جمع ہوئے ہیں بس غنیمت ہے یہ صحبت جس کا لطف مدتوں آنکھوں میں سمایا رہے گا۔ آنکھیں ترسیں گی اور روئیں گی۔ دل تڑپے گا اور ڈھونڈھیگا

مگر بعض صورتیں دوبارہ نظر نہ آئیں گی پردیسی مسافرو! دیکھنا دیکھنا! کیسے کیسے لوگ تم سے ملنے آئے ہیں انکی ظاہری صورتوں پر نہ جاؤ، ان کی حیثیت اور حالت پر نظر نہ ڈالو ان کے پہلو میں دل ہیں ان کے دلوں میں درد ہے یہ وہ ہیں جنھوں نے دنوں کے رستے اور مہینوں کی منزلیں گھڑیوں میں طے کیں محبت کے پروں سے اڑے اور قدر دانی کی فضا میں جھومتے جھامتے شاہجہاں آباد پہونچے۔ عزیزم سید ابوالقاسم خاں شوکت کی طرح سوجانے کی بھی نہیں ہے راتیں بہت سی آئیں گی مگر یہ سماں نظر نہ آئیگا جوش کی طرح بزم تمدن کی شرم رکھو۔ منشی لیاقت علی خانصاحب اودھ سے آئے ہیں ایسا نہ ہو دلّی پر نام رکھیں۔ مولوی سیف الدین شباب کو ساتھ لو اور محفل کا چکر لگالو۔

ٹھیرجا! ٹھیرجا! اے شب وصل! خدارا دراز ہو اور پیاروں کی صورت دل بھر کر دیکھ لینے دے، بھائی رضا حیدر! دلّی اب وہ دلّی نہیں رہی اگر آباد ہو چکو شکایت نہ کرنا، پھر بھی اس وقت کو غنیمت سمجھو آنے والے لوگ ان باتوں کو بھی ترسیں گے، پیارے لطیف! تیس برس کے بعد صورت دکھائی ہے اری کی باتیں کہانیاں کردیں سلطان پور کی منصفی نے وہ بے فکری خاک میں ملادی، کبھی ملاقات ہو تو اوسط کو سلام پہونچادینا۔ آہ! آہ! اے ساعت فراق کس دل سے سر پر آپہونچی، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سماں درہم برہم کردیا، اٹھو! اٹھو! بدیسی مسافر و تمدن سے رخصت ہو پھلواری سے تشریف لانے والے بزرگو آغا غلام حسین صاحب شادؔ اور منشی مظفر خاں صاحب مدارات میں کوئی کمی ہوئی ہو تو مولوی محمد عبد العزیز صاحب رضا کورٹ انسپکٹر کی طرح معاف کردینا،

صبح صادق کا پیغام لانے والی چیسٹر لیول للہ رحم کرو سید ظفر احسن صاحب سبزواری شیخ علی اختر حزیں، ڈاکٹر سلیمان خاں، عزیزم محمد محسن سید حشمت علی صاحبزادہ وحید احمد صاحب فاروقی - مولوی محمود حسن سید حسن عسکری منشی عبد العزیز شیخ غوث محمد جیسے دوستوں سے دو باتیں کر لینے دو،

معزز ناظرین تمدن اسمع خراشی معاف مؤذن اذان دے رہا ہے نسیم پیغام صبح لے آئی - جلسہ ختم اور آنے والے مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہوئے رات گئی اور رات کے ساتھ وہ بات البتہ اس صحبت کی یادگار پہلو میں وہ دل ہے جو محبت کی آنکھوں سے ایک ایک کی صورت کو تکتا رہا، اور شب کے مزے لے رہا ہے - مرجھائے ہوئے پھول جلی ہوئی شمع وہ سماں رہی ہے جو آنکھ سے اوجھل ہو گیا،

پیارو چشم ظاہر سے دور ہو جاؤ مگر دل تمھاری یاد سے خالی نہیں سچے دوستو کامل ایک سال کے بعد (بشرط محبت) ملاقات ہوگی خدا تمھارا نگہبان ہے میرا شکریہ قبول کرو زندہ رہا تو شریک بزم ہو کر میری عزت بڑھانا مر گیا تو فاتحہ کے پھولوں سے یاد کرنا،

تمدن اب دوسرے سال میں قدم رکھتا ہے قدردانی کے ہاتھ اس کے سر پر رکھو شفقت بزرگانہ سے اسکی غلطیاں معاف کرنا اور اسکو اپنا خدمتگزار یقین کرنا

قصد ہے کہ اپریل کا پرچہ غیر معمولی حجم متعدد تصاویر و منتخب اہل قلم کے مضامین کے ساتھ تمھارے متبرک ہاتھوں میں پہنچے - دعا ہے کہ ناظرین تمدن کو دوسرا سال مبارک ہو اور آرزو ہے کہ خاک شاہجہاں آباد کا یہ خشک پودہ اپنے سرپرستوں کے فیض سے سرسبز و شاداب ہو کر لہلہاتا رہے -

ناشکری ہوگی اگر تمدن اس موقع پر ان مہربانوں کا شکریہ بھری محفل میں نہ ادا کرے جنہوں نے حقوق نسواں جیسی سنگلاخ زمین کو خون جگر سے سینچکر گلزار تمدن کو لالہ زار کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مشہور ادیب منشی نوبت رائے صاحب نظر کا اسم گرامی ہے منشی صاحب کی قابلیت ہماری تعریف کی محتاج نہیں، انکی توجہ کا ایک کرشمہ انڈین پریس کا رسالہ ادیب ہے، باوجود افکار و حوادث کے جنمیں اکلوتے بچے کی موت بھی شامل ہے حضرت نظر نے تمدن کو فراموش نہ کیا۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی مولوی رضا علی صاحب وحشت، مولوی نیاز محمد خانصاحب نیاز فتحپوری۔ میرزا مہدی خانصاحب کوکب حضرت محوی۔ مولوی میرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی، مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی خصوصیت کے ساتھ شکریہ کے مستحق ہیں، اہل قلم کی وہ جماعت جس کے مضامین سے قوم اور ملک کا کوئی چپہ محروم نہیں اور جس کے مضامین تمدن نے شکریہ سے واپس کیے مندرجہ تمدن سے ناخوش ہوگی مگر تمدن ان سے معافی کا خواستگار ہے۔

اپریل کے پرچے کے متعلق جو قصد اوپر ظاہر ہوا اسکی تکمیل محض قدردانان تمدن کی توجہ پر منحصر ہے گو اس قسم کی خواہش ایک قسم کی سبکی ہے مگر موجودہ حالت پر نظر ڈالتے ہوئے ہم صرف ان چند احباب کو جن کی ذات سے ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری درخواست کو ضائع نہ کریں گے اور جن کی بابت یہ یقین ہے کہ انکی ادنیٰ توجہ اس قصد کو پورا کر دے گی ہم دو دو کارڈ روانہ کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے کرمفرما دو دو خریدار عطا فرماکر اس سال تمدن کی ضخامت اور تصویر میں اضافہ کریں گے۔

ایڈیٹر

غزلیں

یاں سے بھی محروم و مشتاق لقا جاتا ہوں میں — جو خوشی تیری رضا بالقضا جاتا ہوں میں
تا نہ میری پیروی سے خاک ہو جائے کوئی — کوئے جاناں سے مٹا کر نقش پا جاتا ہوں میں
یار کیا آتا ہے گھر میرے کہ آتی ہے بہار — صورتِ گل فرطِ شادی سے کھلا جاتا ہوں میں
روز یہ عمر گراں مایہ ہوئی جاتی ہے کم — دن دہاڑے عین بستی میں لٹا جاتا ہوں میں
شعبۂ راہ محبت میں ہزاروں اندر ہزار — ساتھ ہوں سب کے مگر سب سے جدا جاتا ہوں میں
مضمحل ہے جسم خاکی کے تعلق سے یہ روح — پیرہن بھاری جو پہنا ہے دبا جاتا ہوں میں
بحر مواج قضا میں کیا ٹھکانا کاہ کا — بھینک دیتی ہیں جدھر موجیں بہا جاتا ہوں میں
ساز و سامان کی ضرورت کیا عدم کو کوچ میں — مطمئن ہے دل کہ پیش آشنا جاتا ہوں میں

ہست و بود اپنی ہے اے آباد مثل نقش پا
خود نفس کی آمد و شد سے مٹا جاتا ہوں میں

— غضنفر آبادی

مجھے صاف کام اپنا کر جائے گی — یہ برچھی مگر تا جگر جائے گی
وہ زلف رسا گر بکھر جائے گی — تو پھر یہ بلا کس کے گھر جائے گی
وہ آئیں گے جب تک مجھے دیکھنے — یہاں موت کام اپنا کر جائے گی
نہ آئے تو کل کی طرح یہ بھی شب — تڑپتے تڑپتے گذر جائے گی
نہ پوچھے گا بلبل ترا حال گل — تڑپتے تڑپتے ہی مر جائے گی
ترے غیر دشمن میں طالب ہوں موت — ادھر آئے گی یا اُدھر جائے گی

یہ دھڑکا عبث ہے تمھیں اے شہید
گذرنی جو ہو گی گذر جائے گی

— حضرت شہید

نخلِ اُمید ہے گریہ کا شجر پانی میں — یاس ہے نالۂ بیدل کا ثمر پانی میں
پرتوِ عارضِ جاناں سے ہیں روشن دونوں — نظر آتے ہیں جو یہ شمس و قمر پانی میں
حیف گریہ سے ہوا سوختہ نخلِ اُمید — کیا تماشا ہے ہوا خشک شجر پانی میں
عکس خالِ رُخِ جاناں ہے سیاہی مہتاب — زلفِ پیچاں کا نمونہ ہے بھنور پانی میں
دلِ بیتاب کی گریہ سے نہ حالت پوچھو — آہ بہ جاتا ہے یہ لختِ جگر پانی میں

کس کی تقدیر کے چکر کا نمونہ ہے ذکی
کیوں پڑا کرتا ہے دن رات بھنور پانی میں

تجمل حسین ذکی

کلام ربّانی کے اکثر ترجمے ملک میں شائع ہوئے مگر جو قبولیت مولنٰا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی مولانا نے مرحوم کی علمی قابلیت سنے دنیائے اسلام پر ایسا احسان کیا ہے کہ اسکا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا اور نفس الامر یہ ہے کہ مولانا ہی کی ذات بابرکات اِس اہم کام کی اہل بھی تھی -

یہ کلام اللہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ جو مطلب ترجمہ سے حل نہیں ہوتا اس کی تصریح حاشیہ پر نہایت عمدگی سے خود قابل مترجم نے کردی ہے حروف اس قدر جلی ہیں کہ بچے اور بڑھے بآسانی مطالعہ کرسکتے ہیں اور ترجمہ بھی اس قدر کشادہ کہ پڑھنے میں مطلق دقت نہیں ہوتی باوجود ان تمام خوبیوں کے مجلد کپڑے کی جلد رسمی کاغذ کی قیمت ۱۲؎ حنائی عہ -

میرزا صاحب ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ اس کلام ربانی کی قیمت میں سے ایک چوتھائی رقم طرابلس فنڈ میں دیں گے اور چونکہ اس کلام ربانی کی خریداری ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے ہمیں اُمید ہے کہ ناظرین تمدن ضرور اسطرف توجہ کریں گے -

درخواستیں بنام ابوظفر منشی حامد میرزا صاحب کوچہ روح اللہ خاں دہلی آنی چاہئیں

جو تقریب تاج پوشی قیصر ہند۔ ہر دو حصہ بھیجنے دیہر۔ کے ایک روپیہ کو ملیں گے

وصل حبیب

ناول نہیں عجیب اداؤں کی ہے تصویر
رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

مشہور تو ہی جہاں میں میرا فسانہ کیا
کہتی ہے مجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی۔ از بھوپال۔ امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیرجی شبیر علی صاحب۔ از بجنور۔ الحمد للہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول چھپا اور زیور طبع سے آراستہ ہو کر فوراً خراستے چشم شائقین ہوا۔ داد کی ضرورت نہیں سکا آپ میں قابلیت ہے۔ لہذا وہ حصہ دوم ابھی تک یہاں مستور ہے اوس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر فدا حسین صاحب سوداگر از ملتان۔ آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

[illegible] قاضی عبدالشکور صاحب از ڈبائی ضلع بلند شہر وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ در حقیقت آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

[illegible] فصیح الدین صاحب از محلہ مراد آباد وصل حبیب دیکھا ماشاء اللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کرکے خوب کام کیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

[illegible] بخش صاحب سندہ۔ از دہلی۔ آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا جلد کہ ناول بہت عمدہ ہے۔

[illegible] بابو بنس گوپال صاحب کندن از حیدرآباد دکن۔ آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر حصہ کو واقعی نہایت عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شعیب صاحب مترجم ستر کو کو بیانو آنہ کتاب وصل حبیب کو ہر کہ امید سے زیادہ لطف اوٹھایا عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے جیسے چھوٹے چھوٹے مگر چست فقرے جملے مصنف کو پوری قابلیت کی شہادت دے رہی ہیں۔ عبارت کا زور اشعار کی ترتیب۔ جملوں کی ترکیب الفاظ کی بندش صاف بتلا رہی ہیں کہ مصنف کو مشرقی علوم پر کمال عبور ہے۔ مذکور مولا مصنف نے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جو ناول کو ایکبار دیکھکر انسان آسودہ ہو جاتا ہو لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایکبار میں کیا دس بار میں بھی سیری نہیں ہو سکتی۔ یہ تو مولانا کی تمنائی بن جاتا ہے۔ منتھے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد میں تشریح فرماتے ہیں کہ ہم مخرب اخلاق ناولوں کے کرتے جو مخالفت میں وصل حبیب کو ہم نے نکتہ چیں نگاہوں سے بغور دیکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ موجودہ ناولوں کی طرح یہ بھی ہوگا۔ مگر کس قدر خوشی ہوئی کہ مصنف نے کل ہمارے خیال کا چربہ اپنی تصنیف میں اتار دیا ہے۔ زبان کی سلاست صحیح ہے مطالعہ میں ایک قابل استفادہ دلیا ہے۔ غرض ناول بمنزلہ موجودہ تھا اور قابل قدر ہے۔ ایسے ہی کتابوں کی شاعت کی ضرورت ہے۔

(۱۰) صاحبزادی محمد بشیر صاحب سالن ریاست کشمیر زمیری تحریر وصل حبیب نے ہم کو مشتاق و بیقرار کا مشتاق بنا دیا ہے دوسری جلد بھیجئے

مہتمم کتب خانہ حبیبیہ ڈاک خانہ گوہر گنج ریاست بھوپال